اپریل 2023
ماہنامہ
کرن
www.pklibrary.com
www.pklibrary.com

انٹرویو

ناول

مکمل ناول

ناولٹ

افسانے

زرِ سالانہ بذریعہ رجسٹری

پاکستان (سالانہ) ——— 1,800 روپے
ایشیا، افریقہ، یورپ ——— 21000 روپے
امریکہ، کینیڈا، آسٹریلیا ـ 24000 روپے
سالانہ خریداری کے لیے ای میل کریں
subscriptions@khawateendigest.com

واٹس ایپ
03172266944

مستقل سلسلے

خط و کتابت کا پتہ
کرن
37- اردو بازار کراچی

اپریل 2023
جلد 45 شمارہ 01
قیمت 150 روپے

مدیرہ

رحمتیں اور برکتیں اپنے دامن میں لیے رمضان المبارک کا مہینہ سایہ فگن ہے۔
اس مہینہ میں اللہ تعالیٰ اپنے بندوں پر خاص رحمت و بخشش فرماتا ہے۔ اس ماہ میں ہر نیکی پر دس سے سات سو گنا تک اجر بڑھا دیا جاتا ہے سوائے روزے کے، رب کریم فرماتا ہے، اس کا ثواب میں خود دوں گا۔
اللہ تعالیٰ نے امت مسلمہ کو رمضان کے روزے رکھنے کا حکم دیا ہے۔ یہ حکم صرف مسلمانوں کے لیے خاص نہیں بلکہ پہلی امتوں کو بھی یہ حکم دیا گیا تھا۔ تمام مذاہب کے لوگ روزے رکھتے ہیں۔
اسی ماہ مبارک میں انسانیت کی رہنمائی کے لیے آسمانی کتابیں نازل ہوئیں۔ صحف ابراہیم علیہ السلام رمضان المبارک کی ساتویں رات کو اور انجیل رمضان کی تیرہویں رات میں نازل ہوئیں۔ قرآن پاک جس کی حفاظت کا ذمہ اللہ تعالیٰ نے لیا ہے اس ماہ مبارک میں نازل ہوا۔
یہ شمارہ آپ کو ملے گا تو رمضان المبارک کے دوسرے عشرے کا آغاز ہو چکا ہوگا۔ یوں تو رمضان المبارک کا ایک ایک پل قیمتی ہے لیکن آخری عشرے کی فضیلت بہت زیادہ ہے۔ اس کی طاق راتوں میں شب قدر ہے۔ لیکن عموماً اس عشرے کو عید کی تیاریوں اور خرید و فروخت میں صرف کر دیا جاتا ہے۔ بازاروں میں خرید و فروخت کی وجہ سے بے خوابی اور تھکان کے باعث دن بھر نیند اور سستی چھائی رہتی ہے۔ عبادت میں دل نہیں لگتا۔ عید کی تیاریاں ضرور کیجیے لیکن اس میں مصروف ہو کر ان بابرکت اور قیمتی لمحات کو ضائع نہ کریں۔
اللہ تعالیٰ ہم سب کو رمضان المبارک کی برکتوں سے فیض یاب ہونے کی توفیق عطا فرمائے۔ (آمین)

اس شمارے میں

- ☆ عدیل رزاق سے ملاقات
- ☆ ادا کار "نوید رضا" کہتے ہیں۔ "میری بھی سنیے۔"
- ☆ اس ماہ "لائبہ ملک" کے "مقابل ہے آئینہ"
- ☆ "تاش گھر" ایمل رضا کا سلسلہ وار ناول
- ☆ مہوش افتخار کا سلسلہ وار ناول "دامن سحاب"
- ☆ "وفا کا دیپ" سنیعہ عمیر کا مکمل ناول
- ☆ ام طیفور کا مکمل ناول "گنوا کر دل وجاں ہم"
- ☆ "مقیاس" میمونہ صدف کا ناولٹ
- ☆ منشا محسن علی کے ناولٹ "لا" کی آخری قسط

قرۃ العین خرم ہاشمی، ام اقصیٰ، حمیرا نوشین، آسیہ رئیس خان، کشف بلوچ، حمیرا شفیع، فرح انیس کے افسانے اور مستقل سلسلے
کرن کتاب: رمضان المبارک کے خصوصی مضمون اور مزید ار ریسپیز کے ساتھ

حمد باری تعالیٰ

ہر شے میں الٰہی ظہور تیرا ہے
گلوں میں رنگ ستاروں میں نور تیرا ہے

تیرے سوا نہیں زیبا کسی کو اے مالک
مرے کریم بجا سب غرور تیرا ہے

مری یہ تشنہ لبی دیکھتی ہے تیری طرف
میں تشنہ کام ہوں جام طہور تیرا ہے

میں جانتا ہوں کہ تو ذوالجلال ہے لیکن
برائے عبد کرم کا وفور تیرا ہے

شریک تیرا کسی کو سمجھ نہیں سکتا
اگر کسی کو ذرا بھی شعور تیرا ہے

بچانا حشر میں رسوائی سے مرے مولا
کہ تو حسیب ہے یوم نشور تیرا ہے

اشفاق احمد غوری

کوئی مثل مصطفیٰ کا کبھی تھا، نہ ہے نہ ہوگا
کسی اور کا یہ رتبہ کبھی تھا، نہ ہے، نہ ہوگا

انہیں خلق کر کے نازاں ہوا خود ہی دست قدرت
کوئی شاہکار ایسا کبھی تھا، نہ ہے نہ ہوگا

کسی وہم نے صدا دی کوئی آپ کا مماثل
تو یقین پکار اٹھا کبھی تھا، نہ ہے نہ ہوگا

مرے طاق جاں میں نسبت کے چراغ جل رہے ہیں
مجھے خوف تیرگی کا کبھی تھا، نہ ہے، نہ ہوگا

میرے دامن طلب کو انہی کے در سے نسبت
کسی اور در سے یہ رشتہ کبھی تھا، نہ ہے نہ ہوگا

میں ہوں وقف نعت گوئی، کسی اور کا قصیدہ
میری شاعری کا حصہ کبھی تھا، نہ ہے، نہ ہوگا

صبیح رحمانی

عدیل رزاق سے ملاقات

شاہین رشید

گزشتہ دنوں "سرراہ" کے عنوان سے ایک ڈرامہ سیریز شروع کیا گیا جس میں ایک لڑکی کو ٹیکسی ڈرائیور دکھایا گیا اور اس کی ٹیکسی میں بیٹھنے والے مسافر کی کہانی کو ڈرامائی شکل میں پیش کیا جاتا تھا۔ یہ سیریز پہلی قسط سے ہی مقبولیت حاصل کر رہا تھا۔ مگر اسے چھ اقساط کے بعد ختم کر دیا گیا۔ بند نہیں کیا ختم کیا گیا۔ اس سیریز کے رائٹر عدیل رزاق ہیں۔ ان سے اس سلسلے میں کی گئی بات چیت آپ کی نذر ہے۔

"کیسے مزاج ہیں عدیل صاحب؟"

"اللہ کا شکر ہے۔"

"آپ کی ڈرامہ سیریز "سرراہ" پہلی قسط سے ہی بہت اچھا لگا کہ جس میں رکھا گیا کہ ایک لڑکی گھر کے مالی حالات سے گھبرا کر اور گھر کو مالی خوشحالی دینے کے لیے ٹیکسی چلاتی ہے۔ اور پھر اس کے ساتھ جو واقعات پیش آتے ہیں وہ ڈرامے کی شکل میں دکھائے جاتے ہیں۔ یہ ایک بہترین آئیڈیا تھا۔ کس کا تھا؟ آپ کا یا کسی اور کا؟"

"یہ آئیڈیا پروڈکشن ہاؤس کا تھا۔ خاتون ٹیکسی ڈرائیور کا کیا کردار ہوگا اور کہانیوں کو اس سے کیسے جوڑا جائے گا کے لیے جب مجھے "آن بورڈ" لیا گیا تو مجھے معلوم ہوا کہ بنیادی خاکہ تو پروڈکشن کے دماغ میں ہے کہ ایک ایسی لڑکی ہو جو "کیب" چلاتی ہو اب وہ کن حالات کے تحت کیب چلائے گی۔ انہیں نہیں معلوم تھا اور کس طرح کے لوگوں سے اس کا واسطہ پڑے گا یہ بھی نہیں معلوم تھا بس ٹیکسی ڈرائیور کو لے کر کہانی کو ڈیزائن کرنا ہے۔ اب کیا کہانیاں ہوں گی لڑکی کی اپنی کیا کہانی ہوگی۔ ڈرائیونگ کے دوران اس سے کس طرح کے لوگ ٹکرائیں گے۔ یہ سب کام مجھے کرنے تھے۔ تو کچھ موٹے موٹے کردار (مطلب وہ کردار جن سے سب ہی واقف ہوتے ہیں) ہمارے پاس تھے کہ ایک ڈاکٹر ہونا چاہیے۔ ایک وکیل ہونا چاہیے۔ ایک خواجہ سرا ہونا چاہیے۔ ان کہانیوں پر ہم کام کرنا چاہتے تھے۔ چنانچہ پھر میں نے کہانیاں بنائیں جو کہ سات آٹھ تھیں ان کہانیوں کو پھر "شارٹ لسٹ" کیا اور پہلے چار کہانیوں پر اتفاق ہوا۔ پھر سوچا کہ چھ کہانیاں تو ہونی ہی چاہییں۔ جبکہ پہلے کہا گیا کہ چار کہانیاں ہونی چاہییں۔ اور ایک کہانی دو تین اقساط پر ہوں۔ لیکن پھر مشترکہ طور پر پروڈکشن ہاؤس نے اور ہم سب نے مل کر یہ فیصلہ کیا کہ ایک نئی تکنیک کے ساتھ چلتے ہیں کہ ایک قسط کی ایک کہانی ہوگی اور اس کلائمکس پر ختم کریں اور پھر آخری قسط میں تمام کہانیاں جو تھوڑی تشنہ چھوڑی گئی تھیں انہیں مکمل کر دیا جائے۔ یوں چھ اقساط کا ہم نے ایک خاکہ بنایا اور ہم نے دیکھا کہ جب یہ سیریز آن ایئر ہوئی تو سب کو بہت پسند آئی۔ سب کو مزا آیا۔ ورنہ مجھے بھی سب سے بڑا خدشہ یہی تھا کہ چونکہ ہمارے ناظرین کو اس بات کی عادت ہے کہ وہ ایک کہانی سے جڑ جاتے ہیں اور

اٹھائیس تینتیس صفحے اسی ایک کہانی کے ساتھ مارتے رہتے ہیں اسی کو دیکھتے رہتے ہیں اور جب پہلی کہانی کے بعد دوسری قسط میں پہلے والے کردار نہیں ملیں گے اور ہر ہفتے ایک نئی کہانی ہوگی تو ان کے لیے ایک سرپرائز ہوگا کہ پہلے والے کردار کہاں گئے۔ تو انٹرنیشنلی تو اس طرح کا بہت کام ہو رہا ہے اور بڑے منفرد انداز کی چیزیں دیکھنے والوں کو دکھائی جا رہی ہیں اور پسند بھی کی جا رہی ہیں تو اس طرح کا تجربہ ہم نے بھی کیا۔"

"اگر آپ کو یاد ہو تو گزرے زمانے میں "اندھیرا اجالا" اور اس طرح کے دیگر ڈرامہ سیریز بھی ہوا کرتے تھے جو کافی عرصہ چلتے بھی تھے۔ مگر آپ کا سیریز چھ اقساط کے بعد بند ہو گیا۔ کیوں؟"

"ایک بات یہ کہ اسے مختصر اس لیے رکھا کہ ہمارے پروڈیوسرز اسی طرح کی چیزوں پر زیادہ کام نہیں کر رہے ہوتے۔ وہ ایک لمبی کہانی بناتے ہیں اور اس ایک لمبی کہانی کی وہ اٹھائیس تیس اقساط بنا دیتے ہیں۔ میری پانچ کہانیوں کے موضوعات ایسے ہیں جو سب لوگوں کے دیکھے ہوئے ہیں۔ کوئی بھی موضوع نیا نہیں ہے۔ دیکھی بھالی باتیں ہیں۔ اسے محدود بنانے کا مقصد صرف یہ تھا کہ پروڈیوسر یہ چاہتا تھا کہ وہ ایک ہی سریز کے اندر بہت سارے موضوعات کو کور کر رہا ہو۔ اب بات یہ ہے کہ پروڈیوسر ہی پیسہ لگاتا ہے۔ پروڈیوسر نے کم پیسے لگائے یا پروڈیوسر نے یہ سمجھا کہ مجھے ابتداء میں صرف چھ اقساط ہی پیش کرنی ہیں زیادہ نہیں تو یہ پروڈیوسر کا فیصلہ تھا۔ تو پیسہ لگانے والے کے آگے تو ہم مجبور ہیں اور مجبوری کے علاوہ ہمیں خود بھی نہیں معلوم تھا کہ یہ اتنی آسانی سے لوگوں کی سمجھ میں آجائے گا اور وہ اسے سراہا رہے ہوں گے اور پسند کر رہے ہوں گے۔ اسی لیے اس کی صرف چھ اقساط رکھی گئیں۔ انٹرنیشنلی اس طرح کا بہت کام ہو رہا ہے۔ Netflix اور دیگر میڈیمز میں لوگوں کو بہت ساری چیزیں دیکھنے کو مل رہی ہیں۔ ٹی وی کے بہت سارے ناظرین ان

مختلف میڈیمز کی طرف شفٹ ہو گئے ہیں اور ان میڈیمز اور Netflix کی چیزیں دیکھ رہے ہیں۔ اور ہم اس سیریز کے تحت یہ کوشش کی ہے کہ جو ناظرین دوسرے میڈیمز کی طرف راغب ہو گئے ہیں ان کو یا تو اپنے ٹی وی ڈرامے کی طرف واپس لایا جائے یا پھر ڈرامہ ان دونوں Flavors فلیورز کا ہو اور وہ اس کے ساتھ جڑ سکیں۔ اور ہو سکتا ہے کہ اسے بعد میں، کہیں اور بیچ بھی دیا جائے...... خیر۔"

"سرراہ تو ہوا اختتام پذیر۔ مزید کیا آرہا ہے آپ کا لکھا ہوا؟"

"میرا ایک سیریل آنے والا ہے "جیو" سے "عابس" اس کے ڈائریکٹر ہیں اور احسن خان سمیع خان اور مدیحہ امام اس کی مین کاسٹ ہے۔ آج کل اس کی شوٹنگ ہو رہی ہے۔"

"لکھنے کے علاوہ کیا کر رہے ہیں؟"

"مجھے صرف لکھنا آتا ہے اور لکھنے کے علاوہ میں کچھ نہیں کر رہا اور لکھتا بھی میں بہت کم ہوں۔ کیونکہ میں تھوڑا سست ہوں۔ ورنہ کام مجھ سے کروانا چاہ رہے ہیں لوگ۔ مگر میں تیزی سے نہیں لکھ پاتا۔ بہت ٹائم لیتا ہوں۔ اور ٹائم میں اس لیے لے رہا ہوتا ہوں کہ میں انٹرنیشنل ڈرامہ دیکھنے میں یا پھر پڑھنے میں مصروف رہتا ہوں۔ بس اسی لیے زیادہ نہیں لکھ پاتا۔ ویسے کچھ آئیڈیاز ہیں جن پر بات چیت چل رہی ہے۔ کچھ لکھی جا رہی ہیں۔ مگر ان کے آنے میں ابھی بہت دیر ہے۔ اس تفصیل سے ان کا ذکر کرنا ابھی مناسب نہیں ہے۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ یہ اے

آروائی جیو یا ہم کے لیے ہوں گے۔ یہ سب کچھ ابھی ابتدائی مراحل میں ہیں۔"

"آپ نے کہا کہ میں زیادہ ٹائم ڈرامہ دیکھنے یا پڑھنے میں گزارتا ہوں۔ تو ٹی وی پہ کیا پسندیدہ چیزیں ہیں آپ کی؟"

"میں زیادہ تر انگریزی سیریز زیادہ دیکھتا ہوں۔ انڈین ویب سیریز بھی دیکھتا ہوں۔ پاکستانی چیزوں سے واقفیت ضرور رکھتا ہوں کیونکہ یہ میرے کام کا حصہ ہے، میرا پروفیشن ہے اور یہ پیشے کی ریکوائرمنٹ بھی ہے کہ میں ٹی وی کے کام سے واقف رہوں۔ میں پابندی سے نہیں دیکھتا لیکن پتا چل جاتا ہے کہ کیا کام ہو رہا ہے۔ کچھ لوگوں کے کام ایسے ہوتے ہیں کہ جن کو دیکھ کر مزا آ رہا ہوتا ہے جسے ظفر معراج صاحب، فصیح باری خان، مصطفیٰ آفریدی، آمنہ مفتی اور فائزہ افتخار...... تو ان کی چیزیں دیکھ کر اچھا لگتا ہے اور میری بھرپور کوشش ہوتی ہے کہ ضرور ضرور دیکھوں...... ویسے آپ کو بتایا ہی ہے کہ باہر کی چیزیں زیادہ دیکھ رہا ہوتا ہوں۔"

"ڈرامے ایک ہی ڈگر پر چل رہے ہیں۔ آپ کا سر راہ کا انداز ناظرین نے پسند کیا۔ پروڈیوسرز ڈائریکٹر سے کچھ کہنا چاہیں گے؟"

"بالکل کہنا چاہوں گا کہ اب جبکہ ویورز اپ ڈیٹ ہو رہے ہیں تو ہمارے چینلز کو، پروڈیوسرز کو بھی اس بارے میں سوچنا چاہیے اور تجربات کرنے کے لیے بھی دل بڑا کر لینا چاہیے۔ منی سیریز لے کر آئیں۔ منی سریل لے کر آئیں۔ منی سریلز تو ایک دو چینلز نے شروع بھی کر دیے ہیں۔ ایکسپریس چینل سے اور شاید "ہم" سے بھی...... اس طرح کے تجربات سے کم سے کم اٹھائیس، تیس اقساط کی سیریلز کم ہو جائیں گی۔ لوگوں کو ایک چینج ملے گا اور انہیں اچھا لگنے لگے گا۔ کبھی زمانے میں "کتنی گرہیں باقی ہیں" سیریز آیا کرتی تھی اب وہ بھی بند ہے تو کہنے کا مقصد یہ ہے کہ تجربات کرتے رہنا چاہیے۔ چینج لاتے رہنا چاہیے۔ اس طرح کے تجربات سے نئے نئے موضوعات بھی ملتے ہیں۔ نئے نئے کردار ملتے ہیں۔ نئی نئی کہانیاں ملتی ہیں اور یکسانیت کم ہوتی ہے۔ نیا ٹیلنٹ سامنے آئے گا اور ڈائریکٹر کو بھی کام کرنے کا مزا آئے گا۔"

"گزشتہ دنوں پی ایس ایل کے تحت کرکٹ دیکھنے کو ملی۔ آپ نے انجوائے کیا؟"

"پی ایس ایل سے کوئی خاص دلچسپی نہیں رہی، کیونکہ کرکٹ سے بھی مجھے دلچسپی نہیں ہے۔ مجھے جو وقت ملتا ہے اس میں یا تو میں کتابیں پڑھ رہا ہوتا ہوں یا واک کر رہا ہوتا ہوں۔"

"اپنے ڈرامے بھی دیکھتے ہیں؟"

"بالکل دیکھتا ہوں۔ "سر راہ" بڑی پابندی کے ساتھ دیکھا میں نے۔ ویسے میں اپنا ڈرامہ دیکھتا ضرور ہوں۔ مگر مجھے مزا نہیں آ رہا ہوتا۔ کیونکہ مجھے ہمیشہ اپنے کام میں بہت خامیاں اور بہت کمی محسوس ہوتی ہے۔ اور بجائے خوش ہونے کے کہ میرا ڈرامہ آن ایئر ہے مجھے عجیب سا ڈپریشن سا ہونے لگتا ہے کہ یہ بھی غلط ہو گا۔ ایسا بھی نہیں ہونا چاہیے تھا وغیرہ وغیرہ۔ سیریل تو میں بالکل بھی نہیں دیکھ پاتا لیکن "سر راہ" میں نے دیکھا مگر وہی بات کہ خامیاں زیادہ نظر آئیں۔"

"اکثر ڈراموں میں بہت سے گھپلے ہوتے ہیں اور اس کا جواب رائٹر یہی دیتے ہیں کہ ڈائریکٹر اپنی مرضی سے تبدیلیاں کر دیتے ہیں آپ کیا کہیں گے؟" "ہوتا تو اصل میں ایسا ہی ہے رائٹرز کا لکھا جب سیٹ پر جاتا ہے تو ڈائریکٹر اور اداکار کی ملکیت ہو جاتا ہے۔ اور وہ اپنی سہولت اور اپنی پسند کے تحت بہت بہت تبدیلیاں کر لیتے ہیں تو...... بعض تبدیلیاں اچھی بھی ہوتی ہیں اور بعض بری بھی۔ سیٹ پر مصنف کی ہر وقت کی دستیابی بھی ممکن نہیں ہے۔ سو بعد میں رائٹر کی یہ مجبوری بن جاتی ہے کہ وہ تبدیلیوں کو اون کرے کیونکہ وہ باقی ڈرامہ بھی اون کر رہا ہوتا ہے۔ تو ٹی وی ڈرامہ کسی ایک کا بھی تھا ہی نہیں۔ اس میں سب اپنا اپنا حصہ ڈالتے ہیں۔"

میری بھی سنیئے

نوید رضا

رِدارہ

1 "نام؟"
"نوید رضا اور سب مجھے نومی کہتے ہیں۔ میں 7 جولائی کو دنیا میں آیا الحمد للہ، جولائی کے حساب سے میرا استارہ سرطان بنتا ہے۔ اور اردو ہماری مادری زبان ہے اور چار بہن بھائیوں میں میرا نمبر پہلا ہے۔ تعلیمی ڈگری گریجویشن کیا ہے اور جناب شادی شدہ ہوں اور ایک عدد ماشاء اللہ سے بیٹی بھی ہے۔"

2 "فیلڈ میں آیا؟"
"جو لوگ کہتے ہیں کہ ہمیں بچپن سے شوق تھا تو کچھ غلط بھی نہیں کہتے کہ اندر ہی اندر انسان اس شوق کو پال رہا ہوتا ہے اور جہاں اسے موقع ملتا ہے اسے باہر لے آتا ہے تو بس میرا بھی یہی حال تھا۔"

3 "فیلڈ میں آنے کا ذریعہ؟"
"آج سے گیارہ سال قبل ایک پروگرام تھا ٹی وی پہ جس کا نام تھا "ہیرو بننے کی ترنگ" اس میں جا کر حصہ لیا۔ کامیاب ہو گئے تو ڈراموں میں آنے لگا۔"

4 "سپورٹ ملی؟"
"جی بالکل ملی، گھر والوں کی سپورٹ ملی۔ بہت حوصلہ افزائی کی اور اب تک کر رہے ہیں۔"

5 "کام آسان ہے یا مشکل؟"
"مجھے اپنے کام سے بہت محبت ہے اس لیے مشکل بھی ہو تو آسان لگتا ہے۔"

6 "آج کل آن ایئر ڈرامے؟"
"تنکے کا سہارا اور نکاح۔"

7 "زندگی کا پہلا پیار؟"
"جب اسکول میں تھا تو اپنی ایک ٹیچر سے پیار ہو گیا تھا۔ شکر کہ بھوت جلدی اتر گیا۔"

8 "روزانہ کی روٹین؟"
"صبح نو بجے اٹھتا ہوں۔ جم جاتا ہوں۔ اور پھر جو اگر ریکارڈنگ پر جانا ہو تو وہاں چلا جاتا ہوں۔"

9 "صبح اٹھ کر چائے پیتا ہوں یا کافی؟"
"مجھے بلیک کافی پسند ہے۔ اس لیے صبح اٹھ کر وہی پیتا ہوں۔"

10 "کیا برداشت نہیں؟"
"بھوک...... بالکل نہیں برداشت ہوتی۔"

11 "پسندیدہ کھانا جس کے لیے انکار ناممکن ہے؟"
"بریانی اور بن کباب۔"

12 "مشورہ لیتا ہوں؟"
"پہلے اپنے آپ سے اور پھر اپنی بیگم سے۔"

13 "کوئی فیصلہ جو غلط ہوا ہو؟"
"اول تو نہیں ...... لیکن اگر ہو بھی جائے تو زندگی میں اونچ نیچ ہوتی رہتی ہے۔ اور اس پر پچھتاوا نہیں ہونا چاہیے۔"

14 "شوبز چھوڑ سکتا ہوں؟"
"کبھی نہیں...... کسی کی خاطر بھی نہیں۔"

15 "اداکاری سیکھی؟"

"اپنے سینئرز سے اپنے تجربے سے۔"

16 "گیم جو پسند ہے؟"

"باکسنگ اور دو ڈھائی سال سے سیکھ بھی رہا ہوں۔"

17 "پیسے کے لیے میری سوچ؟"

"کہ ایک ہاتھ سے کماؤ اور دوسرے ہاتھ سے آگے بڑھاؤ بڑا اجر ہے اس میں۔"

18 "خواب جو پورا نہیں ہوا؟"

"اللہ کا شکر ہے ایسا کوئی خواب نہیں جو پورا نہ ہوا ہو۔"

19 "شوبز میں سب کچھ اچھا ہے؟"

"نہیں...... سب کچھ اچھا نہیں ہے۔ پیسہ بھی ہے۔ عزت و شہرت بھی ہے۔ مگر روزمرہ کی روٹین بہت خراب ہے۔"

20 "بیماری سے ڈرتا ہوں؟"

"کبھی کبھی...... بیماری تو ایک امتحان ہے اللہ اس پر پورا اتارے۔"

21 "علاج کرواتا ہوں؟"

"ڈاکٹر سے...... مجھے یہی بہتر لگتے ہیں۔"

22 "مضمون برا لگتا تھا اور ہے؟"

"ہاہاہا...... میتھ بہت مشکل لگتا تھا۔"

23 "جدوجہد سے مقام بنایا آسانی سے؟"

"بہت جدوجہد کی، غربت میں بھی وقت گزرا، سب کچھ آسانی سے نہیں ملا...... اللہ کا شکر ہے کہ کبھی کسی کے آگے ہاتھ نہیں پھیلایا۔"

24 "ایک بات جو زندگی میں سیکھی؟"

"کہ کرو سب کے لیے...... مگر امید کسی سے نہ رکھو کہ وہ آپ کے لیے کرے گا۔"

25 "میری دعا ہے کہ......؟"

"جب تک میری زندگی ہے سب کے کام آؤں۔ خاص طور پر میرے گھر والے مجھ سے کبھی مایوس نہ ہوں۔"

26 "کس طرح کے رول انجوائے کرتا ہوں؟"

"ویسے تو ہر طرح کے...... مگر پھر بھی رومانٹک رول زیادہ انجوائے کرتا ہوں۔"

27 "وہ رول جس پر بہت داد ملی؟"

"ایک ڈرامہ کیا تھا "دل تو کچا ہے" اس میں میں نے رمضان خان کا کردار کیا تھا۔ اسے بے حد پسند کیا گیا۔ خاص طور پر پٹھان بھائیوں نے...... اور اس کے علاوہ جن جن ممالک میں ہمارے ڈرامے دیکھے جاتے ہیں وہاں سے بھی پسندیدگی کے پیغامات آئے تھے۔"

28 "میں چاہتا ہوں کہ......؟"

"زندگی میں کبھی "آصف علی زرداری صاحب" کا کردار کروں۔ کیونکہ وہ کافی دلچسپ شخصیت کے مالک ہیں۔"

29 "پلان کرتا ہوں؟"

"نہیں۔ اللہ مجھے اپنے بنائے پلان پر چلاتا ہے۔ اس لیے میں خود سے پلاننگ نہیں کرتا۔"

30 "دن کن کاموں میں گزرتا ہے؟"

"آپ یقین کریں کہ "آدھا دن" آئینے کے سامنے گزرتا ہے کیونکہ ہمارا کام ہی ایسا ہے۔ کیمرے کے سامنے جانے سے پہلے اپنا جائزہ لینا پڑتا ہے۔"

31 "زندگی کب مکمل لگتی ہے؟"

"جب صحت ہو، جیب میں پیسہ ہو، اچھی بیوی ہو اور پھر اولاد جیسی نعمت بھی۔"

32 "ماضی یاد آتا ہے؟"

"جب اپنا آج دیکھتا ہوں کہ کیا تھا، اللہ نے کہاں پہنچا دیا۔ بڑا کرم ہے اللہ تعالیٰ کا۔ محنت کا صلہ ملا ہے مجھے۔"

33 "وہ کردار نہیں کرتا؟"

"جو مجھے حقیقت سے دور لگتا ہے وہ کردار کرنے سے انکار کر دیتا ہوں۔ اور ایسا میں کئی بار کر چکا ہوں۔"

34 "غصہ آتا ہے؟"

"جب میں دیکھتا ہوں کہ لوگ سگنل توڑ کر یعنی

ریڈ لائٹ پر کھڑے ہونے کے بجائے آگے نکل جاتے ہیں۔ مطلب کوئی قانون ہی نہیں ہے ہمارے ملک میں۔"

35 "میں خرچ کرتا ہوں؟"
"اپنی بیٹی کی شاپنگ پر...... کھانے پر اور چیئر یٹی پر بھی۔ کیونکہ اللہ برکت ڈالتا ہے۔"

36 "گھر سے باہر کھانا پسند ہے یا گھر کا؟"
"آپ سن کر حیران ہوں گے کہ میں گھر سے باہر ہی کھانا کھاتا ہوں۔ کیونکہ مجھے گھر آنے میں دیر ہو جاتی ہے۔ پھر گھر والوں کو تکلیف نہیں دیتا۔"

37 "شادی کی رسومات؟ کیا پسند ہے کیا نہیں"
"سب پسند ہے۔ یہ خوشیوں کے دن ہوتے ہیں۔ سب کو انجوائے کرنے چاہئیں۔ کسی رسم کے خلاف نہیں ہوں۔"

38 "کبھی دوسروں کی باتیں سننے کا اتفاق ہوا"
"ہاں، اکثر اگر اتفاقیہ سننے کا شوق نہیں ہے، نہ ہی پسند ہے۔"

39 "کوئی رائٹر جس کے اسکرپٹ میں کام کرنا چاہتا ہوں؟"
مجھے رائٹرز میں زنجبیل صاحبہ کا کام بہت پسند ہے بس انہی کی تحریر، انہی کے ڈرامے میں کام کرنا چاہتا ہوں۔"

40 "بچت کرتا ہوں؟"
"نہیں، یہی تو خامی ہے کہ بچت نہیں کر سکتا۔ جمع کرنے کا شوق نہیں ہے۔"

41 "کوکنگ سے لگاؤ؟"
"بالکل بھی نہیں۔ دوسری ذمہ داریاں اتنی ہیں کہ ان چیزوں کے لیے ٹائم ہی نہیں۔ ویسے شوق ہی نہیں ہے کھانے پکانے کا۔"

42 "تہوار اچھے لگتے ہیں کیونکہ؟"
"کیونکہ رشتہ داروں اور دوستوں یاروں سے ملاقات ہو جاتی ہے۔ ورنہ عام وقت میں تو بندہ مصروف ہی رہتا ہے۔"

43 "تھکن ہو جائے تو؟"

"پھر لمبی نیند سوتا ہوں۔ نیند کا دھنی ہوں اور بہت سیر لیس بھی ہوں۔"

45 "تقریب میں جانے کے لیے کون جلدی تیار ہوتا ہے؟"
"ہم سب ہی...... امی اور بیگم کسی کو شوق نہیں کے آئینے کی سامنے کھڑے ہو کر بننے سنورنے کا۔"

46 "موبائل کا استعمال کب شروع کیا؟"
"جب کالج میں داخلہ لیا تو پھر موبائل استعمال کرنے کی اجازت ملی۔"

47 "جو دل سے اتر جائے وہ......؟"
"وہ دوبارہ دل میں اپنی جگہ نہیں بنا سکتا۔ کم سے کم میرے دل میں تو نہیں۔"

48 "ملک سے باہر جاب کرنی پڑے تو؟"
"مجھے ملک سے باہر جاب کرنے کی آفر آ چکی ہے مگر میں نے انکار کر دیا کیونکہ مجھے ملک سے باہر رہنا پسند نہیں، البتہ گھومنے پھرنے کا بہت شوق ہے۔"

49 "کون سی تاریخیں یاد رہتی ہیں؟"
"اپنے سب پیارے رشتوں اور اچھے دوستوں کی سالگرہ اور شادی کی تاریخیں یاد رہتی ہیں۔"

50 "نصیحت پر عمل کرتا ہوں؟"
"سن لیتا ہوں۔ عمل کا کچھ نہیں کہہ سکتا۔ ویسے ایک کان سے سنتا ہوں اور دوسرے سے نکال دیتا ہوں۔"

☆☆

لائبہ ملک

ردارہ

س ''آپ کا اصلی نام کیا ہے اور گھر والے کس نام سے پکارتے ہیں؟''

ج ''جی میرا پورا نام لائبہ ہے۔ اور گھر والے پیار سے سونو کہتے ہیں پاپا سونو آپی کہتے ہیں۔''

س ''آئینہ آپ سے کیا کہتا ہے؟''

ج ''آئینہ بے چارہ کیا کہے گا وہ تو چپ چاپ میری حرکتیں دیکھتا ہے جو میں اس کے سامنے کھڑی کرتی رہتی ہوں۔''

س ''حسین صورت دیکھ کر کیا خیال آتا ہے؟''

ج ''خیال تو صرف ایک ہی آتا ہے کہ کیا لگاتی ہیں یہ جو ماشاءاللہ اتنی پیاری ہیں۔''

س ''اگر آپ کے پرس کی تلاشی لی جائے تو؟''

ج ''ہم...... پرس گھر میں تو خالی رہتا ہے البتہ کہیں جاؤں تو اس میں موبائل، پیسے اور چیز رکھ لیتی ہوں۔''

س ''بھوتوں سے ڈرتی ہیں؟''

ج ''بھوتوں سے کبھی واسطہ نہیں ہوا اس لیے پتا نہیں ویسے نہیں ڈرتی الحمدللہ۔''

س ''کیسے مہمان پسند ہیں؟''

ج ''مہمان وہ پسند ہیں جو دل کے قریب ہیں مثلاً میری پھپھو جنہیں میں آپی کہتی ہوں۔ دو پھپھو ہیں میری، دونوں کا آنا ہی بہت اچھا لگتا ہے۔'' دل باغ باغ ہو جاتا ہے۔''

س ''کھانے میں کیا پسند ہے؟''

ج ''کھانے میں بریانی، وائٹ قورمہ، پائے، ویجیٹیبل پلاؤ اور بھی بہت کچھ پسند ہے مگر یہ سب چیزیں زیادہ پسند ہیں۔''

س ''پسندیدہ شاعر؟''

ج ''شاعر کوئی بھی ہو مجھے تو شعر اچھا لگنا چاہیے۔''

س ''لوڈشیڈنگ نہ ہوتی تو؟''

ج ''تو بچوں کو اندھیرے میں ڈرانے کا مزا کیسے آتا۔''

س ''ماضی کی کون سی ہستی کے ساتھ ایک دن گزارنا پسند کروں گی؟''

ج ''میری دادی۔'' بلکہ میری ماں کہیں تو غلط نہ ہوگا انہوں نے مجھے بچپن سے پالا ہے میری بال بناتی تھیں۔ میرے کپڑے سیتی تھی، مجھے اپنے ہاتھوں سے کھانا کھلاتی تھیں میرا ہر وہ کام کرتی تھیں جو ایک ماں کرتی ہے۔ میں انہیں امی کہتی تھی، انہی کے پاس سوتی تھی، ان کے بغیر نیند نہیں آتی تھی۔ ڈیڑھ سال ہو گیا ہے ان کے انتقال کو لیکن لگتا ہے کل کی بات ہے اللہ ان کی مغفرت کرے (آمین)

س ''اللہ کو یاد کرنے کا بہترین وقت؟''

ج ''اللہ تو ہمارے دل میں رہتا ہے ہمارے پکارنے کا منتظر ہے ہم جب چاہیں اسے یاد کر سکتے ہیں۔''

س ''حقیقی خوشی کب ملتی ہے؟''

ج ''جب میرے اپنے خوش ہوتے ہیں تو بہت خوشی ملتی ہے۔''

س ''اپنی تعریف سن کر خوشی ہوتی ہے؟''

ج ''اگر تعریف دل سے کی گئی ہو تو بہت خوشی ملتی ہے۔''

س ''زندگی سے کیا سیکھا؟''

ج ''ابھی تو میں صرف اٹھارہ سال کی ہوں لیکن سب کہتے ہیں میں بہت بڑی بڑی باتیں کرتی ہوں۔ ابھی تک تو صرف یہ سیکھا ہے کہ ہم انسان ایک دوسرے کو بھی سمجھ نہیں سکتے چاہے وہ ماں اور بیٹی ہی کیوں نہ ہوں کبھی کبھی وہ بھی ایک دوسرے کو سمجھنے میں غلطی کر دیتی ہیں۔ ہمیں اپنے رب سے بہتر کوئی نہیں سمجھ سکتا ہے۔''

س ''کون سے خوب صورت لمحے کی منتظر ہیں؟''

ج ''میں جس لمحے کی شدت سے منتظر ہوں وہ یہ ہے کہ میں مدینہ اور مکہ کی زیارت کروں ان شاءاللہ ضرور سنے گا میری دعا۔ (آمین)''

حمیرا شفیع

پرفیکٹ میچ

علینہ! اُس دن وہ لڑکا تمہیں کیسا لگا تھا؟" وہ تایا جی کے سامنے کے سامنے ناشتا لگا رہی تھی جب انہوں نے اچانک پوچھ لیا۔ وہ ٹپٹا پٹا سی گئی اور اچنبے سے بولی۔

"کون سا لڑکا......؟؟ تایا ابو!"

"ارے وہی جو جناح کالونی میں دیکھا تھا۔" وہ پراٹھے پر ایک موٹی تازی سی آم کے اچار کی قاش سجاتے ہوئے بولے۔

"جناح کالونی میں......؟ او اچھا یاد آیا وہاں تو ہم انکل ایثار کے گھر گئے تھے مگر تایا ابو بھلا انکل ایثار کوئی لڑکا تھوڑی ہیں۔ وہ تو اچھے خاصے آپ کی عمر کے ایجڈ سے شخص ہیں۔ پر ہیں بہت بذلہ سنج اور خوش مزاج۔ سچی میں بڑی متاثر ہوئی اُن کی شخصیت سے۔"

"کوڑھ مغز اس ایثار کی نہیں اس کے بھتیجے کی بات کر رہا ہوں جو انہیں بجلی کا بل دینے آیا تھا۔" اب کے تایا جی جھنجلا گئے۔

"ہیں بھتیجا......؟" اُس نے ذہن پر زور دیا تو یاد آیا کہ جب وہ لوگ چائے پی رہے تھے تو کوئی دستک دے کر اندر آیا تھا مگر وہ تو اُس وقت اپنے موبائل میں غرق تھی۔ فارینہ نے لان کے نئے پرنٹ واٹس ایپ کیے تھے۔ وہی دیکھنے میں اتنی مگن تھی کہ آنے والے پر چنداں دھیان نہ دے سکی۔ صرف اس کے پاؤں پر ہی نظر پڑی تھی۔ اس لیے معصومیت سے بولی۔

"سوری تایا ابو! میں نے موصوف کو ٹھیک سے دیکھا نہ تھا ہاں البتہ جوتے اُس نے بہت عمدہ پہن رکھے تھے۔"

"بہت نالائق ہو تم......!! میں جہاں جاتا ہوں تمہارے لیے لڑکے تاڑنے بیٹھ جاتا ہوں اور تمہاری غائب دماغی کا یہ حال ہے" وہ کچھ خفگی سے بولے۔

"مگر تایا ابو! میں نے لڑکوں کا آخر کرنا کیا ہے......؟ کیا اُن سے اچار ڈلوائیں گے۔ جبکہ آپ تو صرف آم اور ہری مرچ کا اچار پسند کرتے ہیں۔"

اس بار اُس کی لن ترانیوں پر حقیقت میں ان کا پارہ چڑھ گیا اور انہوں نے پاس پڑی اسٹک اٹھائی۔ اُن کے خطرناک تیور دیکھ کر اُسے بھی سنجیدہ ہونا پڑا۔

"تایا ابو! پلیز فی الحال میری شادی وادی کا معاملہ رہنے دیں۔ میں ابھی اپنا کیریئر بنانا چاہتی ہوں۔"

"فارینہ بھی یہی کہتی تھی۔ اب دیکھو کتنے مزے سے بچے پال رہی ہے۔"

"مگر تایا ابو! آج کل کی عورت کو اپنے پاؤں پر کھڑا ہونا چاہیے۔"

"ہاں تو آج کل کی عورت کو پاؤں پر کھڑا ہونے سے کون روک رہا ہے۔ مگر بٹیاں، وقت پر گھر بسانا بھی ضروری ہے۔" اُن کا انداز ناصحانہ تھا۔ "وہاں دیارِ غیر میں تمہارے والدین تمہاری شادی کرنے کے لیے اتاؤلے ہوئے جا رہے ہیں۔ میرا ابھی یہی خیال ہے

کہ یہ وقت مناسب ہے۔ زیادہ دیر ہو جائے تو ہمارے معاشرے میں لڑکیوں کے لیے مسائل بڑھ جاتے ہیں۔ بہتر ہے کہ تم خود کو ذہنی طور پر تیار کرو۔"

اتنے میں اُن کا فون بجنے لگا تو وہ برتن سمیٹ کر باہر چلی آئی۔

☆☆☆

سردیاں کب کی رخصت ہو چکی تھیں مگر حالیہ ہونے والی بارشوں نے گرمیوں کو ابھی اپنا رنگ جمانے کا موقع نہیں دیا تھا۔ اس لیے ٹھنڈا میٹھا سا موسم فرحت بخش محسوس ہو رہا تھا۔ وہ لان میں چہل قدمی کر رہی تھی جب پاس ہی میز پر دھرا اس کا موبائل تھرا اُٹھا۔ "مما کالنگ" لکھا نظر آ رہا تھا۔ اُس نے بٹن دبایا۔

"ہیلو چندا! کیسی ہو......؟" مما کی کھنکتی ہوئی آواز سنائی دی۔

"میں بالکل ٹھیک ٹھاک ہوں مما!"

"وہ تمہاری جاب کا کیا ہوا......؟"

"ابھی تک تو کچھ نہیں ہوا مما! ایک دو جگہ انٹرویو تو دے رکھا ہے مگر زیادہ چانس نہیں ہے۔ لیکن اب اب میں اپنے فیبرک پینٹنگ کے کام کو پروفیشن کے طور پر اپنانے کا ارادہ کر چکی ہوں۔ اپنا پیج بنالیا ہے۔ فی الحال تو آن لائن کام کروں گی۔"

"ویری گڈ! چندا! ذرا اپنے تایا جی سے تو بات کروادو۔ وہ فون ہی نہیں اُٹھا رہے۔" وہ کچھ عجلت میں تھیں۔

"میں کرواتی ہوں مما۔ وہ دراصل اپنا فون سائلنٹ پر رکھ کر بھول جاتے ہیں۔"

وہ لمبے لمبے ڈگ بھرتی ہوئی ان کے کمرے میں آئی تو وہ قوالیاں سننے میں مگن تھے۔ اُس نے فون اُنہیں تھمایا اور خود چائے بنانے کچن میں چلی آئی۔

"ہیلو قدسیہ! کیا حال ہے......؟" تایا جی نے فون کان سے لگایا۔

"سنا ہے کہ تم لوگوں کے ہاں کرونا کی ایک اور نئی قسم دریافت ہوئی ہے۔"

"بس بھائی صاحب! کیا بتائیں ساری اے بی سی ختم ہوگئی ہے مگر یہ کرونا کی نت نئی قسمیں دریافت ہونا بند نہیں ہوتیں۔ پھر یہاں ایس او پیز پر بھی سختی سے عمل کرنا پڑتا ہے۔ پاکستان میں تو آپ لوگوں کی موجیں ہیں پابندیوں کو چٹکیوں میں اُڑا دیتے ہیں۔"

"ارے! اپنے وطن کی تو بات ہی اور ہے۔ کیسے کرونا منہ کی کھا کر نکلا ہے یہاں سے۔" اُن کا لہجہ فخریہ تھا۔

"وہ بھائی صاحب! پھر علینہ کے لیے کوئی لڑکا دیکھا آپ نے۔" وہ اصل مدعا پر آ گئیں۔

"ہاں کیوں نہیں۔ ایک دو ہیں میری نظر میں۔ بس چھان بین کروا تا ہوں جب تم لوگ پاکستان آ ؤ گے تو علینہ کی رائے سے کسی ایک کو فائنل کر لینا۔"

"نہیں بھائی صاحب! فائنل بھی آپ نے ہی کرنا ہے۔ ہمیں آپ پر پورا اعتماد ہے۔ آخر قارینہ کا دلہا بھی تو آپ نے ہی ڈھونڈا تھا۔ کیسا خوبرو اور شان دار ہے۔ ماشاءاللہ سے چاند سورج کی جوڑی ہے۔ اللہ نظر بد سے بچائے۔ بس علینہ کے لیے بھی ایسا ہی پرفیکٹ میچ ،ڈھونڈ یے گا۔"

"دیکھو قدسیہ! پرفیکٹ تو صرف اللہ تعالیٰ کی ذات ہے۔ پھر رنگ گورے کالے یا قد چھوٹے بڑے سے کیا ہوتا ہے۔ شخصی خوبیاں زیادہ اہم ہوتی ہیں۔" انہوں نے اپنی جذباتی سی بھاوج کو آسان سے سمجھایا۔

"پھر بھی بھائی صاحب اپنی علینہ بھی تو لاکھوں میں ایک ہے۔ کوئی اُس سے بڑھ کر نہ سہی مگر اُس کے ہم پلہ تو ہو۔"

"کیوں نہیں! ان شاءاللہ ایسا ہی ہوگا۔ بس تم دعا کرو کہ بچی کا نصیب نیک ہو۔"

"آمین" وہ جذبے سے بولیں۔

"ثم۔ آمین" اُنہوں نے صدق دل سے دُعا کی اور فون بند کر دیا۔

☆☆☆

آج کل لان اور کاٹن کے سوٹوں کے ساتھ

شیفون کے دوپٹے فیشن میں اِن تھے۔ اُسے ہی تھی ریشمی دوپٹوں پر پینٹ کے کچھ آرڈر ملے تھے۔ اُس کے پاس مطلوبہ کلرز نہیں تھے۔ شفیق آج چھٹی پر تھا۔ اس نے خود ہی گاڑی نکالی اور مارکیٹ کا رخ کیا۔ آج خلافِ معمول زیادہ رش نہیں تھا۔ وہ کلرز شاپ کی تلاش میں تھی جب اُسے سڑک کنارے ایک لڑکی نظر آئی جو غالباً کسی سواری کا انتظار کر رہی تھی۔ اچانک موٹر سائیکل پر مخالف سمت سے دو لڑکے نمودار ہوئے۔ پیچھے والے نے لڑکی کے داہنی کندھے سے جھولتا ہوا اُس کا پرس نوچا اور یہ جا وہ جا۔ لڑکی جھٹکا کھا کر گرنے کے انداز میں سڑک پر بیٹھتی چلی گئی۔ اتنے میں سامنے شاپنگ مال سے بھی ایک شخص نکلا اور باہر کھڑی موٹر سائیکل اسٹارٹ کر کے طوفانی رفتار سے اُسی سمت روانہ ہو گیا جس سمت لڑکے گئے تھے۔ اب وہ انہی کا ساتھی تھا یا کوئی اور وہ سمجھ نہ پائی۔ اُس نے جلدی سے گاڑی اُس لڑکی کے پاس روکی۔

"ہائے! وہ میرا پرس لے گئے۔ اُس میں پیسے اور موبائل تھا۔ اب میں گھر کیسے جاؤں گی۔"

وہ بُری طرح سے رو رہی تھی۔ اُس نے اُسے دلاسا دیا اور گھر تک چھوڑنے کی آفر کی مگر وہ اس حادثے کے بعد اس قدر وحشت زدہ تھی کہ فی الحال کسی پر بھی اعتبار کرنے کے لیے تیار نہ تھی۔ (خواہ وہ کوئی عورت ہی کیوں نہ ہو)۔

اُس کا تذبذب دیکھ کر اُس نے اپنا فون اُس کی سمت بڑھایا۔

"یہ لو اپنے گھر سے کسی کو بلا لو۔"

لڑکی کو تجویز معقول لگی۔ اُس نے چند بٹن دبا کر اپنے گھر بات کی۔ اتنے میں کچھ ٹھیلے والے اور راہ گیر بھی ان کے اردگرد جمع ہو گئے۔ اور عجیب عجیب سے سوال کرنے لگے۔

"گھر سے اکیلی کیوں نکلیں......؟" "کہاں جانا ہے؟"

"پرس میں کتنے پیسے تھے......؟؟"

لڑکی مزید نروس ہو رہی تھی۔

"چلو سامنے شاپنگ مال میں چلتے ہیں جب تک تمہارے گھر سے کوئی آ نہیں جاتا وہیں انتظار کر لیتے ہیں۔" وہ اسے لیے مال میں داخل ہوئی۔ دونوں ونڈو سائیڈ پر بیٹھ گئیں تو اُس نے ملازم کو دو جوس لانے کے لیے کہا۔

"خالہ کے گھر جانے کے لیے نکلی تھی۔ بابا نے کہا بھی تھا کہ بھائی چھوڑ آئے گا مگر میں نے بھائی کا انتظار نہیں کیا اور اکیلی ہی چلی آئی۔ وہ خبیث شاید گلی کی نکڑ سے ہی میرے پیچھے لگے ہوئے تھے۔" لڑکی کے حواس کچھ کچھ بحال ہو رہے تھے۔

تھوڑی دیر بعد وہی موٹر سائیکل والا شخص اندر داخل ہوا۔ اس کے ہاتھ میں لڑکی کا بیگ تھا۔

"میں جب ان کے سر پر پہنچ گیا تو وہ بیگ پھینک کر فرار ہو گئے۔" وہ پھولی سانسوں کے ساتھ بتا رہا تھا۔

"شکریہ......" لڑکی اپنا بیگ پا کر خوش ہو گئی مگر ساتھ ہی فکرمندی سے بولی۔ "آپ کو یوں اپنی جان خطرے میں نہیں ڈالنی چاہیے تھی۔"

"ہاں وہ فائرنگ بھی کر سکتے تھے۔" علینہ بھی اُس سے متفق تھی۔ مگر اُس شخص کے چہرے پر مہربان سی مسکراہٹ تھی۔

اتنے میں لڑکی کا بھائی آ پہنچا تو وہ ایک بار پھر ان دونوں کا شکریہ ادا کرتے ہوئے اُس کے ہمراہ چلی گئی۔

اُس نے بھی پرس سے جوس کے پیسے نکالے اور ملازم لڑکے کی جانب بڑھائے تو وہ شخص جلدی سے بولا "آپ رہنے دیں۔"

"مگر کیوں......؟؟" وہ ٹھٹک گئی۔

"کیونکہ یہ شاپنگ مال میرا ہے۔"

"دراصل آپ نے مجھے شاید پہچانا نہیں۔ میں ایاز انکل کا بھتیجا ہوں۔"

"اوہو......" اُس کے منہ سے ٹھنڈی سانس نکل گئی۔ اُس دن اُس نے اُسے دیکھا ہی نہیں تھا تو پہچانتی کیسے۔ اسی وجہ سے تایا جی نے اُسے اتنے طعنے دیے تھے۔ آج موقع مل ہی گیا تھا تو اس نے اُس پر

ایک گہری نظر ڈالی۔ وہ خوش شکل سا دراز قد نوجوان تھا۔ سر پر پی کیپ بھی اور لباس بھی پروقار سا زیب تن کر رکھا تھا۔

"آئیں! میں آپ کو ڈراپ کر دیتا ہوں۔" وہ اس کی نظروں سے خائف ہو کر ذرا سا جھینپ کر بولا۔

"نہیں میرے پاس گاڑی ہے۔" وہ خدا حافظ کہہ کر تیزی سے باہر نکل آئی۔

☆☆☆

اسی طرح سر راہ آفاق سے اُس کی دو چار ملاقاتیں اور ہوئیں۔ اُس کے والدین حیات نہیں تھے۔ انکل ایثار نے اُسے پالا تھا۔ ایم۔ بی۔ اے کرنے کے بعد جب وہ دو چار سال نوکری نہ ملنے سے ادھر اُدھر بھٹکتا رہا تو اُنہوں نے اسے آبائی زمین فروخت کر کے شاپنگ مال کھول کر دیا گیا۔ پھر جب ایک دن تایا جی نے اُسے پاس بٹھا کر آفاق کے پرپوزل کے بارے میں بتایا اور اس کی رائے چاہی تو وہ انکار نہ کر سکی اس کے پاس انکار کا کوئی جواز نہیں تھا۔ وہ خوش مزاج سا نرم خو انسان تھا۔ عورت کی عزت کرنا جانتا تھا اور پھر قارینہ کے نزدیک سب سے بڑھ کر مما کی شرط۔ "چاند سورج کی جوڑی" اور "پرفیکٹ میچ" پر بھی پورا اترتا تھا۔

☆☆☆

ایک دوپہر وہ ایک دوپٹے پر پینٹ کر رہی تھی جب ملازمہ نے آ کر بتایا کہ آفاق صاحب آئے ہیں اور وہ آپ سے کوئی ضروری بات کرنا چاہتے ہیں تو وہ حیران رہ گئی۔ چند دن تک اُن کی منگنی متوقع تھی اور پھر بات تو فون پر بھی ہوتی رہتی تھی۔ اب کون سی ضروری بات تھی جو یوں روبرو کرنی تھی۔ تایا جی گھر پر نہیں تھے۔ اُس نے ملازمہ سے اُسے ڈرائنگ روم میں بٹھانے کو کہا۔ تھوڑی دیر بعد وہ اندر داخل ہوئی تو وہ سر جھکائے سامنے صوفے پر براجمان تھا۔ اُس نے گرے کلر کی شرٹ اور بلیک ڈریس پینٹ پہن رکھی تھی اور سر پر اپنی مخصوص پی کیپ کے ساتھ ہمیشہ کی طرح بہت شاندار دکھ رہا تھا۔ آہٹ پر اُس نے سر اُٹھایا۔

"السلام علیکم!" وہ تعظیماً کھڑا ہوا۔

"وعلیکم السلام۔" اُس نے ہاتھ کے اشارے سے بیٹھنے کو کہا اور خود بھی اُس کے سامنے صوفے پر ٹک گئی۔

کچھ دیر تک دونوں کے مابین خاموشی ٹھہری رہی۔ وہ لڑکی ہو کر پورے اعتماد سے اُس کے سامنے بیٹھی تھی اور وہ لڑکا ہو کر کچھ گھبرایا اور کچھ کترایا ہوا سا اپنے ہاتھوں کی مٹھیاں کھول اور بند کر رہا تھا۔ جب خاموشی کا وقفہ زیادہ طویل ہو گیا تو اُسے ہی پکارنا پڑا۔

"آفاق......!"

"جی......" وہ سوچوں میں ڈوبا ہوا دھیرے سے بولا۔

"آپ شاید مجھ سے کوئی ضروری بات کرنے آئے تھے۔" اُس نے اُسے یاد دلایا۔

"وہ علینہ جی!......" اُس نے سیدھا ہو کر خود کو کمپوز کیا اور گویا ہوا۔ "بات دراصل یہ ہے کہ لڑکیاں اپنے نیون ساتھی کے بارے میں بہت حساس ہوتی ہیں۔

(ہیں تو کیا لڑکے نہیں ہوتے؟)

"مگر لڑکیاں زیادہ حساس اور جذباتی ہوتی ہیں۔" اُس نے گویا اس کی سوچ پڑھ لی۔

"وہ اپنے لائف پارٹنر کو مکمل شخصیت کے روپ میں دیکھنا چاہتی ہیں کسی کمی کجی کو قبول کرنا اُن کے لیے بہت مشکل ہوتا ہے۔

(آپ نے لڑکیوں کی نفسیات پر پی ایچ ڈی کر رکھی ہے کیا)

"میں اپنی ذات کے متعلق آپ سے کچھ نہیں چھپانا چاہتا......آپ ایک مخلص لڑکی ہیں۔ میں آپ کے جذبات کو ٹھیس بھی نہیں پہنچانا چاہتا......"

(اُف توبہ! اتنا سپنس)

"دیکھیں آفاق صاحب! آپ کھل کر بات کریں میں مضبوط اعصاب کی مالک ہوں۔" اب اُس کا ضبط جواب دے گیا۔ اس کو اندازہ ہو گیا کہ وہ اپنے کسی سابقہ افیئر کے بارے میں بتانا چاہ رہا

ہے۔

"بات یہ ہے علینہ جی، کہ میرے ساتھ یہ مسئلہ ہے۔" یہ کہتے ہوئے اُس نے جھٹکے سے اپنی پی کیپ اُتار دی۔

اُس کا کا اوپر کا سانس اُوپر اور نیچے کا نیچے رہ گیا۔ وہ گنجا تھا۔

"بچپن میں الرجی ہوگئی تھی۔ بہت علاج کروایا مگر دوبارہ بال ہی نہیں اُگے۔ الرجی کی وجہ سے ہیر ٹرانسپلانٹ بھی نہیں ہو سکتی۔"

وہ بتا رہا تھا مگر اُسے فارینہ یاد آ رہی تھی۔ وہ کہتی تھی "یار! مردوں کی شخصیت میں سب سے چارمنگ اُن کا ہیر اسٹائل ہوتا ہے۔ لڑکیاں تو پھر اسٹالز یا اسکارف وغیرہ سے اپنے بھدے بالوں کو چھپا لیتی ہیں مگر مردوں کے پاس تو یہ آپشن نہیں ہوتا۔" اور بلاشبہ اُس کے میاں کا ہیئر اسٹائل بہت اسٹائلش سا تھا۔ فارینہ خود بھی بے بہا خوب صورت تھی۔ دونوں چاند سورج کی جوڑی تھے۔

اور آپ پر کوئی دباؤ نہیں ہے علینہ، آپ انکار کا حق رکھتی ہیں۔"

اُس کی آواز بھیگ گئی۔ وہ اُس کی خاموشی سے خود ہی اندازہ لگا رہا تھا۔

پھر فارینہ اور اُس کے میاں کی چاند سورج کی جوڑی کی آب وتاب کب تک قائم رہی۔ صرف شادی کے چند سال تک۔ بزنس کی الجھنوں میں پھنس کر دلہا بھائی کے تمام بال اُڑ گئے تھے۔ اور خود فارینہ دو بچوں کی پیدائش کے بعد پھول کر کپا ہو چکی تھی۔ اب دونوں سیلفی بناتے تھے تو ایک دوسرے کو دیکھ دیکھ کر خوب ہنستے تھے۔ مگر محبت بلاشبہ دونوں کے مابین بہت بڑھ گئی تھی۔ اور یہ محبت ہی تو ہوتی ہے جو رشتوں کو خوب صورت بناتی ہے۔

اگر آپ اپنے تایا جی کے ردِ عمل سے خوف زدہ ہیں تو میں اُن سے بھی بات کرنے کے لیے تیار ہوں۔"

"آپ کوئی کام مجھ پر بھی چھوڑیں گے یا سارے خود ہی کریں گے۔" وہ جل کر بولی۔

"ہیں جی۔ کیا مطلب......؟" اس نے ہونق پن سے پوچھا۔

(ہائے اللہ یہ شخص خود کیوں نہیں سمجھ جاتا کیا اسے میرے چہرے پر اقرار کی لالی نظر نہیں آ رہی)

"علینہ! آپ کچھ بول کیوں نہیں رہیں......؟"

اُس نے سر اُٹھایا تو وہ والہانہ نظروں سے اُسے ہی دیکھ رہا تھا۔

آفاق صاحب! مجھے آپ کے بال نہ ہونے سے کوئی مسئلہ نہیں ہے۔" یہ کہہ کر اُسے ہکا بکا چھوڑ کر تیزی سے نکل آئی۔

☆☆☆

ہائے اللہ! گنجا دولہا!" فارینہ نے دلدوز چیخ ماری۔ مما تو بے ہوش ہو جائیں گی۔ علینہ!

"کیوں بھئی! انہوں نے کوئی پہلی دفعہ گنجا مرد دیکھا ہے کیا؟ پاپا کے تو خود سر پر فقط چار بال رہ گئے ہیں۔ تایا جی کی تو شروع سے ہی ٹنڈ لشکارے مارتی ہے۔ تمہارے میاں بھی فارغ البال ہونے والے ہیں۔" اُس نے اس کے اعتراض کو چٹکیوں میں اُڑا دیا۔

"مگر میرا مطلب ہے مما کی وہ "پرفیکٹ میچ" کی تھیوری کا کیا ہوگا؟"

"دیکھو فارینہ! میرے اور آفاق کے دل میں ایک دوسرے کے لیے احترام، محبت، خلوص، وفا، اعتبار سب ہی کچھ ہے۔ جب دل میچ ہوں تو پھر کسی اور میچنگ کی ضرورت ہی نہیں رہتی۔"

دونوں کچھ دیر تک ایک دوسرے کی طرف دیکھتی رہیں پھر کھلکھلا کر ہنس دیں۔ اندر آتے تایا جی جو وڈیو کال پر قدسیہ بیگم سے بات کر رہے تھے۔ ٹھٹک سے گئے۔ انہوں نے اور قدسیہ بیگم دونوں نے فارینہ اور علینہ کی گفتگو کا آخری حصہ لفظ بہ لفظ سنا۔ کچھ دیر تک دونوں سکتے میں رہے پھر اپنی اپنی جگہ مسکرا دیے۔

☆☆

آیمن رضا

تماشا گھر

پچھلی اقساط کا خلاصہ:

چاند بی بی ایک عمر رسیدہ اور سر سے گنجی خاتون ہیں۔ ۴۷ء کے بٹوارے میں چاند کا خاندان ہندوستان سے ہجرت کر کے پاکستان آتا ہے۔ چاند کے ابو دین بابا، بھائی بستام، تین پھوپھیاں، ان کی چھ بیٹیاں اور گھر کا ملازم لڑکا رحبان...... اس خاندان کو حویلیاں شہر میں ایک ''دلکشمی حویلی'' الاٹ ہوتی ہے۔ جس کا نام وہ بدل کر ''دین حویلی'' رکھ لیتے ہیں۔ ایک رات چاند کو حویلی کی دہلیز پر ایک بچی ٹوکری میں پڑی ہوئی ملتی ہے۔ دین بابا کی مخالفت کے باوجود چاند اپنے منگیتر التمش کی اجازت سے اس بچی کو گود لے لیتی ہے اور اس بچی کا نام صندل رکھتی ہے۔

رحبان یہ جانتے ہوئے بھی کہ چاند کی شادی بہت جلد التمش سے ہونے والی ہے دن بدن چاند کی محبت میں گرفتار ہوتا چلا جاتا ہے۔ ایک دن وہ چاند سے اپنی محبت کا اظہار کرتا ہے۔ چاند رحبان سے کہتی ہے کہ وہ صرف التمش سے محبت کرتی ہے۔ رحبان کے دل میں التمش کے لیے نفرت بڑھنے لگتی ہے۔ بستام کے مشورے پر رحبان، التمش کو قتل کر دیتا ہے اور دین بابا سے چاند کا ہاتھ مانگتا ہے۔ دین بابا کی التجاء پر چاند رحبان کے رشتے کو منظور کرتے ہوئے شادی کی رضامندی دے دیتی ہے۔ لیکن پھر کسی وجہ سے یہ شادی نہیں ہو پائی۔

۱۹۷۲ء...... اب بیس سال کا عرصہ گزر چکا ہے اور صندل سمیت گھر کی باقی لڑکیاں بھی جوان ہو چکی

ہیں۔ صندل ان سب میں سب سے زیادہ شرارتی ہے۔ عید گاہ میں افشین دو خواتین کو صندل کے بارے میں ''ناجائز'' کا لفظ بولتے ہوئے سنتی ہے تو اُسے بہت دکھ ہوتا ہے۔

میرزاد اور زویا دونوں بہن بھائی ہیں۔ اپنی خراب طبیعت کی وجہ سے زویا کو حویلیاں شہر میں اپنے بھائی کے ساتھ آنا پڑا ہے۔ ان کا قیام عارضی ہے۔ اس عارضی قیام میں میرزاد کی ملاقات صندل سے ہوتی ہے۔ صندل میرزاد کو دیکھتے ہی دل دے بیٹھتی ہے۔ زویا کو دونوں کا ملنا اور بے تکلف ہونا کچھ زیادہ پسند نہیں آتا......وہ

میرزاد کی رضامندی سے میرزاد کی نسبت اپنی نند سے طے کر دیتی ہے۔ میرزاد کو اپنی غلطی کا احساس ہوتا ہے، کیونکہ اب وہ بھی صندل کو چاہنے لگا ہے۔

روشن بیگم "مینا گلی" کی مشہور طوائف ہیں۔ وہ بستامی کے خراب معاشی حالات میں اسے مشورہ دیتی ہیں کہ وہ اپنی حویلی کی لڑکیوں کو استعمال کرتے ہوئے اپنی دولت میں اضافہ کر سکتا ہے۔ بستامی ایسا ہی کرتا ہے۔ وہ افشین کا سودا لاہور کے ایک نواب کے ساتھ دس لاکھ کے عوض کر دیتا ہے۔

گیارہویں قسط

نشیبی راستوں پر اُگے ہوئے درخت ایک کے پیچھے ایک بھاگ رہے تھے۔ حویلیاں سے ایبٹ آباد تک کے سفر میں لاتعداد چھوٹے چھوٹے پہاڑ تھے۔ جن پر چھوٹے بڑے گھر بنے ہوئے تھے۔ ان گھروں میں زندگی رواں دواں ہو چکی تھیں۔ بلکہ ایسے ہی جیسے صندل کی حویلی میں صبح ہوتے ہی زندگی شروع ہو جاتی تھی۔

وہ دیکھتی جا رہی تھی۔ پہاڑوں کو، گھروں کو، درختوں کو...... اور میرزاد کو...... جو اس کے ساتھ بیٹھا ڈرائیونگ کر رہا تھا۔ اس کے مضبوط ہاتھ اسٹیرنگ پر کسے ہوئے تھے۔ کیونکہ راستہ اونچا نیچا تھا اور ڈرائیونگ بہت احتیاط مانگ رہی تھی۔

وہ افشین کے کام سے نکلی تھی۔ اور اسے ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ خود کہیں جا رہی ہو۔ حویلیاں شہر سے باہر نکلنا حسین تر لگ رہا تھا۔ اُسے ایسا لگ رہا تھا کہ جیسے شہر سے نکل کر ایبٹ آباد تک کا سفر کرنا دنیا کا حسین ترین سفر ہو۔ وہ دعا کر رہی تھی کہ یہ سفر کبھی نہ ختم ہو۔

"ہم وہاں کیوں جا رہے ہیں صندل......؟" میرزاد نے وہ سوال کافی دیر کے بعد پوچھا تھا جو اسے پہلے پوچھ لینا چاہیے تھا۔

"ہم ایک کام سے جا رہے ہیں۔"

"ظاہر ہے کہ کام سے ہی جا رہے ہیں۔ اتنی ایمرجنسی میں کام سے ہی جایا جاتا ہے۔ جتنی صبح تم میرے گھر آ گئی تھیں، مجھے تو لگا کہ اللہ خیر کرے۔ کوئی بیمار نہ ہو گیا ہو اور اسے لے کر بڑے ہسپتال نہ جانا پڑے۔"

"اللہ نہ کرے۔"

"میں تو تمہاری عجلت پر کہہ رہا ہوں۔"

"جس کے لیے جا رہے ہیں اس کی زندگی موت کا ہی مسئلہ ہے۔" صندل نے کہا تو میرزاد نے ڈرائیونگ کرتے ہوئے اسے دیکھا تھا۔ صندل کے سنجیدہ انداز نے اسے فکر مند کیا تھا۔

"ایسی کیا بات ہے۔؟"

"ہم وہاں افشین کے لیے جا رہے ہیں۔"

"افشین کے لیے کیوں......؟"

"کیونکہ وہ دنیا کا سب سے خطرناک کام کر چکی ہے میر......"

"وہ کیا ہوتا ہے۔؟" میرزاد نے سوالیہ انداز میں صندل کو دیکھا تھا۔

"محبت...... وہ محبت کر چکی ہے۔"

"محبت خطرناک کھیل ہے۔؟" وہ بناوٹی معصومیت سے پوچھنے لگا تھا۔

"خطرناک سے بھی کچھ زیادہ...... میرے پاس اس سے بڑھ کر الفاظ نہیں تھا۔ اس لیے میں نے یہ لفظ بولا

ہے۔"

"کیا تم یہ خطرناک کھیل کھیلوگی۔؟" میرزاد نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے سوال پوچھا تھا۔
صندل نہ چاہتے ہوئے بھی ایسے ظاہر کرگئی تھی جیسے وہ میر کے سوال پر گھبرا گئی ہو۔ میر اس کے گھبرانے پر مسکرایا تھا۔ وہ اسے کیا جواب دیتی کہ وہ یہ کھیل کھیل رہی ہے۔ خطرناک ترین کھیل......اس نے مکھیوں کے کھگے میں ہاتھ ڈال دیا تھا۔ اب یا تو اس کے وجود میں سسکاریاں بھر جانے والی تھی یا اس کے حصے میں شہد آنے والا تھا۔

"تم نے جواب نہیں دیا۔"

"شاید......کیونکہ محبت ایک ایسا کھیل ہے کہ انسان جانتے ہوئے بھی کہ اس کھیل کے سارے ہی حصے خطرے سے خالی نہیں اس کھیل کو کھیلنے سے باز نہیں رہتا......"

"یہ کس ناول کی لائن ہے۔؟" وہ مسکرایا تھا۔

"پتا نہیں......لیکن یہ زندگی کی حقیقت ہے۔"

"ہاں......شاید تم ٹھیک کہہ رہی ہو۔" میرزاد نے اس سے اتفاق کیا تھا۔ "میری سوچ کے مطابق فرق اتنا ہے کہ یہ خطرناک کھیل سے زیادہ شطرنج کی بازی ہے۔ ساری چالیں آپ کو آتی ہیں۔ سارے داؤ پیچ سیکھے ہوئے ہیں اس کے باوجود وقت اور حالات کی وجہ سے چالوں میں ہیر پھیر ہو جاتا ہے۔ خود فتح یا شکست انسان کے لیے نئی ہوتی ہے۔ جیتنے والا سوچ رہا ہوتا ہے کہ وہ ہار بھی سکتا ہے۔ اور ہارنے والا آخری لمحے تک خود کی جیت کے لیے پرامید ہوتا ہے۔"

میرزاد نے اتنے اچھے انداز میں بات کی تھی کہ صندل اسے دیکھتی رہ گئی تھی۔ اس کا فلسفہ اس کی بات سے کہیں زیادہ گہرا تھا۔ ایک اور بات صندل نے نوٹ کی تھی۔ یہ بات کرتے ہوئے یا کرنے کے بعد میر ایک دم سے ہی بجھ گیا تھا۔ جیسے یا تو وہ کچھ ہار رہا ہو، یا ہارنے کے قریب ہو۔

باقی کا کافی سفر خاموشی میں کٹا تھا۔ صندل اس سے باتیں کر رہی تھی اور وہ بس ہوں ہاں میں جواب دے رہا تھا۔ اسے اپنی غلط چال کا دکھ کھائے جا رہا تھا۔ اس نے صحیح چال غلط وقت پر چل لی تھی۔ یا غلط چال صحیح وقت سے پہلے چل لی تھی۔ ایک طرف صندل تھی۔ جو اس کے اعصاب پر سوار ہوتی چلی جا رہی تھی اور دوسری طرف ثانیہ تھی۔ اس کے بہنوئی کی بہن...... جسے زویا بھابھی بنانے کی پوری تیاری کر چکی تھی۔ میرزاد کو سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ صندل اور زویا میں سے کس کا دل دکھائے۔ لیکن پھر ایک رات اچھے سے اپنا احتساب کر لینے کے بعد اسے اندازہ ہوا تھا کہ یہ صندل اور ثانیہ کے دکھ کا کھیل نہیں ہے۔ بلکہ یہ تو خود اس کے اور اس کی بہن زویا کے دکھ کا کھیل ہے۔ اسے اپنے دل کی اور زویا کے دل میں سے کسی ایک کی پروا کرنی تھی۔ اپنی خوشی کے لیے وہ خود غرض ہو سکتا تھا۔ لیکن زویا جو کہ ایک عرصے کے بعد ماں بننے والی تھی وہ اس بات کو دل پر لے کر کسی بھی طرح کی پیچیدگی کا شکار ہو سکتی تھی۔ بس یہ ہی بات اسے خوف میں مبتلا کیے ہوئے تھی۔

"کیا ہم ایبٹ آباد کی حدود میں داخل ہو چکے ہیں۔؟"

"ہاں......"

"کیا ایبٹ آباد کا موسم ہمیشہ سے ہی اتنا حسین ہوتا ہے۔"

"نہیں......جب میں پچھلی بار آیا تھا تو تب ایسا نہیں تھا۔ لگتا ہے کہ کوئی حسن تمہاری آنکھوں میں اُمڈ آیا ہے۔ تمہیں ہر چیز حسین دکھنے لگی ہے۔" اور اسے کیا ضرورت تھی اتنی دلفریب بات کرنے کی......صندل نے اسے دیکھا تو اس کا دل کیا تھا کہ یہ سفر کبھی ختم نہ ہو۔ بس بڑھتا ہی رہے۔ ایبٹ آباد اور بہت دور چلا جائے۔

☆☆☆

دین حویلی کی سرخ چھت پر ٹہلتی افشین کی جان پر بنی ہوئی تھی۔ اس نے خود کو اوپر چھت پر چھپا لیا تھا کیونکہ اسے چاند امی کے آگے نت نئے جھوٹ بولنا پڑ رہے تھے۔ صبح اس نے کہا تھا کہ صندل اس کے لیے بازار سے کچھ چیزیں لینے گئی ہے۔ چاند امی نے اس کے جواب پر حیرت سے اسے دیکھا تھا۔ اتنی صبح صبح افشیں کو ایسی کس چیز کی ضرورت پڑ گئی تھی کہ اسے صندل کو بازار بھیجنا پڑا تھا۔ پھر اتنی صبح صبح تو ابھی بازار کھلتے ہی نہیں۔ اس کے باوجود انہوں نے افشیں کی بات پر یقین کر لیا تھا۔

دوپہر تک اس نے اسی جھوٹ کو چلایا تھا۔ افشیں کی قسمت اچھی تھی۔ دوپہر میں چاند سو گئی تھی۔ جب کہ چاند دوپہر کو سونے کی عادی نہ تھی۔ وہ کام والے ملازموں کو بھیج کر پھر ہی اپنے کمرے میں آرام کرنے جایا کرتی تھی۔ باقی کی کزن بھی دائیں بائیں گے کاموں میں مشغول رہی تھی۔ کسی کو صندل کی بہت دیر سے غیر حاضری پر تعجب نہیں ہوا تھا۔ سہ پہر میں جب چاند سو کر اٹھی تو افشیں نے اس سے کہہ دیا تھا کہ صندل تو ساری دوپہر حویلی میں ہی رہی ہے۔ اور ستار کی مشق کرتی رہی ہے۔ اور بس ابھی ابھی باہر گئی ہے۔ زویا سے ملنے...... چاند کو افشیں کی باتوں پر شک ہوا تھا لیکن اسے یقین کرنا پڑا تھا کیونکہ افشیں کا ماضی بے داغ رہا تھا۔ گھر والوں نے اس کے ہاتھوں فریب نہ کھایا تھا۔ ورنہ اس کی جھول دار باتوں پر تو کوئی پاگل بھی یقین نہ کرتا۔

اب جوں جوں شام گہری ہو رہی تھی افشیں کو فکر ہو رہی تھی۔ صندل کا کہیں اتا پتا نہیں تھا۔ وہ صندل کی غیر حاضری کے متعلق مزید جھوٹ نہیں گھڑ سکی تھی۔ دوسرا اسے صندل کا اس لیے بھی انتظار تھا کہ وہ اس تک عادل کی خبر لائے۔ کہ وہ کہاں ہے اور کب تک واپس آئے گا۔ اور تیسری سب سے اہم بات...... کیا عادل نے اتنے دنوں میں اسے یاد کیا؟ یاد کیا تو کتنا یاد کیا۔؟ عادل نے اسے کبھی خط نہیں لکھے تھے۔ لیکن پھر بھی اسے بے چینی سے عادل کے خطوط کا انتظار تھا۔ وہ یہ بات بھولی ہوئی تھی کہ عادل بے چارہ اپنی بیمار ماں کے ساتھ ہسپتال میں رہ رہا ہے اور ہسپتال میں محبتوں کو کون یاد رکھتا ہے۔

بے قرار تو صبح سے زویا بھی تھی۔ میر صبح سے غائب تھا۔ دن چڑھے وہ اس کے کمرے میں اسے اٹھانے گئی تھی تو اسے تب پتا چلا تھا کہ میر کمرے میں موجود نہیں ہے۔ ملازم کو جاتے وقت اس نے اتنا بتایا تھا کہ وہ ایبٹ آباد کسی ضروری کام سے جا رہا ہے۔ کس ضروری کام سے جا رہا ہے اس نے یہ نہیں بتایا تھا۔ جبکہ وہ تو بازار کھانا وغیرہ بھی لینے جاتا تھا تو زویا کو ضرور بتا کر جایا کرتا تھا۔ چاہے اسے سوئی ہوئی زویا کو نیند سے جگا کر ہی کیوں نہ بتانا پڑے۔

ماضی میں اس کا کبھی شاید ہی ایبٹ آباد جانا ہوا ہو۔ ملازم نے بتایا تھا کہ وہ اکیلا گیا ہے۔ لیکن دل کے اندر کا شک تھا کہ جانے کا نام نہیں لے رہا تھا۔ اس کے ذہن میں ایک آئیڈیا آیا تھا۔ اس نے ملازم کے ہاتھ دین حویلی میں پیغام بھجوایا تھا کہ وہ صندل کو یاد کر رہی ہے۔ کیا صندل اسے آ کر مل سکتی ہے۔ ملازم جو جواب لایا تھا اس نے زویا کو چکرا دیا تھا۔

”وہ کہہ رہے ہیں کہ صندل گھر پر موجود نہیں ہے۔ آئے گی تو اسے پیغام دے دیا جائے گا۔“ یہ دوپہر کی بات تھی۔ اس نے شام کو پھر سے ملازم کو وہاں بھیجا تھا۔ پھر سے وہی جواب دیا گیا تھا۔

میر زاد غائب تھا اور صندل بھی...... یہ اتفاق تھا یا منصوبہ...... سوچتے ہوئے زویا کے ماتھے کی شکنیں گہری ہونے لگی تھیں۔ اسے محسوس ہوا تھا کہ اس کا اپنا بھائی اس کے ساتھ کوئی کھیل کھیل رہا ہے۔ اسے کھیل سے زیادہ اس بات پر غصہ تھا کہ وہ اتنی آسانی سے بے وقوف کیسے بن گئی ہے۔ میر نے اسے سمجھ کیا رکھا ہے۔

”ٹھیک ہے میر...... اب میں تمہیں بتاؤں گی کہ اس کھیل کو میں نے کس وقت آشکار کرنا ہے۔ میں ثانیہ

کے ساتھ زیادتی نہیں ہونے دوں گی۔ چاہے کچھ بھی ہو جائے۔"

اور زویا اپنا احتساب کرتی تو جان جاتی کہ اسے ثانیہ کی رتی برابر پروا نہیں تھی۔ اسے تو بس صندل سے خار تھی۔

☆☆☆

وہ لوگ گیارہ بجے کے قریب ایبٹ آباد پہنچے تھے اور پھر عادل کو ڈھونڈنے میں انہیں دوپہر ہو گئی تھی۔

عادل کے دوست نے ان دونوں کی بہت اچھے سے تواضع کی تھی۔ انہیں کھانا کھلایا تھا۔ اور جب صندل کو یہ پتا چلا تھا کہ وہ ان دونوں کو میاں بیوی سمجھتا رہا تھا تو صندل کی کتنی دیر ہنسی ہی بند نہیں ہوئی تھی۔ یہ ہنسی خفت مٹانے سے زیادہ ایسی تھی جیسے کسی نے اس کی دل کی بات کہہ دی ہو۔ جبکہ میرزاد خاموش رہا تھا۔

کھانے کے بعد عادل کے دوست نے انہیں عادل کے پاس بھیج دیا تھا۔

عادل بے چارہ اپنی بیمار ماں کے سرہانے بیٹھا بے حد پریشان نظر آ رہا تھا۔ ڈاکٹرز نے اس کی ماں کو چند دن کا مہمان قرار دے دیا تھا۔ ایسے میں بے چارے عادل کی آنکھوں میں وقت سے پہلے ہی اپنی ماں کی موت کا دکھ نظر آنے لگا تھا۔

صندل نے اسے افشیں کے لکھے سارے خطوط تھما دیے تھے۔ اور اس کے سارے زبانی پیغامات بھی دے دیے تھے۔

"وہ بہت پریشان ہے۔ تمہیں جلد اس سے ملنا ہوگا۔"

"میں سمجھ سکتا ہوں۔ لیکن میں اس سے زیادہ پریشان ہوں۔ یہاں مجبوری میں رکا ہوا ہوں۔ ڈاکٹر نے کہا ہے کہ کسی بھی وقت امی کے دن پورے ہو سکتے ہیں۔" عادل کی بات پر صندل کو دکھ ہوا تھا۔ وہ افشیں سے زیادہ مجبور تھا۔

"میں تمہاری مجبوری سمجھ سکتی ہوں عادل...... لیکن تم یہ بھی سمجھ لو کہ وہاں افشیں کے دن بھی بس پورے ہونے والے ہیں۔ اگر تم نہ پہنچے تو وہ تو مر ہی جائے گی۔"

"اسے کہو کہ چند دن صبر کر لے۔"

"چند دن کیوں...... تم کل ہی آ جاؤ......"

"امی بیمار ہیں۔ میں کیسے آ سکتا ہوں۔ اگر امی کی طبیعت نہ سنبھلی تو میں کسی دن اپنے دوست کو امی کے پاس بٹھا کر اس سے ملنے چلا آؤں گا۔"

"لگتا ہے کہ تم بات نہیں سمجھ رہے ہو۔ بات افشیں سے ملنے کی نہیں ہے۔ بات یہ ہے کہ اس کی شادی کے لیے گھر پر رشتے آنا شروع ہو گئے ہیں۔ تمہیں جلد اس کے گھر اپنی ماں کو لے کر بھیجنا ہوگا۔"

عادل کو ساری بات اب سمجھ میں آ گئی تھی۔

"افشیں کی مجبوری سمجھنے کی کوشش کرو...... وہ لڑکی ذات ہے۔ اوپر سے تم سے محبت کر بیٹھی ہے۔ محبت زدہ لڑکی سے زیادہ مجبور دنیا میں کوئی نہیں ہو سکتا۔" صندل کی بات نے عادل کو چپ کر دیا تھا۔

"تمہاری مجبوری ایک طرف...... اور افشیں کی بے بسی ایک طرف...... میں بہت مشکل سے تم تک پہنچی ہوں۔ مجھے کوئی ایک بات تو ایسی کرو کہ جس سے افشیں کو تسلی ہو۔"

"میں جلد آنے کی کوشش کروں گا۔"

"مجھے دن بتاؤ عادل......"

"امی کے مرنے کے بعد......" عادل نے سپاٹ چہرے کے ساتھ کہہ دیا تھا۔ صندل خاموش ہو گئی تھی۔ اور

باہر چلی گئی تھی۔ وہ پہلے سے پریشان کو مزید پریشان نہیں کرنا چاہتی تھی۔

''چلو...... جیپ میں بیٹھتے ہوئے میر کے پاس پہنچ کر اس نے کہا تھا۔

'' کتنے خط لکھے تھے انشیں نے......؟'' گاڑی جب سڑک پر آ گئی تھی تو اس نے پوچھا تھا۔

''مجھے نہیں اندازہ...... بہت سے ہوں گے۔''

''کیا تم نے پڑھے......؟''

''ہرگز نہیں...... میں کیوں کسی کے خط پڑھوں گی۔''

''اس طرح شاید تمہیں بھی خط لکھنا آ جاتے......'' اس نے مسکراتے ہوئے کہا تھا۔ صندل خاموش ہو گئی تھی۔ اب وہ اسے کیا بتاتی کہ وہ اسے کہے تو سہی کہ وہ اسے چاہتا ہے۔ خط تو کیا وہ تو اس کی خاطر دیوان بھی لکھ سکتی ہے۔ اور عین جس لمحے صندل یہ بات سوچ رہی تھی۔ میر تک اس کی بات کشف کی صورت ظاہر ہوئی تھی۔

''میں تم سے محبت کا اظہار کیسے کر سکتا ہوں صندل...... میں وہ مسافر ہوں جو دو کشتیوں میں پاؤں رکھ چکا ہے۔ اب کشتیوں کا تو پتا نہیں...... لیکن وہ مسافر ڈگمگا رہا ہے۔''

''میر! یہ ہم کس راستے سے جا رہے ہیں۔ ہم آئے تو کسی اور راستے سے تھے۔'' اس نے میر سے پوچھا تھا۔ میر نے کوئی جواب نہیں دیا تھا۔ وہ خاموشی سے گاڑی چلاتا رہا تھا۔ اور صبح سے لے کر اب تک کے سفر میں پہلی بار صندل کو احساس ہوا تھا کہ وہ ایک مرد کے ساتھ اکیلی باہر ہے۔

''میر! ہم کہاں جا رہے ہیں۔؟''

''جنت میں......''

''وہ ایبٹ آباد میں موجود ہے۔؟''

''جنت تو نظروں میں ہوتی ہے۔ احساس میں ہوتی ہے۔ ساعت میں ہوتی ہے۔''

وہ پہاڑوں پر ڈرائیونگ کرنے لگا تھا۔ آتے وقت وہ پہاڑ دیکھتی آئی تھی لیکن کسی ایسی سڑک پر ان کی جیپ نہیں چلی تھی جو پہاڑ کو کاٹ کر بنائی گئی ہو۔ اب ان کی جیپ پہاڑ کی سڑک پر چڑھ رہی تھی۔ سنسان علاقے میں...... جہاں دائیں بائیں اتنے درخت تھے کہ وہاں آسانی سے گم ہوا جا سکتا تھا۔

''میر...... ہم کہاں جا رہے ہیں۔''

''وہ سچ مچ گھبرا گئی تھی کیا میر اس کا فائدہ اٹھانا چاہتا ہے۔''

''دو منٹ خاموش ہو گی تم......؟''

اس نے رعب سے کہا تھا۔

صندل کے پاس دبک کر بیٹھنے کے بجائے بھلا اور حل ہی کیا تھا۔ دو منٹ تو نہیں...... پورے تین منٹ کے بعد میر زاد کی جیپ رکی تھی۔

''نیچے اترو......''

وہ نیچے اتر آئی تھی۔ اور اپنے دائیں بائیں دیکھنے لگی تھی۔ درختوں سے گھرا ہوا وہ ایک چھوٹا سا قطعہ زمین تھا۔ جس کے تین طرف اونچے پہاڑ تھے اور ایک طرف چمکتا ہوا سورج...... اس قطعہ زمیں پر ایک گھر بھی تھا جو کہ ابھی نامکمل تھا۔

''اس جگہ کو ٹھنڈیانی کہتے ہیں اور یہ میرا گھر ہے۔'' میر نے اسے بتایا تھا۔ صندل نے خوشگوار حیرت سے اسے دیکھا تھا۔

''کیا سچ میں......''

"ہاں......لیکن ابھی اس کے بارے میں کسی کو نہیں بتایا۔ زویا آپی کو بھی نہیں......صرف تمہیں بتا رہا ہوں۔ میں شادی کے بعد اس گھر میں رہنا چاہتا ہوں۔ دنیا سے الگ تھلگ......ایک پرسکون گوشے میں......اسی لیے اس گھر کو میں بہت دل سے تیار کروا رہا ہوں۔ اور سب سے پہلے تمہیں دکھانے لایا ہوں۔"

"تم یہ گھر مجھے دکھانے کیوں لائے ہو میر......"

"کیونکہ میں اس گھر میں تمہارے ساتھ زندگی بتانا چاہتا ہوں۔"

میر نے کہا تھا۔ اور صندل کی سماعت پر یہ جملہ بار بار ٹکرایا تھا۔ وہ پھٹی ہوئی آنکھوں سے میر کو دیکھنے لگی تھی۔ جو بات وہ میر کے منہ سے سننے کے لیے بے تاب تھی وہ جب میر نے کہہ دی تھی تو اسے یقین کیوں نہیں آ رہا تھا۔

"اس گھر میں رہو گی میرے ساتھ......؟" اس کے بے حد قریب ہو وہ پوچھ رہا تھا۔ صندل نے اثبات میں سر ہلا دیا تھا۔

اور جنت تو نظر میں ہے۔ محسوس کرنے میں ہے۔ سماعت میں ہے۔

صندل کو لگا کہ وہ اس وقت جنت کے کسی خوب صورت ترین گوشے میں موجود ہے۔ اور کوئی فرشتہ اس سے میٹھی میٹھی باتیں کر رہا ہے۔

☆☆☆

تہمینہ پھوپھو کو چپ لگ چکی تھی۔ وہ کل سے چپ چپ تھیں۔ چاند نے پوچھا تھا کہ انہیں آنے والا رشتہ کیسا لگا۔ وہ تب بھی چپ رہی تھیں۔ کوئی جواب نہیں دے سکی تھیں۔ ایسے جیسے انہیں سکتہ ہو گیا ہو۔ یا ایسے جیسے ان کا کوئی بہت ہی پیارا فوت ہو گیا ہو۔ پچیس سالوں کے بعد انہیں آج ایسا لگا تھا جیسے وہ آج بیوہ ہوئی ہیں۔ جب ان سے عمر میں کافی کم بستامی نے انہیں گردن سے دبوچ لیا تھا۔ اور صرف دبوچا نہیں تھا۔ بلکہ ان سے حساب کتاب مانگ لیا تھا۔ ان کا دل کیا تھا کہ وہ بستامی کا منہ توڑ دیں۔ لیکن وہ ایسا نہیں کر سکتی تھیں۔ وہ بستامی کے گھر میں رہ رہی تھیں۔ پہلے اس کے باپ کا اور اب اس کا دیا ہوا کھا رہی تھیں۔ پہن رہی تھیں۔ وہ اس کا منہ کیسے توڑ سکتی تھیں۔

آج انہیں لگا تھا کہ وہ تنہا ہو چکی ہیں۔ بہت زیادہ تنہا......شدید تنہا......

انہیں اپنے شوہر کے قتل ہونے کا دکھ اس وقت نہیں ہوا تھا جتنا اب ہو رہا تھا۔ وہ اب روتے ہوئے خدا سے شکوہ کر رہی تھیں کہ وہ کیوں بیوہ ہوئیں۔ خدا نے کیوں ان کے شوہر کو ان سے چھین لیا۔ پھر ان کے ذہن میں مختلف خیالات آنے لگے تھے۔ یہ کہ بیوہ ہونے سے بہتر تھا کہ انہیں طلاق ہو جاتی......ان کی بچیوں کے باپ کا سایہ تو ان کے سر پر ہوتا......بے شک وہ ان کی زندگی میں نہ ہوتا، لیکن ان کی بچیوں کا کوئی مالک تو ہوتا......انہیں ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ ہجرت کے وقت میں جی رہی ہوں اور بلوائیوں نے ان کی بیٹیوں کی عزتوں پر حملہ کر دیا ہو۔

"کیا نواب کا رشتہ آپ کو پسند نہیں آیا پھوپھو......؟" چاند نے پوچھا تھا۔

"ایسی بات نہیں......"

"تو پھر آپ خوش کیوں نہیں ہیں۔؟"

"میں خوش ہوں۔ بہت خوش ہوں۔" تہمینہ پھوپھو نے کہا تھا۔ اور پھر ہنسنے لگی تھیں۔ "بہت خوش ہوں میں......" تہمینہ پھوپھو ایسے ہنسی تھیں کہ چاند تعجب سے انہیں دیکھنے لگی تھی۔ یہ آج تہمینہ پھوپھو کو کیا ہو گیا تھا۔

"تو پھر آگے کیا ارادہ ہے۔ ہم سب نے کب جانا ہے لاہور ان کا گھر بار دیکھنے......"

"اس کی ضرورت نہیں...... بستامی سب دیکھ چکا ہے۔ سب دیکھ چکا ہے۔ اس کی تسلی ہے۔ بس اب جلدی افشیں کو رخصت کر دینا ہے۔" تہمینہ پھوپھو جیسے کہیں نہ دیکھتے ہوئے گویا تھیں۔ "تا کہ کچھ تو حساب کتاب بے باق ہو۔ کچھ تو قرض اُترے۔"

"کون سا قرض......؟ کون سا حساب......؟"

"کچھ نہیں...... تم نہیں سمجھو گی چاند......" تہمینہ پھوپھو کہہ کر اُٹھی تھیں۔ اور اپنا ٹرنک کھولنے لگی تھیں جس میں ان کا کچھ پرانا سامان مدتوں سے محفوظ پڑا تھا۔ چاند انہیں ایسا کرتے ہوئے دیکھتی جا رہی تھی۔

"شادی کب تک کرنے کا ارادہ ہے۔؟"

"بستامی نے کہا ہے کہ اگلے ہفتے نکاح ہے۔"

"اتنی جلدی...... اتنی جلدی میں اتنی بہت سی تیاری کیسے ہو گی۔"

"کیسی تیاری چاند......"

"سارا جہیز بنانا ہے۔ کتنی بہت سی چیزیں لینی ہیں۔"

"جہیز نہیں چاہیے ان لوگوں کو...... بہت امیر ہیں وہ...... بس چند جوڑے دوں گی میں افشیں کو......" وہ ٹرنک کا سامان دائیں بائیں کر رہی تھیں۔

"چند جوڑے کیوں...... لڑکے والے تو ایسے ہی کہتے ہیں پھوپھو...... پھر بارات کا انتظام کرنے کے لیے بھی تو وقت چاہیے۔"

"کیسی بارات...... وہاں سے بس تین چار افراد آئیں گے۔ ان کا کیا انتظام کرنا......" تہمینہ پھوپھو نے بتایا تھا۔ چاند نے کچھ اچنبھے سے انہیں دیکھا تھا۔

"یہ دیکھو...... کیسا ہے یہ جوڑا...... نکاح والے دن کے لیے افشیں کے لیے سلوا لیتی ہوں۔" وہ ٹرنک میں سے ایک پرانا جوڑا نکال کر چاند کو دکھا رہی تھیں۔

"اتنے پرانے جوڑے دینے کی کیا ضرورت ہے۔ ہم افشیں کے لیے سب نیا خریدیں گے۔" چاند نے ٹرنک کے جوڑوں کو دیکھتے ہوئے کہا تھا۔

"نئے جوڑوں کے پیسے کہاں سے آئیں گے چاند......؟" تہمینہ نے گہرا سانس لیا تھا۔ اور حیرت کے مارے چاند کا تو جیسے سانس ہی گم ہو گیا تھا۔

"کیسی باتیں کر رہی ہیں تہمینہ پھوپھو...... کیا آگے آج تک آپ سے کسی نے پیسوں کا مطالبہ کیا ہے۔"

"اب کیا ہے۔" تہمینہ پھوپھو کی آنکھوں میں دُکھ ہی دُکھ اتر آیا تھا۔

"کس نے......؟"

"اور ایسے کیا ہے کہ میں لمحے بھر میں کنگال ہو گئی ہوں۔ مجھے احساس ہو گیا ہے کہ میرے پاس کچھ نہیں...... نہ اپنے لیے اور نہ ہی اپنی بیٹیوں کے لیے...... میں خاک ہوں۔"

"آپ کیا بولتی جا رہی ہیں تہمینہ پھوپھو......"

"چھوڑو...... کیا بیکار باتیں کرنے لگی ہوں میں...... یہ بتاؤ یہ جوڑا کیسا لگے گا افشیں پر......" وہ ایک پرانا سا سوٹ چاند کو دکھانے لگی تھیں۔ اور پرانے سوٹ کو دیکھتے ہوئے چاند کو سمجھ میں نہیں آیا تھا کہ وہ تہمینہ سے کیا کہے۔ وہ تو بس یہ ہی بات سوچ رہی تھی کہ یہ آج تہمینہ پھوپھو کو ہو کیا گیا ہے۔

آنے والے دنوں میں کسی کو کچھ سمجھ میں نہیں آیا تھا کہ حویلی میں یہ سب کیا ہو رہا ہے۔ عجیب سے دن تھے وہ...... رات کے عالم کو اپنے اندر سموئے ہوئے۔

افشیں کو تیز بخار چڑھ گیا تھا۔ جو اُترنے کا نام نہیں لے رہا تھا۔ تہمینہ پھوپھو چپ ہو گئی تھیں۔ ایسے جیسے زندگی بھر انہوں نے ایک لفظ نہ بولا ہو۔ اور بسطامی افشین کی شادی کی تیاریاں ایسے کرنے لگا تھا جیسے اپنی سگی بیٹی کو بیاہنے جا رہا ہو۔

یہ شادی ایسی ہو رہی تھی جیسے کسی کے مرنے کے بعد کفن دفن کا انتظام کیا جاتا ہے۔ کوئی گہما گہمی نہیں تھی۔ کوئی تیاری نہیں ہو رہی تھی۔ باقی سب سمیت چاند کو بھی کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یہ سب کیا ماجرا ہے۔ تہمینہ کیوں چپ ہے۔ افشیں کیوں بیمار ہے۔ انہیں ایسے لگ رہا تھا جیسے کوئی بہت ہی انہونی بات ان سے چھپائی جا رہی ہو۔ افشیں کی شادی میں مرضی نہیں تھی تو اس کی شادی یہاں کیوں کی جا رہی تھی۔ تہمینہ کی مرضی نہیں تھی تو ایسی کیا مجبوری تھی کہ وہ یہاں شادی کر رہی تھیں۔

''میں مرجاؤں گی صندل...... میں بتا رہی ہوں۔ میں مرجاؤں گی۔''

''ایسا کچھ نہیں ہوگا افشیں...... کیوں فکر کرتی ہوں۔ عادل بس آنے والا ہوگا۔''

''اس نے آنے سے کیا ہوگا۔ یہاں میری ماں نے میری شادی کی تاریخ رکھ دی ہے۔''

''مجھے تو تہمینہ پھوپھو پر حیرت ہے۔ وہ جانتی بھی ہیں کہ تمہاری مرضی کہیں اور ہے۔ پھر انہوں نے لاہور والے رشتے کو رضامندی کیوں دے دی۔''

''مجھے نہیں پتا صندل...... کچھ کرو...... میں مرجاؤں گی۔'' افشیں بری طرح سے رونے لگی تھی۔ صندل کا ضبط جواب دے گیا تو وہ غصے سے تہمینہ پھوپھو کے پاس پہنچی تھی۔

''میں جانتی ہوں کہ تم کیا بات کرنے آئی ہو صندل......''

''آپ ایک بار عادل سے مل تو لیں۔ آپ نے اسے بنا دیکھے ہی مسترد کر دیا ہے۔''

''میں نے اسے مسترد نہیں کیا ہے صندل...... مجھ سے یہ حق چھین لیا گیا ہے کہ میں اسے قبول کروں۔''

''کیا مطلب......؟''

''تم نہیں سمجھو گی صندل...... ابھی تم بہت چھوٹی ہو۔ اور میری باتیں بہت بڑی نہ سہی تو گہری ضرور ہیں۔ تم میرا ایک کام کر سکتی ہو۔''

''جی...... کہیے......''

''افشیں سے کہو کہ وہ چپ چاپ اس جگہ پر شادی کروا لے۔''

''لیکن پھوپھو......''

''صندل...... میں نے کہا ناں بہت سی باتوں کو تم نہیں سمجھ سکتی...... عام حالات ہوتے تو میں اپنی بیٹی کی پسند کو ضرور اہمیت دیتی...... وہ جہاں کہتی اس کی شادی وہاں کر دیتی...... لیکن......''

''لیکن اب ایسا کیا ہو چکا ہے پھوپھو...... بیٹی کی خوشی سے بڑھ کر کیا ہو سکتا ہے۔''

''اسے سمجھاؤ کہ اس کا باپ مر چکا ہے۔ وہ ایک یتیم لڑکی ہے۔ اور یتیم لڑکیاں اپنے پالنے والوں کے پاس گروی ہوتی ہیں۔''

صندل ناسمجھی سے انہیں دیکھنے لگی تھی۔

''بس اس سے اتنا کہہ دو کہ اگر وہ اپنی ماں کو زندہ دیکھنا چاہتی ہے تو لاہور والے رشتے کو قبول کر لے۔''

تہمینہ پھوپھو نے کچھ ایسی التجا آمیزی سے کہا تھا کہ صندل کو افشیں سے زیادہ ان پر ترس آ گیا تھا۔ اسے لگا یہ عورت دنیا کی مجبور ترین عورت ہے۔ اور اسے انہیں سمجھانے کے بجائے افشیں کو سمجھانا چاہیے۔

نکاح کا دن نزدیک آ گیا تھا اور حویلی والے اسی آس میں تھے کہ کوئی ان سے کہہ دے کہ یہ نکاح نہیں

ہورہا۔لیکن نکاح ہونے جارہا تھا۔نواب کی پانچ افراد پر مشتمل بارات حویلی تک پہنچی تھی۔اورنواب کو دیکھ کر لڑکیاں بے ہوش ہوتے ہوتے رہ گئی تھیں۔وہ توافشیں کا باپ نہیں دادا لگ رہا تھا۔وہ افشیں سے عمر میں اتنا بڑا تھا کہ اگر طبعی عمر کو مدنظر رکھ کر دیکھا جاتا تو قیاس تھا کہ افشیں اگلے پانچ سالوں میں بیوہ ہونے والی تھی۔

چاند نے شدید ترین حیرت سے تہمینہ پھوپھو کو دیکھا تھا کہ یہ انہوں نے اپنی بیٹی کے لیے کیا منتخب کیا ہے۔تہمینہ پھوپھو نظریں چرا گئی تھیں۔ان کے پاس کسی کے سوال کا کوئی جواب نہیں تھا۔

افشیں خودکشی نہیں کرسکی تھی۔زہر جب اس کے ہاتھ میں تھا اور وہ اسے منہ میں ڈالنے ہی لگی تھی تو اسے تب اندازہ ہوا تھا کہ یہ کام آسان نہیں ہے۔اس کے لیے عورت کو بھی ''مردانگی'' کی ضرورت پڑتی ہے۔مرنا آسان نہیں......موت کو خود سے گلے لگانا بہت ہمت مانگتا ہے اور وہ بہت بے ہمت تھی۔اس لیے وہ رورو کر پاگل ہوتی رہی تھی۔

نکاح والے دن تک اس کی حالت ایسی تھی جیسے جسم سے روح نکل گئی ہو۔رونا دھونا سب ختم ہو چکا تھا۔کیونکہ آنسو ختم ہو چکے تھے۔وہ بنا کسی دھات کے ٹھوس مجسمہ بن چکی تھی۔

شام کے وقت افشیں کی رخصتی کردی گئی تھی اور افشیں حویلی سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے رخصت ہو گئی تھی۔

عین انہی لمحوں میں عادل اپنی مری ہوئی ماں کا سوگ منا کر واپس لوٹا تھا۔بت بنی افشیں کار میں بیٹھ کر رخصت ہو رہی تھی۔عادل ہکا بکا افشیں کو کار میں بیٹھ کر رخصت ہوتے دیکھتا رہا تھا۔اس کی آنکھیں صرف پھٹی نہیں تھی بلکہ ان میں خون بھی اتر آیا تھا۔

اس رات حویلی میں کسی کو نیند نہیں آئی تھی۔سب تعجب سے ایک دوسرے کو دیکھنے کے بعد اب خود سے سوال جواب کررہے تھا۔ان کی حویلی میں پہلی شادی ہوئی تھی اور ایسا لگ رہا تھا جیسے کوئی مر گیا ہو۔خوشی کے بجائے نجانے کیوں سب کا ماتم کرنے کو دل کررہا تھا۔ساری رات اسی سوچ بچار میں گزر گئی تھی کہ یہ ہوا کیا ہے۔

صبح حویلی کے باہر لگے خیمے اور شور کی وجہ سے سب کی آنکھ جلدی کھل گئی تھی۔عجیب سی چیخ وپکار تھی جو ختم ہونے کا نام نہ لے رہی تھی سب بوکھلا کر باہر نکلے تھے۔اور پھر سب کی آنکھیں آگے کا منظر دیکھ کر پھٹی کی پھٹی رہ گئی تھیں۔خاص طور پر تہمینہ پھوپھو کی......

حویلی سے کچھ فاصلے پر پیپل کے درخت تلے جہاں عادل اور افشیں رات میں چھپ چھپ کر ملا کرتے تھے۔وہاں اسی درخت کی شاخ سے عادل کی لاش لٹک رہی تھی۔

☆☆☆

مارٹینی کے تین بلوری جام آپس میں ہلکے سے ٹکرائے تھے۔یہ جام روشن بیگم کو ان کے ایک مداح نے انگلستان سے بھیجے تھے۔بلوری جام اس قدر شفاف تھے کہ اس وقت چھت پر لگے فانوس کی تمام تر روشنی کو اپنے اندر سموئے ہوئے تھے۔تینوں میں سے ایک جام روشن بیگم کے ہاتھ میں تھا،ایک بستامی اور ایک رحبانی کے ہاتھ میں......جس میں شفاف گندمی سیال تھا۔جواب ان کے منہ کے ساتھ لگا ہوا تھا۔ہلکا سا گھونٹ بھرنے کے بعد روشن بیگم نے ایک جاندار قہقہہ لگایا تھا۔یہ قہقہہ زندگی سے اس قدر بھرپور تھا کہ پورے ہال نما کمرے میں کسی اندھی چمگادڑ کی طرح چکر پھیریاں لگانے لگا تھا۔بستامی اور رحبانی کے لبوں پر مسکراہٹ تھی۔

''میں نے کہا تھا ناں بستامی،کہ یہ سودے بازی تمہیں مالا مال کردے گی۔''روشن بیگم نے چہک کر کہا تھا۔

آج وہ چہک سکتی تھیں۔انہوں نے جو کہا تھا ویسا ہی ہوا تھا۔افشیں کا دس لاکھ بستامی کو مل چکا تھا۔ان کی ساری بات حرف بہ حرف سچ ثابت ہوئی تھی۔

''آپ نے بالکل ٹھیک کہا تھا۔''

"تم ایسے ہی پریشان ہو رہے تھے۔ دیکھنا اب تمہیں کبھی بھی معاشی تنگی نہیں ہوگی۔ بس میرے کہے پر چلتے رہو۔"

"اب تو آپ کا ساتھ میں چھوڑ ہی نہیں سکتا۔" بستامی خوش تھا۔ بہت خوش تھا۔

"ابھی تو بس انشیں کا سودا ہوا ہے۔ ابھی تو چھ ہیرے مزید موجود ہیں۔" رحبانی نے بھی ان کی باتوں میں ان کا ساتھ دیا تھا۔

"ہر ہیرے کی قیمت پچھلے سے زیادہ ملے گی۔ یہ میرا وعدہ ہے تم دونوں سے......"

تینوں نے اپنے اپنے جام ختم کیے تھے۔ رحبانی نے بوتل پکڑ کر انہیں پھر سے بھر دیا تھا۔ دوسرے کے بعد تیسرے جام کے بعد سب ہی ڈولنے لگے تھے۔ تینوں کے وجود اور لہجے غیر متوازن ہو چکے تھے۔

"پیسوں کا حصہ کب ہوگا......" روشن بیگم کن انکھیوں سے بستامی کو دیکھتے ہوئے بولی تھیں۔ ان کی آواز میں نشے کی بندش سرایت کر چکی تھی۔ خوشبودار عورت کے وجود سے بدبودار آواز برآمد ہوئی تھی۔

"ابھی کر لیں۔ میں ملازم کو بھیج کر حویلی سے پیسے منگوالیتا ہوں۔"

"نہیں......اتنی بھی جلدی نہیں ہے۔ مجھے تم پر اعتبار ہے بستامی......" روشن بیگم نے مسکرانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا تھا۔ کام ہی ایسا تھا کہ دونوں کو گناہ کے اس سودے میں ایک دوسرے پر اعتبار کرنا پڑ رہا تھا۔

"اب آگے کیا کرنا ہے۔؟" رحبانی نے تینوں کے لیے چوتھا جام بناتے ہوئے پوچھا تھا۔

"میرے خیال سے اگلا نمبر تمہارے گھر کے سب سے نایاب ہیرے کا ٹھیک رہے گا۔"

"کس کی بات کر رہی ہیں آپ......؟"

"صندل کی......؟" روشن بیگم نے آنکھوں کو روشن کرتے ہوئے کہا تھا۔ بستامی کی آنکھیں چمکی تھیں۔ اور رحبانی کا سارا نشہ چھو ہو گیا تھا۔

"صندل ساری لڑکیوں میں سے سب سے زیادہ خوب صورت ہے۔ شعلہ ہے۔ ذرا سی دھوپ سے آگ لگوا سکتی ہے۔ میرے خیال سے اس کے معاملے میں بالکل بھی دیر نہیں کرنی چاہیے۔"

"بالکل......بالکل......" بستامی کے بجائے رحبانی نے فوراً سے تائید کی تھی۔ وہ صندل کو ایک لڑکے ساتھ گھومتے پھرتے دیکھ چکا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ اب حویلی میں کیا آگ لگنے جا رہی ہے۔ ایک طرف چاند تھی اور دوسری طرف بستامی......آگ اور مٹی کا تصادم ہونے جا رہا تھا۔ غالب گمان تھا کہ مٹی آگ پر غالب آجائے گی۔ مزید بھڑکے گی اور یہ آگ چاند کے دل میں لگنے والی تھی۔ اس بات کی رحبانی کو سب سے زیادہ خوشی تھی۔ یہ ایسی آگ تھی جو چاند کو جلا کر خاکستر کر سکتی تھی۔ اس کے دل کو کوئلہ کر سکتی تھی۔ اس کام میں بستامی سے زیادہ رحبانی پرجوش تھا۔ چاند کو آگ میں جلانے سے اسے بے پناہ خوشی ملنے والی تھی۔

"تم گھر جا کر ساری تیاری کرو بستامی......صندل کی رونمائی بہت شاندار ہونی چاہیے۔"

"مطلب......؟"

"ہم صندل کی بولی لگائیں گے۔ جیسے نیلامی کی تقریب کی جاتی ہے۔ سمجھو ویسا ہی......جس نے صندل کی سب سے زیادہ بولی لگائی اسے صندل مل جائے گی۔"

روشن بیگم کی بات پر رحبانی کی آنکھیں روشن ہوئی تھی......سب اس سے بڑھ کر ہونے والا تھا جیسا وہ سوچ رہا تھا۔

"مجھے تو ان سب کاموں کا بالکل علم نہیں......"

"پریشان کیوں ہوتے ہو بستامی......میں ہوں ناں......میں تمہیں سب سمجھا دوں گی۔"

''نہیں...... یہ کام میں اپنے ذمے لیتا ہوں۔'' رحبانی درمیان میں بولا تھا۔ روشن بیگم اور بستانی دونوں نے ہی اسے دیکھا تھا۔

''ٹھیک ہے۔ جیسا تم چاہو...... لیکن سب بہت شاندار ہونا چاہیے۔ صندل کی خوب صورتی کے عین مطابق۔''

''اس چیز کی آپ فکر ہی مت کریں۔'' رحبانی خلاؤں میں دیکھتے ہوئے بولا تھا۔ اس کے لبوں پر بہت ہی زہر خندہ سی مسکراہٹ مچل رہی تھی۔ اور اس گندمی سی مسکراہٹ میں وہ چالاک لومڑ لگ رہا تھا۔

☆☆☆

صندل کو ان دنوں تیز بخار چڑھا ہوا تھا۔ وہ بخار جو پہلے افشیں کو چڑھا کرتا تھا اب افشیں کی رخصتی کے بعد صندل کو چڑھنے لگا تھا۔ شدید سردی کے باوجود دن رات اس کا ماتھا جلتا تھا۔ چاند امی اس کے ماتھے پر ٹھنڈے پانی کی پٹیاں کرتی تھیں۔ لیکن اس کا بخار کم ہونے میں نہیں آرہا تھا۔ چاند کو فکر ہوئی تھی۔

''کیا ہوا ہے تمہیں صندل...... کیا بد پرہیزی کرلی ہے تم نے......''

''موسم کی وجہ سے ایسا ہوا ہے چاند امی......''

''یہ موسم زندگی میں کوئی پہلی بار نہیں آیا ہے۔''

''ٹھیک ہو جاؤں گی۔ آپ فکر مت کریں۔'' وہ بات کو ٹال دیا کرتی تھی۔

افشیں کی جدائی سے زیادہ اسے عادل کی خودکشی نے حساس کردیا تھا۔ پیپل کے پیڑ سے لٹکتی عادل کی لاش کا منظر ایسا تھا جو اس کی آنکھوں سے جاتا ہی نہیں تھا۔ وہ خوف سے زیادہ دُکھ کا شکار ہوئی تھی۔ محبت نے ایک لڑکی کو تباہ کردیا تھا اور لڑکے کی جان لے لی تھی۔ کیا ایسا ہی ہوتا ہے محبت کا انجام......

حویلی میں کسی کو عادل کی خودکشی کی وجہ معلوم نہیں تھی۔ سب کو یہ ہی لگا تھا کہ کسی لڑکے نے محض اتفاق سے ان کی حویلی کے سامنے خودکشی کرلی ہے۔ سارا معاملہ جانتی تھی تو بس صندل اور تہمینہ...... اور دونوں ہی اس موضوع پر بات نہیں کرسکتی تھیں۔ عادل کی بات جب بھی چھیڑی جاتی تہمینہ پھوپھو نظریں چرا جاتی تھیں۔ اور صندل بس انہیں گھور کر رہ جاتی تھی۔

وہ دن بہت بے کیف تھے۔ سردیاں مکمل طور پر آچکی تھیں اور پت جھڑ کی اداسی تھی کہ جانے کا نام نہ لیتی تھی۔ سارے موسم میں مردہ تتلیوں کی باس پھیلی ہوئی تھی۔ وہ تتلیاں جو اپنی بے رحم قید کی وجہ سے مری تھیں۔ یا شاید انہوں نے خود کو ختم کرلیا تھا۔ کون جانے...... اصل حقائق کیا تھے۔ دن کی روشنی میں کتنا اندھیرا قید تھا۔

چاند نے ایک دن اسے زبردستی نہلا کر، اسے نئے کپڑے پہنا کر کمرے سے باہر بھیجا تھا۔ وہ کافی دنوں سے اپنے کمرے میں بند تھی۔ باہر جانے کو اس کا من نہیں تھا اس لیے وہ حویلی کی پچھلی طرف کا چھوٹا دروازہ پھلانگ کر سیب کے باغ میں چلی آئی تھی۔ دور ایک بڑے اور اونچے درخت پر ایک پینگ تھی۔ جو اس نے اور افشیں نے وہاں ڈالی تھی۔ افشیں کو یاد کرتے ہوئے وہ پینگ پر بیٹھ کر جھولنے لگی تھی۔ اس خاموش گوشے میں آنے کا مقصد گھر والوں سے چھپ جانا تھا۔ نجانے کیوں وہ کسی کا سامنا نہیں کرنا چاہتی تھی۔ اس کا ان دنوں میرزاد سے ملنے کا بھی من نہیں تھا۔ وہ یہ ہی جوڑ توڑ کر رہی تھی کہ جب افشیں گھر میں آئے گی تو وہ اسے کیسے بتائے گی کہ عادل مر چکا ہے۔ اس نے خودکشی کرلی ہے۔

بے چاری صندل بھلا یہ کیسے جان سکتی تھی کہ اب وہ بھلا کہاں ساری زندگی افشیں کو دیکھ پائے گی۔

گہرے نیلے آسمان کو دیکھتے ہوئے وہ ایسی ہی سوچوں میں گم تھی جب رحبانی وہاں آیا تھا۔

”صندل......“

”جی رحمانی بابا......“ وہ چونک کر خود کو نارمل دکھانے کی کوشش کرنے لگی تھی۔

”یہاں کیا کر رہی ہو۔؟“

”کچھ نہیں...... پینگ جھول رہی ہوں۔“ اس نے بلاوجہ ہی پینگ کی رفتار بڑھا دی تھی۔

”تم تو ٹھیک سے پینگ بھی نہیں جھول رہی ہو۔ دیکھو ذرا اپنے چہرے کو...... کیسا اُداس نظر آ رہا ہے۔“ رحمانی نے کہا تو صندل نے سب ٹھیک ہے کی اداکاری کرنا بند کر دی تھی۔ وہ مزید اُداس نظر آنے لگی تھی۔

”کیا بات ہے۔ مجھے بتاؤ......“

”مجھے افشیں یاد آ رہی ہے۔“

”کیا تم اس سے ملنا چاہتی ہو۔“

”جی...... کیوں نہیں......“ وہ چہک کر بولی تھی۔

”تو میں تمہیں اس کے پاس لے جاؤں گا۔“

”کیا سچ میں......؟؟؟“

”بالکل سچ...... لیکن اس سے پہلے تمہیں میرا ایک کام کرنا ہوگا۔“

”کیا......؟“

”گھر پر کچھ مہمان آ رہے ہیں۔ تمہیں ان کے سامنے ستار بجانا ہوگا۔“

”بس...... اتنی سی بات......“

”اگر تم اتنا سا کام کر دو گی تو پھر میں تمہیں لاہور لے جاؤں گا۔ افشیں سے ملوانے......“

”میں کر دوں گی۔ لیکن بتائیں کہ گھر پر آ کون رہا ہے۔؟“

”بسامی کے کچھ دوست ہیں۔ ان کی خاص دعوت کرنی ہے۔ اچھا کھانا، اچھا انتظام...... اور پھر انہیں تفریح بھی دینی ہے۔ تو میں نے سوچا کہ اسی بہانے تم سے ستار سن لیا جائے۔ ہم بھی تو دیکھیں کہ تم ستار کو کتنے اچھے سے جاننے لگی ہو۔“

”کیوں نہیں...... میں بجاؤں گی اور بہت دل سے بجاؤں گی۔“ صندل نے مسکراتے ہوئے کہا تھا۔ افشیں سے ملنے کی خوشی تو ایک طرف...... اسے اس بات کی بھی خوشی تھی کہ وہ ایک بڑے مجمعے کے سامنے ستار بجا کر انہیں محظوظ کرنے والی ہے۔

”تو پھر میں تمہیں بہت جلد افشیں سے ملوانے لے جاؤں گا۔“

”ٹھیک ہے۔“ اس نے رضامندی دے دی تھی۔ اور پھر وہاں سے اُٹھ کر اس چھوٹے دروازے کی طرف بڑھی تھی جو حویلی کے اندر کی طرف کھلتا تھا۔

☆☆☆

اس نے گہرے سرخ رنگ کا جوڑا پہنا تھا۔ جس کا گھیرا اتنا وسیع تھا کہ اسے ایسے لگ رہا تھا جیسے اس کی کمر پر کسی نے کپڑے کے بہت سے تھان باندھ دیے ہوں۔ اسی مناسبت سے اس کا بھاری دوپٹا بھی کافی وزنی تھا۔ جسے اس نے دونوں بازوؤں میں ڈالنے کا سوچ رکھا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ دوپٹے کی سیٹنگ اس طرح سے کافی اچھی لگے گی۔

گلے اور کانوں میں اس نے بھاری جیولری پہنی تھی۔ اور ہاتھوں کو خالی ہی رہنے دیا تھا۔ یہ اس کے استاد محترم نے اسے بتایا تھا۔ ستار بجاتے ہوئے ہاتھوں کے کنگن کی کھنکھناہٹ ستار کی آواز میں مل کر اس کا حسن تباہ کرسکتی تھی۔ اس لیے اس نے ہاتھوں میں کچھ نہیں پہنا تھا۔ بالوں کو اس نے کچھ اس طرح ڈھب سے باندھا تھا کہ وہ کھلے ہوئے بھی دکھتے تھے اور بندھے ہوئے بھی۔ ساری تیاری کرتے ہوئے وہ بہت خوش نظر آرہی تھی۔ ایک تو اس وجہ سے کہ وہ آج پہلی بار ایک ہجوم کے سامنے ستار بجانے جارہی تھی اور دوسرا اس وجہ سے کہ آج میرزاد بھی آنے والا تھا۔ تقریب کا بہانہ بنا کر اس نے اسے بھی مدعو کرلیا تھا۔

چاند وہاں آئی تھی۔ اس نے صندل کو دیکھا تھا۔ اور اس کے چہرے پر ناگواری پھیلی تھی۔

"تم اس قدر تیار کیوں ہورہی ہو صندل......؟" اس کا لہجہ سخت تھا۔ جسے صندل نے نظر انداز کردیا تھا۔

"میری زندگی کی پہلی پرفارمنس ہے چاند امی...... میں تیار کیسے نہ ہوں۔"

"ایک تو تم نے مجھ سے پوچھے بنا سب کے سامنے ستار بجانے کی ہامی بھرلی...... مجھے بتانا بھی مناسب نہیں سمجھا۔"

"رحمانی بابا نے اتنے پیار سے کہا تھا۔ میں انکار کیسے کرتی......"

"اس کی بات تم تب مانتیں جب وہ ستار کو خود سننے کی فرمائش کرتا...... سو لوگوں کے درمیان بٹھادیا ہے اس نے تمہیں......"

"آپ کو برا لگ رہا ہے......؟" وہ بناوٹی انداز میں ہمدردی کرتے ہوئے بولی تھی۔

"ہاں...... کیونکہ بستامی کی محفل مجھے کبھی بھی پسند نہیں آئی۔ نجانے کس کس کو بلایا ہے اس نے...... کیسے لوگ ہیں، کون ہیں، کیسے مزاج کے ہیں۔" چاند نے کہا تو اسے ان سب باتوں کی نزاکت کا احساس ہوا تھا۔

"معافی چاہتی ہوں۔ دوبارہ ایسی غلطی نہیں کروں گی۔"

"مجھے نہیں پسند میری بیٹی کسی غلط نیت والے آدمی کے سامنے جا کر بیٹھ جائے۔ وہ بھی سج دھج کر......" چاند کو صندل پر کافی غصہ تھا۔ جو جانے کا نام نہیں لے رہا تھا۔ غصہ تو اسے بستامی پر بھی تھا کہ وہ حویلی میں کیا کچھ کرنے لگا ہے۔ لیکن چونکہ وہ بستامی کے معاملات میں کم کم بولا کرتی تھی اس لیے اس نے بستامی سے کچھ بھی کہنا مناسب نہیں سمجھا تھا۔

"مجھ سے واقعی ہی میں غلطی ہوئی ہے۔"

"دوبارہ ایسی غلطی نہ ہو۔ آج کرلو...... اور پھر کوئی کہے بھی تو صاف منع کردینا۔"

"جی اچھا......"

چاند اپنی کہہ کر وہاں سے چلی گئی تھی۔ وہ چند لمحے تو خاموش رہی تھی، پھر دوبارہ سے تیار ہونے لگی تھی۔

"ٹھیک ہے جو ہونا تھا ہوگیا ہے۔ لیکن اب میں اپنا پہلا شو پوری تیاری سے کرنا چاہتی ہوں۔" رخ سنگار میز کی طرف کرتے ہوئے وہ پھر سے تیار ہونے میں مشغول ہوگئی تھی۔ آج بھانت بھانت کے لوگ آنے والے تھے۔ اسے سب پر اپنا سحر بھی تو طاری کرنا تھا۔ اور سب سے بڑی بات...... آج میر بھی تو آنے والا تھا۔

"کہاں جارہو میر......؟"

آئینے میں خود کو دیکھتے ہوئے وہ خود پر پرفیوم کا اسپرے کررہا تھا جب زویا وہاں آئی تھی۔ اس نے

تیار شیار میر کو دیکھا تھا اور پھر ظاہر ہے کہ اس کا یہ سوال پوچھنا تو بنتا ہی تھا۔

"صندل کے گھر......" وہ صاف گوئی سے گویا ہوا تھا۔

"کیا کرنے......؟"

"آج ان کے گھر کوئی تقریب ہے۔ پارٹی سمجھ لیں...... صندل نے مجھے بھی بلایا ہے۔"

"حیرت ہے۔ صندل نے مجھے نہیں بلایا۔"

"اس معاملے میں مجھ سے ہی غلطی ہوئی۔ میں صندل کو کہہ چکا تھا کہ آپ کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔"

"ہاں...... وقتی خراب تھی۔ اس کا مطلب یہ تو نہیں کہ میں دائمی بیمار ہوں۔"

"آپ نے چلنا ہے تو ساتھ چل سکتی ہیں۔"

"نہیں...... بن بلائے مہمان بن کر جانا مجھے پسند نہیں ہے۔ تم جاؤ......"

"جی......" کہہ کر وہ پھر سے تیار ہونے لگا تھا۔ زویا اسے دیکھ رہی تھی۔ اس کی نظروں میں ناگواری تھی۔ چند لمحے دیکھتے رہنے کے بعد وہ وہاں سے چلی گئی تھی۔ اس کے جانے کے بعد میر نے گہری سانس بھری تھی۔ زویا کی نظروں کے عتاب سے بچنا اس کے لیے مشکل ثابت ہو رہا تھا۔

اپنے کمرے میں پہنچ کر زویا نے فوراً سے زوہیب کو کال کی تھی۔

"زوہیب...... تم فوراً سے حویلیاں آجاؤ...... تانیہ کو اپنے ساتھ لے آنا...... میں چاہتی ہوں کہ اسی جمعے کو تانیہ اور میر کی منگنی کر دی جائے۔"

فون بند ہو جانے کے بعد زویا تسلی سے مسکرائی تھی۔

☆☆☆

ساری حویلی کو بہت اچھے سے سجا دیا گیا تھا۔ پھولوں سے، روشنیوں سے...... حویلی کی چاروں طرف کی دیواروں پر بڑے بڑے قمقموں والی لڑیاں لگا دی گئی تھیں۔ اور جگہ جگہ پھولوں کے گلدان رکھ دیے گئے تھے۔ ساری حویلی ہی جگمگ کرنے لگی تھی۔ بیٹھنے کا سارا انتظام حویلی کے صحن میں کیا گیا تھا۔ سارے فرش پر سرخ قالین بچھوائے گئے تھے۔ جن پر گول ٹیبل لگوائے گئے تھے۔ ان گول ٹیبلوں کے اطراف میں کرسیاں لگوائی گئی تھیں۔ یہ انوکھی طرز کا انوکھا انتظام تھا جو حویلی کی خواتین زندگی میں پہلی بار دیکھ رہی تھیں۔

کھانے کے لیے باہر سے باورچی بلوائے گئے تھے۔ گھر کے باورچیوں پر بھروسا نہیں کیا گیا تھا۔ کھانے کیلیے برتن بھی باہر سے ہی آئے تھے اور وہ اتنے جدید تھے کہ ایسے برتن پہلے سب نے بس ٹی وی ڈراموں میں ہی دیکھے تھے۔

پہلے پہل تو حویلی کے سب ہی مکینوں نے اس پارٹی میں دلچسپی لی تھی۔ لیکن پھر عین پارٹی والے دن سب پیچھے ہو گئے تھے۔ تقریب کچھ عجیب رنگ اختیار کرتی جا رہی تھی۔ پہلے تو سب کو اسی بات پر بہت حیرت ہوئی تھی کہ مرد اور عورتوں کی کرسیوں میں کوئی پردہ نہیں ہے۔ سب نے ایک ساتھ بیٹھنا ہے۔ پھر گول ٹیبل...... جن پر جام سجائے جا رہے تھے۔ یہاں تک بھی بات حدود سے نکلی ہوئی نہ تھی۔ لیکن شام ہونے تک ساری لڑکیوں نے دیکھا کہ گول ٹیبلوں پر تاش بھی رکھی جا رہی تھی۔ شطرنج کی بازیاں سجائی جا رہی تھیں۔ یہ کیسی تقریب تھی۔؟ یہاں تک بھی شاید برداشت کا مظاہرہ کیا جا سکتا تھا۔ لیکن جب وہاں شراب کی بوتلوں کے کارٹن پہنچے تو سب لڑکیوں نے چیخ مار دی تھی۔

"تم میں سے کوئی چاند کو مت بتائے کہ یہ سب کچھ ہو رہا ہے۔ انہوں نے مجھے ہرگز ستار نہیں بجانے دینا۔"

"لیکن صندل...... تم خود ایسی جگہ پر ستار بجانا ہی کیوں چاہتی ہو۔"

"میں یہ سب افشین کے لیے کر رہی ہوں۔"

"افشین کے لیے تم اب کیا کر سکتی ہو۔ اس بے چاری کے ساتھ جو ہونا تھا ہو گیا ہے۔"

"میں اس سے ملنا چاہتی ہوں۔ رحبانی بابا نے کہا ہے کہ وہ مجھے اس کے پاس لے جائیں گے۔ تم سب پلیز، چاند امی کو کچھ مت بتانا۔"

"نہیں بتائیں گے، لیکن ہم سب میں سے کوئی تقریب میں شریک نہیں ہوگا۔"

"تو پھر میر کو کمپنی کون دے گا۔ مجھے تو دور بیٹھ کر ستار بجانا ہے۔"

"اسے آج اکیلا ہی رہنے دو...... ہماری ماؤں نے سختی سے منع کیا ہے کہ آج کوئی کمروں سے باہر نہیں نکلے گا۔"

سب کزن کہہ کر وہاں سے نکل گئی تھیں۔ صندل کو وقتی طور پر شرمندگی ہوئی تھی۔ کہیں رحبانی کے سامنے ستار بجانے کی ہامی بھر کر اس نے غلطی تو نہیں کر لی تھی۔ جو بھی تھا، اب پیچھے نہیں ہٹا جا سکتا تھا، تقریب کا وقت شروع ہونے میں چند ہی منٹ رہتے تھے۔

جوں جوں شام گہری ہونے لگی تھی حویلی میں مہمانوں کی آمد کا سلسلہ شروع ہو گیا تھا۔ سب سے پہلے تو روشن بیگم پہنچی تھیں اور اس کے بعد نجانے کون کون...... پتا نہیں وہ کون لوگ تھے اور کہاں کہاں سے آ رہے تھے لیکن اتنی شان و شوکت سے آ رہے تھے کہ کھڑکیوں سے جھانکتی لڑکیوں کے دل دھک سے رہ گئے تھے۔

حویلی کے باہر شاندار بگھیوں کا ہجوم اکٹھا ہو چکا تھا۔ جیپ، مرسڈیز...... اور کون سی گاڑی تھی جو سجی نہیں تھی۔ ان سب سواریوں میں سے امیر کبیر لوگ نکل رہے تھے۔ دولت کی فراوانی جن کے چہروں پر لکھی ہوئی تھی۔ آہستہ آہستہ حویلی کا صحن بھرنے لگا تھا۔ ان سب کو مشروب پیش کیا جا رہا تھا۔ لوگ خوش گپیوں میں مشغول ہو گئے تھے۔ کچھ مردوں نے سگار لیے تھے۔ مرد تو مرد وہاں تو کچھ عورتیں بھی سگریٹ پینے لگی تھیں۔ کھڑکی سے جھانکتے ہوئے لڑکیاں دم بخود ہو چکی تھیں۔ عورتوں کے پہناوے بہت عجیب وضع کے تھے۔ لیکن جو بھی تھا۔ ان پر جچ رہا تھا۔

میر بھی آ چکا تھا اور وہ ایک کونے میں کچھ حیران و پریشان بیٹھا ہوا تھا۔ کیسا عجیب سا ماحول بنا ہوا تھا آج حویلی کے صحن میں، اسے ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ کوئی امریکن فلم دیکھ رہا ہو۔ تاش، شطرنج، شراب...... صندل لوگ تو کافی خاندانی تھے۔ پھر یہ سب کیا تھا۔ وہ صندل سے اس بارے میں پوچھتا لیکن وہ اسے نظر ہی نہیں آ رہی تھی۔ وہ دل ہی دل میں شکر ادا کر رہا تھا کہ وہ آج زویا کے ساتھ یہاں نہیں آ گیا۔ وہ جسے پہلے ہی لوگ پسند نہیں آتے تھے آج اگر وہ یہاں آ جاتی تو اسے ان لوگوں سے نفرت ہو جاتی تھی۔

تھوڑی دیر کے بعد صندل وہاں آ گئی تھی۔ اس کی پائلوں کی چھن چھن نے سب کو اس کی طرف متوجہ کیا تھا۔ سب اپنی اپنی باتیں چھوڑ کر صندل کو دیکھنے لگے تھے۔ صندل کو یہ سب اچھا لگا تھا۔ پھر وہ وسط میں بڑے قدرے نیچے گول ٹیبل پر بیٹھ کر ستار بجانے لگی تھی۔ پتا نہیں کون سی دھن بجا رہی تھی وہ...... کیا گا رہی تھی۔ لیکن سب ایسے سر دھن رہے تھے جیسے سب بچپن سے ستار کو سنتے چلے آ رہے ہوں اور ستار کے رسیا ہوں۔ تاش اور شطرنج کی بازیاں تھوڑی دیر کے لیے موقوف ہو گئی تھیں۔ اٹھتے ہوئے جام لبوں تک نہ لگ سکے تھے۔ روشن بیگم نے سب سے کہا تو تھا کہ وہ تقریب میں وہ ایک کوہ نور کو بھی بلائے گی۔ لیکن یہ کوہ نور ایسا روشن ہوگا۔ کسی نے کہاں سوچا تھا۔

روشن بیگم، بستامی اور رحبانی...... تینوں مہمانوں کو ہر طرح سے تفریح مہیا کر رہے تھے۔ روشن بیگم تو تقریباً وہاں سب کو ہی جانتی تھیں کیونکہ آدھے سے زیادہ تو اس کے گاہک تھے۔ وہ سب سے چہک چہک کر باتیں کر رہی تھیں اور پوچھ رہی تھیں کہ انہیں صندل کیسی لگی۔ ستار بجاتی صندل کو احساس تک نہ تھا کہ وہ غلیظ نظروں والے مردوں کی درمیان ایک سجاوٹی گڑیا کی طرح بیٹھی ہے۔ مرد اس کے ستار کو سننے سے زیادہ اسے سر سے پیر تک دیکھ رہے ہیں۔ پرکھ رہے ہیں۔ جانچنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ صرف ایک میر تھا جو اسے محبت بھری نگاہوں سے دیکھ رہا تھا۔

''روشن بیگم...... بات سنیے۔'' ایک بارعب آواز روشن بیگم کے کانوں میں اُتری تھی۔ چہکتے ہوئے وہ پلٹی تھیں۔ انہیں پکارنے والا کمال تھا۔ کشمیری قالینوں کا تاجر......

''جی فرمایئے۔''

''یہ لڑکی کون ہے؟''

''صندل نام ہے اس کا...... میری ہی بیٹی سمجھ لیں آپ......''

''مجھے پسند آئی ہے۔'' کمال نے مسکرا کر کہا تھا۔

''پسند تو بہت سوں کو آئی ہے۔ بات تو قدر کی ہے ناں کمال صاحب...... کہ ہیرے کو کون کتنے قیراط کے سونے میں جڑواتا ہے۔''

''کہہ تو آپ ٹھیک رہی ہیں۔''

''ابھی ان صاحب سے بات ہو رہی تھی۔ کہہ رہے تھے کہ ابھی کہ ابھی دس مربعہ زمین نام لگانے کو تیار ہوں لڑکی کے......''

''لیکن آپ سودا طے کرنے سے پہلے مجھے ضرور بتایئے گا۔''

''آپ بات تو کریں۔ آفر پسند آئی تو سمجھے کہ مال آپ کا ہوا۔'' روشن بیگم نے کہا تھا اور پھر بستامی کو اشارے سے وہاں بلا لیا تھا۔ انہیں کمال کی بے تابی سے اندازہ ہوا تھا کہ یہاں سے صندل کی زیادہ رقم ہاتھ آ سکتی ہے۔

''ایک کلو سونا......'' کمال نے چند لمحے سوچنے کے بعد کہا تھا۔ روشن بیگم اور بستامی دونوں نے ایک دوسرے کو دیکھا تھا۔

''ڈیڑھ کلو......'' کمال کو لگا تھا کہ اس نے کم دام لگایا ہے۔

''منظور ہے۔'' بستامی نے رضامندی دے دی تھی۔

''صندل آپ کی ہوئی۔'' روشن بیگم نے مسکراتے ہوئے بات فائنل کی تھی۔ کمال ہوس بھری نظروں سے صندل کو دیکھنے لگا تھا۔ وسط میں بیٹھی صندل کو اندازہ تک نہیں تھا کہ اس کا سودا طے ہو چکا ہے۔

☆☆

(باقی آئندہ ان شاءاللہ)

سرورق کی شخصیت

ماڈل .... رمشا علی

میک اپ .... روز بیوٹی پارلر

فوٹو گرافی .... موسیٰ رضا

مکمل ناول

ستیعہ عمیر

وفا کا دیپ

باران رحمت کو وبال جان بننے میں چند دن لگے تھے۔ ساحل سمندر کے پاس بسا شہر کراچی بارشوں کے باعث بھیگ رہا تھا اور نکاسی آب نہ ہونے کے باعث ڈوب بھی رہا تھا۔ شہر کے کچھ علاقوں میں تو آفت ٹوٹی تھی۔ بجلی، انٹرنیٹ، پبلک ٹرانسپورٹ سب ہی روٹھ چکے تھے۔

رامش اپنا سوٹ کیس گھسیٹ کر شہر کے محفوظ علاقے میں جاتے ہوئے خود کو بہت بدنصیب تصور کر رہا تھا۔ ان سے بھی زیادہ وہ جن کے گھروں میں راشن ختم ہو گیا تھا۔ اس شہر میں اس کا اپنا گھر ہوتا اور پانی سے بھر گیا ہوتا تو بھی وہ اپنے گھر میں رہنے کو فوقیت دیتا اور یہاں نہ آتا۔ مگر وہ مسافر تھا جس کو کمپنی گیسٹ ہاؤس سے نکلنے کا فرمان ملا تھا۔ ہوٹل میں رہنے سے سستا تھا کہ وہاں جاتا جہاں اب وہ بادل ناخواستہ جا رہا تھا۔ یہاں بھی بوندا باندی ہو رہی تھی۔ مگر اس جگہ پانی سڑکوں پر کھڑا نہیں تھا۔ ٹیکسی سے اتر کر اس نے گیٹ کھڑکایا۔ وہ اس گھر میں پہلے بھی آ چکا تھا۔ مگر کسی بھی زاویے نے بچپن کی شناسائی کو ہوا نہیں دی۔

''کون ہے؟'' نارنجی دوپٹے کا چھجا بنائے لڑکی گیٹ کے سوراخوں سے باہر جھانک رہی تھی۔

''میں رامش ہوں۔ بہزاد حسین کا یہی گھر ہے؟ میں فوزیہ آنٹی کا رشتہ دار ہوں۔''

اس کا موبائل اور لیپ ٹاپ بھیگ نہ رہا ہوتا تو وہ یہیں سے پلٹ جاتا۔ لڑکی اندر کو بھاگی تھی۔ اور بہت دیر تک کوئی باہر نہیں آیا تھا۔ اب وہ اس لیے رکا رہا کیونکہ اپنا تعارف کروا چکا تھا۔

''لڑکا کب سے بھیگ رہا ہے۔ تم نے دروازہ تو کھول دینا تھا۔ گوار پن نہیں جائے گا تمہارا۔'' فوزیہ بیگم لان عبور کرتے ہوئے نارنجی دوپٹے والی کو جو جھاڑ رہی تھیں وہ رامش با آسانی سن سکتا تھا۔

''ارے بچے کیسے ہو؟ میں تو نیلوفر سے کہہ کہہ تھک گئی کہ رامش سے کہو ہمارے گھر رہے۔ بچہ بازار کا کھانا کھا رہا ہو گا۔ یہ بھی تو اس کا اپنا ہی گھر ہے۔'' فوزیہ بلا تکان بول رہی تھیں۔ وہ شوہر کی مردانہ چپل پہن کر واضح طور پر نیند سے اٹھ کر آئی تھیں۔ رامش کی توجہ میزبان سے زیادہ نارنجی دوپٹے والی لڑکی پر تھی۔ جو ایک ننگا تولیہ لے کر پیچھے منتظر کھڑی تھی۔

''تمہاری امی کی ماموں زاد بہن ہوں۔ سارا بچپن ہمارا اس ہی گھر میں کھیلتے گزرا ہے۔ ہم میں سگی بہنوں والی محبت ہے۔'' فوزیہ بیگم رامش کے سارے راستے روکے کھڑی تھیں۔ وہ کبھی دایاں ہاتھ بڑھا کر تولیہ پکڑنے کی کوشش کرتا کبھی بائیں طرف سے آگے بڑھنے لگتا۔ مگر میزبان خصوصی محبت سمیت بیچ میں ایستادہ تھیں۔

''ارے بیٹا! اندر آؤ وہاں کہاں بھیگ رہے ہو۔'' فوزیہ بیگم کے شوہر ننگے پاؤں ہی آ گئے تھے۔ اور قالین پر کھڑے آواز دے رہے تھے۔

''بیٹا! یہ تمہارے بہزاد انکل ہیں۔ پچھلی بار جب تم لوگ یہاں رہنے آئے تھے تو ان کی اور تمہارے

بابا کی باتیں ختم ہونے کا نام ہی نہیں لیتی تھیں۔" فوزیہ بیگم شجرہ نصب ملانے میں اب بھی مصروف تھیں۔

رامش نے آگے ہو کر مصافحہ کیا اور تولیہ پکڑ کر سر رگڑنے لگا۔ نارنجی دوپٹے والی لڑکی اندر کو بھاگ گئی تھی اور فوزیہ بھی بولتی ہوئی اندر کی طرف چلی گئی۔

"آؤ بیٹا! بیٹھو۔" بہزاد صاحب آگے ہو کر خود ہی مہمان کا سامان گھسیٹنے لگے۔

"زیتون کدھر رہ گئی ہو جلدی سے اوپر والا کمرا صاف کرو۔ تین ماہ سے کھڑکی نہیں کھلی سیلن ہو گئی ہو گی۔"

کچھ لمحے پہلے وہ شیرینی بکھیر رہی تھیں۔ اب ان کی خاردار آواز گھر کے کسی حصے سے ابھر رہی تھی۔

رامش ان سنا کر کے صوفے پر بیٹھ گیا۔

"میرے گیسٹ ہاؤس میں پانی بھر گیا تھا۔" اس نے معذرت کے انداز میں بہزاد سے کہا۔

"بارش تو رحمت ہوتی ہے، ہماری نا اہلی اس کو زحمت بنا دیتی ہے۔" بہزاد صاحب بھی صوفے پر بیٹھ چکے تھے۔

"ارشد کو بلاؤ۔ سودا لا کر دے۔ مہمان کے لائق کچھ سامان نہیں ہے۔ کھڑے کھڑے کیا دیکھ رہی ہو۔ تمہارے گوٹھ میں مہمان کو شوربے میں تیرتے آلو کھلا دیتے ہوں گے۔ ہم تو مہمان کی وہ خاطر کرتے ہیں جو ساری عمر یاد رہے۔" پیاز کاٹو، چکن نکالو۔ جلدی ہاتھ چلاؤ۔"

فوزیہ بیگم نارنجی دوپٹے والی کو کچن میں ہدایات دے رہی تھیں اور باہر حرف بہ حرف سنتا رامش سوچ رہا تھا کہ سچ میں وہ یہ مہمان داری ساری عمر بھلائے نہیں بھولے گا۔

☆☆☆

شمرین کمرے میں آئی تو پنکھے کی ہوا نے اسے اوپر نیچے دو چھینکیں لینے پر مجبور کر دیا۔ نارنجی دوپٹا سائیڈ پر رکھ کر اس نے بالوں کی چٹیا کھولی تو موتیوں جیسی بوندیں جسم پر برس گئیں۔

"کیا ضرورت تھی اتنی دیر کچن میں لگانے کی۔ پہلے کپڑے بدل لیتیں۔ اب کیا فائدہ ساری ٹھنڈ جسم میں گھس چکی ہو گی۔" شمسہ بانو کو کمرے میں بیٹھے سب حال معلوم تھا۔

"مامی کے میکے سے مہمان آ جائے تو سو بندوں جتنا کام بڑھ جاتا ہے۔" وہ پھرتی سے کپڑے بدل رہی تھی۔

"ان کی لاڈو رانی الماس کدھر ہے۔ اسے کیوں نہیں فرصت ملتی کچن میں جھانکنے کی۔"

شمرین ان کی نواسی تھی اور الماس پوتی۔ وہ دونوں میں ان کی ماں کا روپ دیکھتی تھیں۔ اس لیے نواسی پر واری صدقے جاتی تھیں اور پوتی کے انداز سے خار کھاتی تھیں۔

"وہ فیشل کر رہی ہو گی، آ جائے گی۔" شمرین منٹوں میں کپڑے بدل کر واپس چلی گئی۔

"لو نہ گھر کی فکر نہ گھرداری کی سمجھ۔ فیشن سکھایا ہے، ماں نے یا نخرے۔ ہو گئی شادیاں بس گئے گھر۔" وہ تنہائی میں بڑبڑائے گئی تھیں۔

☆☆☆

"ماما! آپ نے میرے آنے کی اطلاع کر دینی تھی۔" رامش کمرے کی کھڑکی سے منہ نکالے کھڑا تھا۔ کمرے میں درحقیقت سیلن کی بو تھی۔

"کتنی بار تم کہہ کر بھی نہیں گئے اس لیے میں نے فون ہی نہیں کیا۔ ویسے بھی تمہارا اپنا ہی گھر ہے۔ بغیر کسی مروت کے سکون سے ادھر ہی رہتے۔" نیلوفر نے فون پر نہایت دیسی مشورہ دیا۔

یہ گھر جس میں رامش چاروناچار آیا تھا۔ وہ اس کی ماما کے نانا کا ہوا کرتا تھا۔ نانا کی وفات کے بعد بہنوں کو اس گھر کا حصہ نہیں دیا گیا اور ماموں نے اپنی ملکیت بنا لیا۔ بہنوں کے لیے اس گھر کے دروازے ہمیشہ ایسے ہی کھلے رہے جیسے باپ کی زندگی میں ہوتے تھے۔ اس لیے وہ بھائی کے منہ کو چپ ہو گئیں۔ مگر نیلوفر اگلی نسل میں سے تھی۔ ماموں کی وفات کے وقت ان کی دونوں بیٹیاں بیاہ چکی تھیں۔ اولاد نرینہ نہ ہونے کے باعث باپ کی آدھی ملکیت بیٹیوں کی تھی تو باقی آدھی پر باپ کے دوسرے رشتہ داروں کا حق بنتا تھا۔ اس وقت نیلوفر اور اس کی فیملی پیسے پیسے کو ترسی ہوئی تھی۔ بھائی یونیورسٹی میں پڑھ رہا تھا تو ساتھ نوکری کرتا تھا۔ نیلوفر

خود اپنی دوست کی امی کی بوتیک میں چند گھنٹوں کی شفٹ کرتی تھی۔ حق کا تھوڑا سا پیسہ بھی ان کی زندگی میں بہت سکون لا سکتا تھا۔ مگر وہ حق انہیں نہیں ملا اور تمام عمر کی کدورت رہ گئی۔ گھر کا کچھ حصہ فوزیہ کا تھا باقی اس نے اپنی بہن سے خرید لیا۔ تب بھی وہ لوگ خوش اخلاقی سے ملتے رہے تھے۔

دلی کدورت چند سالوں بعد باہر آئی تھی۔ نیلوفر کا بھائی باہر سیٹل ہو گیا۔ بہن کی ایک بہت پڑھے لکھے کھاتے پیتے شخص سے شادی ہوئی۔ خود نیلوفر کا شوہر بھی اتنا محنتی تھا کہ ترقی ان کے قدموں میں آ گری۔ آرمی چھوڑنے کے بعد اس نے جس چیز میں ہاتھ ڈالا وہ سونا بن گئی۔ ان کے مقابلے میں فوزیہ اور اس کی بہن کی زندگی محدود ہی رہی۔ گھر ہمیشہ گھریلو سازشوں کی نظر رہتا۔ فوزیہ کا بڑا بیٹا فہیم زیادہ پڑھا نہیں اور دوسرا بیٹا نعیم دعوتوں میں آنا جانا رشتہ داروں سے نظر ملاتا تھا تو اس کا لائق فائق ہونا شمار نہیں ہوتا تھا۔ شوہر ریٹائر ہو گئے تھے۔ وہ اب بھی خوش گوار زندگی گزار رہے تھے۔ مگر نیلوفر کی فیملی کا کسی طور مقابلہ نہیں کر سکتے تھے۔

رامش نے مسکراتے ہوئے سب یاد کیا۔ اس کی ماڈرن ماما اپنے ننھیال کے ذکر پر ایک دم سے حسابی کتابی خاتون بن جاتی تھیں۔ اس نے تفصیل سے امی کی تمام ہدایات سنیں پھر فون بند کر دیا۔

کتنی ہی یادیں بند توڑ کر باہر آنے کو تھیں۔ اب پچھلا لان اور اس میں لگا جھولا دیکھنے کے بعد اسے اپنا پچھلا قیام بہت اچھی طرح یاد آ چکا تھا۔ بس وہی تھا جو ان یادوں سے نظریں چرا رہا تھا۔

☆☆☆

الماس کچن میں آ چکی تھی اور ہر طرف اس کے حکم چل رہے تھے۔

"چیز کو پاستا کے اوپر کدوکش کرو۔ یہ سیلڈ کے لیے کون سا چمچہ لیا ہے؟" وہ ایئر فرائر میں پہلے سے میرینیٹڈ تکہ بناتے ہوئے ہر طرف چھائی ہوئی تھی۔

"شمسہ بانو دیکھتیں تو حیران رہ جاتیں۔ جس الماس کو وہ پھوہڑ سمجھتی تھیں۔ وہ ہرگز پھوہڑ نہیں تھی۔

کھاتے پیتے ماحول کی ماڈرن لڑکی تھی۔ اسے معلوم تھا کیا کام ملازماؤں کے کرنے والے ہیں اور کیا کام بیگمات کے ہیں۔ پچھلے ڈیڑھ گھنٹے سے پیاز چھیلنے سے گوشت کے قیمے چھوڑنے تک کا کام شہرین نے کیا تھا۔ الماس نے ایپرن پہن کر وہ کام کیے تھے جس سے اس کا بناؤ سنگھار محفوظ رہا تھا۔ مگر میز پر رونق اس کے ہی کاموں سے آئی تھی۔ یہ نئے زمانے کا ٹکڑا یا تھا جو گھنٹوں کچن میں گزارنے کے بجائے جانتا تھا کہ کون سی چیز کدھر سے آرڈر کر کے منگوانی ہے۔ کس چیز کو کن برتنوں میں ڈالنا ہے۔ کون سی چیز کیسے گارنش کی جائے، وہ الماس سے بہتر کوئی نہیں جانتا تھا۔"

"شہرین! یہ ڈونگا ٹیبل پر رکھ آؤ۔" الماس نے حکم صادر کرتے شہرین کو اوپر سے نیچے تک دیکھا اور فوراً ڈونگا پیچھے کر لیا۔

"تم ہماری رشتہ دار ہو، یہ بے تکے کپڑے پہن کر جاؤ گی تو ہمارا کیا امپریشن پڑے گا۔ زیتون تم ٹیبل پر رکھ آؤ۔"

الماس زیتون کو ڈونگا پکڑا کر پھر سے کام میں لگ گئی تھی۔ شہرین دھندلائی آنکھوں کے ساتھ یاد کرنے لگی۔ ڈھائی سال سے وہ یہاں رہ رہی تھی اور ڈھائی سو بار اسے یوں ہی پل بھر میں اجنبی کر دیا جاتا تھا۔

☆☆☆

رامش فریش ہو کر خوش دلی سے نیچے آیا تھا۔

"پڑھائی سے آرکیولوجسٹ ہوں اور پیشے سے ٹھیکیدار۔" رامش نے ہنس کر بتایا تھا۔

"ہماری کمپنی ایسی بلڈنگز لیتی ہے۔ جو ورثے کا حصہ ہوں۔ پھر ان کو ریسٹور کر کے کبھی ریسٹورنٹ تو کبھی گیسٹ ہاؤس بنا دیتے ہیں۔ ابھی کراچی میں ہی دو پراجیکٹ چل رہے ہیں۔" فہیم اور بہزاد کو اس نے بہت دوستانہ انداز میں بتایا۔

آگے سے ویسے ہی دوستانہ تبصرے ہو رہے تھے۔ مگر رامش سب بھول کر ڈائننگ ٹیبل کے پاس منڈلاتی لڑکی کو دیکھ رہا تھا۔ بچپن میں جب وہ اس گھر میں آیا تھا تو بری طرح Bully ہوا تھا۔ وہ چار ن

زندگی کی پہلی یاد تھی جو اس نے دانستہ ذہن میں دفن کرنا چاہی تھی۔ مگر وہ دفن نہیں ہوئی تھی۔ کیونکہ ان بھیانک یادوں میں مخمل کے گرد منڈلاتی اس ہی لڑکی کی اجلی یادیں بھی تھیں۔ وہ معصوم بچی اب ایک اسٹائلش لڑکی میں بدل چکی تھی۔ اپنے تمام سوبر پن کے باوجود رامش کا دل کر رہا تھا کہ اسے کہے یاد ہے بچپن کی وہ ٹی پارٹیز جو ہم تمہارے کھلونوں کے ساتھ کیا کرتے تھے۔

"ابو کھانا لگ گیا ہے۔" الماس نے ڈائننگ کے ارگرد جائزہ لے کر کہا۔

"ہیلو...." رامش نے اٹھ کر الماس کو براہ راست کہا۔

"ہائے، میں الماس ہوں لگتا ہے بارشوں کو آپ سے بہت لگاؤ ہے۔ آپ کی پیچھے یہاں تک آ گئیں۔" الماس نے اعتماد سے اپنے گھنگرالے بال ہلائے۔

"میں تو بہت خشک آدمی ہوں۔ ان حسن موجی بارشوں سے میرا کوئی تعلق نہیں۔" رامش نے مسکرا کر کہا اور مخمل پر جگہ بنالی۔

اس کی ماما اگر کہتی تھیں کہ اسے اپنا ہی گھر سمجھو تو صحیح ہی کہتی تھیں۔ کچھ گھنٹوں میں ہی اسے اپنائیت محسوس ہونے لگی تھی۔

"اچھی نوکری ہے تمہاری۔ سیر و تفریح بھی ہو جاتی ہے۔ میں تو فارمیسی چلاتا ہوں اور دوائیوں کی بھی چھٹی نہیں ہوتی۔" فہیم نے کہا۔

وہ شادی شدہ دو چھوٹی بچیوں کا باپ تھا۔ پڑھائی کی طرح کام میں بھی اس کا دل کم ہی لگتا تھا۔ دکان پر ملازم بٹھا کر وہ اپنی ہی ترنگ میں جیتا تھا۔ اس کے انداز سے تنگ آ کر بیوی بھی روٹھ کر میکے جا بیٹھی تھی۔

"کام کے ساتھ بھی ٹریولنگ کا کوئی مزا ہے۔ انسان کو گیارہ مہینے ڈٹ کر کام کرنا چاہیے اور ایک پورا مہینہ ہالی ڈے کا گزارنا چاہیے۔"

الماس کا شہزادیوں سا ڈھنگ تھا۔

"الماس تو بہت آؤٹ گوئنگ ہے۔ ابھی یہ فرینڈز ترکی ہو کر آئے ہیں۔" فوزیہ نے بیٹی کی تعریف کی۔

"ترکی بہت امیوزنگ تھا۔ واپسی پر ہمیں لاہور کی فلائٹ ملی تھی۔ تب تک سارے پیسے خرچ ہو چکے تھے۔ اکانومی کلاس ٹرین میں ساری رات ہم نے کاکروچ مارے صبح جا کر کراچی پہنچے۔" الماس نے ہنس کر یاد کیا۔

"شہزرین! چاول ری فل کر دو۔" فوزیہ بیگم نے مخمل سے ہی آواز لگائی۔

"میرے یہ دونوں بچے جتنے فرینڈلی ہیں۔ چھوٹا بیٹا اتنا ہی کتابی کیڑا ہے۔ سارا سارا دن لائبریری میں بیٹھ کر پڑھتا ہے۔" بہزاد صاحب نے نوالہ بناتے ہوئے کہا۔

شہزرین چاولوں کی ڈش رکھ کر جانے لگی تو بہزاد نے اس کا ہاتھ پکڑ کر روک لیا۔

"بیٹھو شہزرین، تم بھی کھانا کھاؤ۔"

مخمل پر یکدم سناٹا چھا گیا۔ فوزیہ بیگم اور الماس کی شرمندگی سے بولتی بند ہوئی تھی۔ جبکہ رامش بے وقوفوں کی طرح دیکھے گیا۔ اب تک اس نے اس لڑکی پر غور نہیں کیا تھا اور اگر کرتا بھی تو یہی سمجھتا کہ خوش شکل ملازمہ ہے۔ شہزرین خود وہاں سے بھاگ جانا چاہتی تھی۔ مہمان تو نوالہ بنا کر بھی پہلے کاٹنے میں لگاتا تھا پھر منہ میں ڈالتا تھا۔ کاکروچ کی اسٹوری الماس کے لیے ایڈونچر تھی۔ جبکہ شہزرین کے گھر روز رات کچن میں حشرات کی پارٹی ہوتی تھی۔ پھر بھی ماموں کے کہنے پر وہ کونے والی کرسی پر ٹک گئی۔

"تم نے نیلوفر کو بھی کہنا تھا اپنے شہر چکر لگا لیا کرے۔ بہت عرصہ ہو گیا ملے ہوئے۔"

فوزیہ نے غیر آرام دہ خاموشی کو توڑا اور باتیں پھر سے معمول پر آ گئیں۔ اب رامش کچھ خاموش تھا۔ شہزرین نے گھبرا کر پلیٹ میں تھوڑے چاول نکال لیے تھے۔ اب رائتہ میز کے دوسرے کونے پر تھا۔ اس کی ہمت ہی نہیں ہوئی کہ کسی سے رائتہ مانگ لے۔ اس لیے چکن تکہ ڈال کر روکھے چاول ہی کھانے لگی۔

"ماما کا چکر لگتا رہتا ہے۔ بس مصروف ہوتی

ہیں اس لیے نہیں آپاتیں۔" رامش نے بے خیالی میں فوزیہ اور نیلوفر کی "بے پنہاں" محبت کا پول کھول دیا۔

شہرین تکے کو دیکھ رہی تھی۔ اس نے ہاتھ سے توڑنے کے بجائے چھری سے کاٹنا چاہا۔ جب تکے پر چھری چلی تو گوشت کا ایک ٹکڑا پھدک کر عین میز کے بیچ و بیچ جا گرا۔ الماس نے ماتھا پکڑا اور فوزیہ نے آنکھیں دکھائیں۔ رامش کے لیے ہنسی روکنا مشکل ہو گیا تھا۔ شہرین کو پہلے گوشت میں کانٹا پیوست کر کے چھری چلانی چاہیے تھی۔ بہزاد صاحب نے کانٹے سے ٹکڑا اٹھا کر دوبارہ شہرین کی پلیٹ میں رکھ دیا۔

"اس بار ہم چلتے ہیں اسلام آباد، کیوں رامش آپ اپنا شہر گھمائیں گے؟" الماس نے خود کو دعوت دی۔ سب کے ساتھ کھانے پر دوبارہ چل پڑے۔

"ضرور آپ بس آنے والی بنیں۔" رامش اتنی جلدی بے تکلف نہیں ہوتا تھا۔ لیکن الماس کے انداز میں کچھ ایسا تھا کہ وہ خود کو روک نہیں پایا۔

"اچھا، میں اب تھوڑا سا آرام کروں گا۔" بہزاد صاحب اٹھ گئے۔ پیچھے پیچھے نعیم بھی نکلا اور شہرین نے تو پلیٹ لے کر نکلنے کی کی۔ یہاں وہ نوالہ چبانے سے بھی ڈر رہی تھی۔ کہیں منہ سے آواز نہ آئے اور بعد میں مامی سے باتیں سننے کو ملیں۔ اس کے جاتے ہی فوزیہ بیگم آہستہ والیم میں بولنا شروع ہوئیں۔

"بہزاد صاحب! تو بہت خدا ترس ہیں۔ یہ ان کی بہن کی بیٹی ہے۔" شہرین کا باپ کچھ خاص کماتا نہیں۔ اس لیے بہن کے مرنے کے بعد وہ اسے ادھر لے آئے ہیں۔ خدا نے اتنا نوازا ہے کسی غریب کا بھلا ہی ہو جائے۔" فوزیہ بیگم نے تفصیل سے بتایا۔

"اچھا صحیح۔" رامش نیپکن سے منہ صاف کرتے ہوئے بس اتنا ہی بول سکا تھا۔

"شازی نے بی اے کیا ہے۔ اب پرائیویٹ بی ایڈ کی تیاری کر رہی ہے۔ گھر میں رہتی ہے اس لیے بہت گھریلو ہے۔" الماس نے بھی میز سے اٹھتے ہوئے وضاحت دی۔

"شازی؟" اس نیک نیم پر رامش چونکا تھا۔

"پیار سے اسے شازی کہتے ہیں۔ میری خیر پور والی پھپھو کی بیٹی ہے۔ یہ تو بولی کچھ نہیں اس لیے معلوم نہیں ہو سکا۔ ورنہ فل پٹاخا ہے۔" الماس نے ہنس کر کہا۔

یہ تعارف سن کر رامش سکون کے احساس سے سرشار ہو چکا تھا۔

"مجھے اندازہ ہے۔" رامش سے اپنی مسکراہٹ کنٹرول نہیں ہو رہی تھی۔ اس نے ویسے ہی مسکراتے ہوئے الوداع کہا اور ہلکا پھلکا محسوس کرتے ہوئے اپنے کمرے کی طرف چلا گیا۔ سالوں سے دبی ایک چنگاری پر آج پھوار برسنے لگی تھی۔

☆☆☆

وہ کمرے میں آ کر بیڈ کی پائنتی پر بیٹھا پھر نیم دراز ہو گیا۔ زندگی جیسے پورا چکر کاٹ کر واپس آئی تھی۔ وہ نو سال کا تھا جب ڈیڈ کے کسی کام سے وہ کراچی آئے تھے۔ فوزیہ آنٹی کے دونوں بیٹوں نے قرآن پاک ختم کیا تھا۔ ان کی آمین بڑے شان دار طریقے سے منائی جانی تھی۔ وہ لوگ بھی چار دن فوزیہ آنٹی کے گھر رہے تھے۔ ان کے میکے سسرال سے بھی اچھے لوگ آئے تھے کہ گھر میں شادی کا ماحول تھا۔ شازی کمزور سی سات سال کی بچی تھی۔ خوراک کی کمی کے باعث اس کے بال بدرنگ تھے۔ اس کے کپڑے نمایاں طور پر سب سے اوچھے نظر آتے تھے۔ مگر ایک چیز جس میں اس کو ملکہ حاصل تھا وہ تھا اس کا اعتماد۔ وہ سات سال کی ہو کر ایسی باتیں کرتی تھی کہ اپنے سے دو گنی عمر والوں کو پیچھے لگا رکھا تھا۔ درخت پر چڑھنا، دیوار پھلانگ کر بال لانا...... وہ کون سا کام تھا جو وہ نہیں کر سکتی تھی۔ وہ سب کی پردھان بنی پھرتی تھی۔ کہنے کو رامش نو سال کا تھا۔ مگر وہ ماں باپ کی نازک اکلوتی اولاد تھی۔ اس وقت بھی ماں اس کے منہ میں نوالے ڈالتی تھی۔ تمام عمر

اس نے پیروں میں جوتے بھی خود سے نہیں پہنے تھے۔ وہ اسکول دیر سے داخل ہوا تھا اور ہوا بھی تھا تو اپنے جیسے رکھ رکھاؤ والے بچوں کے ساتھ یہاں شازی جیسے بدتمیز بچوں کو دیکھ کر وہ حقیقت میں گھبرا گیا تھا۔

سب بچے لان کے جھولے کے پاس باتیں کر رہے تھے۔ رامش کا پاؤں زمین پر بیٹھی شازی کی قمیص پر آ گیا۔ شازی اٹھی تو پیچھے سے اس کی ساری قمیض پھٹ گئی۔ اس کی امی آٹے کا تھیلا دھو کر اس کی بنیان بناتی تھیں۔ شازی نے وہی پہنی ہوئی تھی۔ ہر کسی نے اس کی پشت پر جلی حروف سے لکھا ویکی چکی آٹا، پڑھا اور اس کا خوب مذاق اڑایا۔ جس کا سارا غصہ اس نے رامش پر نکالا تھا۔ ماں کے پلو میں چھپ کر رونے کے بجائے وہ کپڑے بدل کر دوبارہ آئی۔ اور کہہ کر کرکٹ کی گیم شروع کی۔ وہ بچی تھی جس کو دوسروں کو نیچا دکھا کر ہی اوپر اٹھنا آتا تھا۔ اپنے ننھیال میں وہ ہمیشہ مس فٹ محسوس کرتی تھی۔ اس لیے کسی دوسرے سے بے عزت ہونے سے پہلے خود اگلے کی بے عزتی کر دیتی تھی۔ اب اس نے رامش کو ٹارگٹ بنا لیا تھا۔ شمرین نے اس کا نام آلو رکھ دیا۔

رامش بیٹ چلا لیتا تھا مگر اس سے بھاگا نہیں جاتا تھا۔ دیکھتے دیکھتے سارے بچے اسے آلو کہنے لگے۔ رامش کچھ بولتا تو شازی وہی لفظ دہرا کر اس کو چڑاتی۔ شازی کی دیکھا دیکھی اسے سب نے اتنا ستایا کہ وہ روتے ہوئے اپنی امی کے ساتھ لگا بیٹھا رہا۔ یہ تو بہت دیر بعد اس نے الماس کو دیکھا وہ پانچ سال کی معصوم بچی تھی جو خاموشی سے اپنے کھلونوں سے کھیلتی رہتی تھی۔ رامش بڑوں کی باتوں سے جب بہت اکتا گیا تو الماس کے پاس چلا گیا۔ دونوں نے سکون سے بیٹھ کر کتنے ہی گیمز کھیلے۔ الماس بھی رامش جیسی نازک مزاج تھی۔ دونوں کی اچھی دوستی ہو گئی۔

آمین کا فنکشن دوپہر کا تھا اور اس ہی رات کو رامش کی واپسی تھی۔ تب تک رامش کو چڑانا سب بچوں کی پسندیدہ گیم بن چکا تھا۔ ان بچوں نے فنکشن کے بیچ میں رامش کی کمر پر لوزر (Loser) لکھ کر چپکا دیا تھا۔ بہت سے لوگوں سے اس ہی حالت میں ملنے کے بعد جب اس کی امی نے کاغذ دیکھا تو رامش سب کے سامنے فنکشن پر ہی رو پڑا۔ لوزر کا کاغذ ایک شرارت تھی اس کے رونے نے اس کو تماشا بنا دیا۔

"تم لوگ ایسے کیوں کر رہے ہو۔ میں نے تمہیں کچھ کہا بھی نہیں ہے۔" اس نے روتے ہوئے شازی اور گینگ سے کہا تھا۔

"لوزر کو لوزر نہیں کہیں گے تو کیا شہزادہ سلامت کہیں گے؟" شازی نے دانت دکھائے اور باقی سب بھی ہنسنے لگے۔

وہ نفسی رامش نے بہت بھلانے کی کوشش کی مگر اسے کبھی نہیں بھولی۔ اس میں پہلے ہی اعتماد کی کمی تھی۔ اس ٹرپ نے اسے خود پر ہر وقت شرمندہ رہنا سکھا دیا تھا۔ جس کے اثرات عرصہ دراز تک اس کا پیچھا کرتے رہے تھے۔ لیکن آج جب اس نے شمرین عرف شازی کو دیکھا تو اس کا دل چاہا کھل اٹھا کر زور زور سے ہنسے۔ یہ گنوار ملازمہ جیسی لڑکی ...... یہ تھی وہ جس سے وہ بچتا رہا تھا۔ جتنی بڑی باتیں کرتی تھی اس کا آدھا بھی [illegible] ہوتا تو آج میز پر بیٹھ کر کھانا کھانے سے اس کی بوا جان نہ جا رہی ہوتی۔

زندگی ریس تھی تو رامش اپنی جیت پر خوش ہو رہا تھا۔ کیونکہ واضح تھا۔ شمرین اس سب میں ہار چکی تھی۔ وہ لیٹے لیٹے ہی کچھ گنگنانے لگا۔

"ارے، میرا سونے کا کڑا کدھر گیا۔ ابھی ادھر میز پر تو رکھا تھا۔"

فوزیہ بیگم کی آواز اتنی ہوتی تھی کہ گھر کے ہر کونے میں پہنچ جاتی تھی۔ اب بھی وہ لاؤنج میں ملازموں کو پکار رہی تھیں۔ رامش نے اٹھ کر کھلی کھڑکی سے باہر جھانکا۔ بیرونی اسٹور کے پیچھے کی تنگ گلی کے آگے ایک پرانا پردہ لگا تھا۔

شہزین دوپٹے میں کچھ چھپائے اس پردے کے پیچھے سب سے نظر بچاتی جا رہی تھی۔

"آج دکھاؤں گا کون لوزر ہے۔" رامش رنگے ہاتھوں پکڑنے کی نیت سے خاموشی سے کمرے سے باہر نکلا تھا۔

☆☆☆

کسی زمانے میں دور سے آئے نامحرموں کو یہ باہر کا کمرا دیا جاتا تھا۔ مگر اب یہ اسٹور بن چکا تھا۔ ہر کوئی تالا کھولنے کی زحمت نہیں کرتا تھا۔ کاٹھ کباڑ دروازے کے سامنے تو کبھی ساتھ والی گلی میں رکھ دیا جاتا۔ اس ہی گلی کو شہزین نے اپنے فرار کی جگہ بنا رکھی تھی۔ دو پرانی کرسیاں صاف کر کے وہ ایک پر بیٹھ گئی اور دوسری پر ٹانگیں رکھ لیں۔ آج جی بھر کر کھانا نہیں کھا سکی تھی۔ اس لیے دوپٹے میں کچھ چھپائے وہ یہاں آئی تھی۔ اس نے احتیاط سے دوپٹا کھولا اندر دو آم تھے۔ وہ گنگناتے ہوئے آم نرم کرنے لگی۔ اس کے اندر کا گنوار پن جو اس گھر کے مکینوں کو بہت کھٹکتا تھا۔ اس گلی میں سرِ شام عروج پر ہوا کرتا تھا۔ اس نے دانتوں میں دبا کر آم کا سرا اتارا اور منہ لگا کر گودا چوسنے لگی۔

اس ہی وقت رامش نے تھانیدار کی طرح پردہ ہٹایا اور چھاپا مارنے کے انداز میں اندر آ دھمکا۔ شہزین نے فوراً پاؤں زمین پر رکھ لیے۔ رامش سونے کا کڑا پکڑنے آیا تھا۔ دوپٹے میں لپٹے آم دیکھ کر فوراً معاملہ سمجھ گیا۔

"کھانا کھانے کی یہ کون سی جگہ ہے؟" رامش نے ارد گرد دیکھا۔ ٹوٹی ہوئی زمین پر جڑی بوٹیاں اگی ہوئی تھیں۔

"کھلی ہوا کی اپنی ہی بات ہوتی ہے۔" شہزین نے رامش سے پیٹھ موڑ کر کلائی پر بہتا رس زبان سے چاٹا۔

"آپ کھائیں گے؟" شہزین کو سمجھ میں نہیں آیا اور کیا بات کرے۔ اس لیے دیوار پر لٹکے ایک صاف ستھرے کپڑے کے تھیلے میں سے چھری نکال کر رامش کو پیش کش کی۔

رامش نے آگے بڑھ کر تھیلے کے اندر کا معائنہ کیا۔ وہاں کڑا نہیں تھا مگر ضرورت کی کئی چیزیں موجود تھیں۔ یعنی وہ باقاعدگی سے اس گلی میں قیام کرتی تھی۔

"فہیم نعیم کی آمین تھی۔ تب یاد ہے آپ اور آپ کے کزنز نے مجھے کتنا ستایا تھا؟" رامش نے تفتیشی انداز میں کہا۔

"اچھا، تم ہو وہ آلو! کیا ننھوں کی طرح رو کر گئے تھے۔ تمہاری پاپا نے فوزیہ مامی کو ہم سب کی اتنی بڑی شکایت لگائی تھی کہ فنکشن کے بعد گھنٹہ بھر ہمیں ڈانٹ پڑتی رہی تھی۔" وہ پٹاخے کی طرح پھٹی تھی۔ ڈائننگ ٹیبل پر وہ رامش سے نہیں بلکہ فوزیہ اور الماس سے ڈری ہوئی تھی۔

رامش نے سر جھٹکا اتنے سال پرانی بات پر کیا عدالت بٹھانی۔ اسے ترس آیا گھر میں مقید رہ کر بھی اس لڑکی کو زعم تھا کہ اس سے عقل مند کوئی نہیں ہے۔

"پورا شہر ڈوب رہا ہے اور تم آم کھا رہی ہو۔" وہ اسے چور ثابت نہیں کر سکا تھا تو چلو بے حس ہی ثابت کر دے۔

"میں آم کھانا چھوڑ دوں گی تو شہر بچ جائے گا؟" شہزین نے قریب لگے نلکے سے ہاتھ دھوتے ہوئے پوچھا۔ اس کے وہم و گمان میں نہیں تھا کہ رامش سالوں پرانی بے عزتی اب تک سنبھالے بیٹھا ہے۔

"الماس بتا رہی تھی اس کی سہیلی لنچ باکس بنا کر متاثرہ علاقوں میں بھجوا رہی ہے۔ کوئی اسکولوں میں بے گھروں کے لیے گدے بستر لگا رہی ہے۔" رامش نے اسے کنویں کا مینڈک ثابت کرنے کی جی توڑ کوشش کی۔

"جس کی جتنی دسترس ہے۔ وہ اتنا ہی کرے گا۔ نہ مجھے گاڑی چلانی آتی ہے نہ اتنا راشن خرید سکتی ہوں۔ البتہ اپنے حصے کا کام تو میں نے کر بھی دیا۔ ایک بے آسرا کو گھر میں بلا کر اور اس کے لیے لنچ پکا

کرے۔" شہزین نے جتاتے ہوئے رامش کو سر سے پاؤں تک دیکھا۔

رامش کو وہ ایسی ہی یاد تھی۔ تیز طرار اور بد زبان۔

"گھر میں کہرام مچا ہے۔ فوزیہ آنٹی کا کڑا چوری ہو گیا ہے۔ جن لوگوں نے سہارا دیا ہو ان کا خیال کرنا چاہیے۔ اس لیے میں اندر جا رہا ہوں۔ تمہیں بھی اندر ہونا چاہیے۔ ویسے بھی اندھیرا ہونے والا ہے۔" رامش نے جتایا۔

"اندھیرے کا انتظام تو ہے۔ میرے پاس۔" شہزین نے کپڑے کے تھیلے سے ایک پلاسٹک کی لالٹین نکالی۔ لالٹین تو نمائشی تھی اصل میں وہ سیل سے جلنے والی لائٹ تھی۔ وہ لالٹین جلا کر اس نے پردے کے پاس والے تاق میں رکھ دی اور دوسرا آم اٹھا کر نرم کرنے لگی۔

رامش نے جل کر سوچا کہ کچھ لوگوں کا کچھ نہیں ہو سکتا۔ وہ ہمیشہ خود غرض ہی رہتے ہیں۔ اندر آ کر اوپر کی سیڑھیاں چڑھتے ہوئے رامش کو سنائی دے گیا تھا کہ فوزیہ آنٹی باتھ روم میں کڑا رکھ کر بھول گئی تھیں اور وہ مل چکا تھا۔ کمرے میں آ کر اس نے کھڑکی بند کی تو باہر گلی میں جلتی لالٹین نظر آئی۔ غیر ارادی طور پر وہ کتنی ہی دیر جلتی لالٹین دیکھتا رہا۔

☆☆☆

فوزیہ بیگم ایک رشتہ دار سے تفصیلی فون پر بات کر کے کمرے میں آئیں تو سر سے پاؤں تک غصے میں تھیں۔

"آپ کی کزن عائشہ کا فون تھا۔ لوگ حال پوچھنے کے لیے نہیں حالات جاننے کے لیے فون کرتے ہیں۔" وہ بیڈ پر شوہر کے سامنے بیٹھ گئیں۔

"وہ منہ پر کہنے کی عادی ہے۔ اس کی باتیں سب کو بری لگ جاتی ہیں۔" بہزاد نے بھی موبائل سائیڈ پر رکھا۔

"باتوں باتوں میں کہہ گئی کہ کب کر رہے ہو نعیم اور شہزین کی منگنی۔ لو ہم نے غریب بچی کو آسرا دیا تو لوگوں کو لگ رہا ہے میں اپنے لائق فائق بیٹے کی شادی اس سے کر دوں گی۔ جسے نہ اوڑھنے کی سمجھ نہ بولنے کی۔"

وہ اتنی غصے میں تھیں کہ شہزین سامنے ہوتی تو اسے پیٹ ڈالتیں۔

"لوگ تو سوچتے ہی ہیں اور ایسی بھی کوئی بری نہیں ہے میری بھانجی۔ خوش شکل ہے۔ ساری گھرداری آتی ہے۔ رونق لگائے رکھتی ہے۔ جبکہ تمہارا بیٹا آنکھ ملا کر کسی سے دو لفظ بول لے تو اس پر گھبراہٹ طاری ہو جاتی ہے۔"

بہزاد نے یہاں لفظ نکالے وہاں فوزیہ کا پارہ چڑھا۔

"دوسروں کو کیا کہنا یہاں تو بھانجی کی محبت میں ماموں کو اپنا خون ناکارہ لگ رہا ہے۔ واہ بھئی۔ کدھر ہے شہزین نکالو اسے اس ہی وقت، میں اب اسے برداشت نہیں کرنے والی۔" فوزیہ بیگم اٹھ کر چپل ڈھونڈنے لگی تھیں۔

"رک جاؤ میری جان، یہ تھوڑی کہہ رہا ہوں کہ اس سے نکاح پڑھوا دو۔ لیکن اتنی گئی گزری نہیں ہے میری علیمہ کی بچی ہے۔" بہزاد اپنے موقف پر قائم تھے۔

"میں نے نیکی کی ہے اور مجھے بس اس کا اجر چاہیے۔ یہ اضافی رشتے بنانے کے بارے میں سوچیں بھی مت۔" فوزیہ بیگم لمبے لمبے سانس لیتے ہوئے بیٹھ گئیں۔

"پھر تم نعیم کی کوئی اپنی پسند کی لڑکی ڈھونڈ دو اور یہ قصہ یہیں ختم کر دو۔" بہزاد صاحب نے موبائل دوبارہ اٹھاتے ہوئے پتے کی بات کی۔

"میں ابھی رشتے والے گروپ میں کوائف بھیجتی ہوں۔ ہوتی رہے گی پی ایچ ڈی۔ یہ کام بھی تو ضروری ہے۔ فہیم کی شادی کو چار سال ہو گئے ہیں۔" فوزیہ بیگم پھر سے ہشاش بشاش ہو گئیں۔

"اپنی بڑی بہو کا بھی کچھ پتا کریں۔ چھلا کرنے گئی تھی۔ اب تو بچی بیٹھنے لگ گئی ہو گی اور

واپسی کی کوئی خبر ہی نہیں ہے۔"

بہزاد صاحب نے اونچی آواز میں کہا۔ مگر فوزیہ اپنی دکھتی رگ سنبھالتے ان سنا کر گئیں۔ بہزاد صاحب بظاہر موبائل پکڑے عطیہ لاڈو کے خیالوں میں کھو گئے۔

☆☆☆

عطیہ تین بھائیوں کی سب سے چھوٹی بہن تھی۔ بہزاد صاحب کی بڑی بہن آسیہ آپا کا ان سے رعب اور تربیت والا رشتہ تھا۔ جبکہ عطیہ تو جیسے بہزاد صاحب نے گود لے رکھی تھی۔ پنگھوڑے میں وہ ان کا کھلونا تھی اور بعد میں ساتھی۔ بہت عرصے بعد اسکول میں جا کر انہیں احساس دلایا گیا کہ عطیہ دوسروں جیسے نہیں ہے۔ بدصورت ہے، ڈراؤنی ہے۔ بہزاد سے اپنی لاڈو کے بارے میں یہ سننا برداشت ہی نہیں ہوا۔ وہ سب پر بگڑ گیا تھا۔ پھر اس کو معلوم ہوا لوگ سچ کہتے ہیں۔ عطیہ کے چہرے پر Port wine stain (سرخ رنگ کا بڑا داغ جو پیدائشی ہوتا ہے) ہے۔ اس کے ماتھے سے بائیں کان تک کی جگہ سوجی ہوئی اور بدشکل تھی۔

عطیہ ماتھے پر بال ڈالے رکھتی تھی اور سوجی ہوئیں آنکھیں موٹی موٹی لگتی تھیں تو خوب صورت لگتی تھی۔ گھر والوں کی محبت میں عطیہ کے لیے کبھی کوئی کمی نہیں آئی۔ مگر جب بات اس کی شادی کی چلی تو پچھلے بیس سالوں میں عطیہ کی جو برائیاں نہیں سنی تھیں۔ دنوں میں سن لیں۔ آخر انہوں نے رشتے دیکھنا چھوڑ دیے۔ مگر مائیں بچیوں کا گھر بسا نہ دیکھ لیں تو تسلی نہیں ہوتی۔ آخر کو ان کی ایک سہیلی نے اپنی خیر پور والی کزن کے بیٹے کا رشتہ بھجوایا۔ لڑکے کا نام رضوان تھا۔ وہ کم پڑھا لکھا تھا۔ گھر بھی سادہ تھا۔ عطیہ کے معیار کا نہیں تھا۔ مگر لڑکے کی ماں نے تو ان کی چوکھٹ پکڑ لی۔ اتنی بار سوالی بن کر آئیں کہ جوتیاں گھس گئیں۔ سب نے سوچا اتنا پیار سے لے کر جا رہے ہیں رانی بنا کر رکھیں گے۔ اپنی تعلیم اور اخلاق سے عطیہ وہاں بھی سب کی لاڈو بن کر رہے

گی۔ مگر ضد کر کے لیے ہوئے رشتوں کی شادی کے فوراً بعد وصولی شروع ہو جاتی ہے۔ عطیہ کو بھی ساس نے جلد ہی باور کروا دیا کہ وہ منت سماجت کر کے رشتہ اس وقت لیا تھا تو اب ساری عمر اس کی بھرپائی دینی ہوگی۔ ساس منہ پھٹ تھیں۔ فارغ بیٹھ کر بہو کے کام میں نقص نکالتی تھیں۔ مگر وہ آہستہ آہستہ سیٹ ہو گئیں۔ ان کے زہر اگلنے میں وقفہ آنے لگا۔ مگر رضوان کی دکان داری والی نوکری تھی اور آمدن محدود عطیہ روز کھڑے ہو کر دکان کے چھ ملازموں کا کھانا الگ بناتی تھی۔

عطیہ شیرنی تھی مجال ہے جو کبھی گھر والوں کا کوئی رونا رویا ہو۔ اپنے ماحول میں خود ایڈجسٹ کیا۔ شمرین سب سے بڑی تھی۔ وہ ماں کی تربیت اور دادی کا خون تھی۔ بنا چلائے ہر بات کا ترکی بہ ترکی جواب دیتی۔ اس سے چھوٹا ایک بھائی احمد تھا۔ جو باپ جیسا تھا۔ گھر میں مسئلے مسائل شروع ہونے لگتے تو باہر قیام کو طویل کر دیتا کہ خود ہی لڑ مر کر کچھ کر ہی لیں گے۔ پھر سب سے چھوٹی حبا تھی وہ بالکل عطیہ کی کاپی تھی۔ کم گو، ڈری سہمی چپ رہ کے سب برداشت کرنے والی۔

منہ سے نہ کہے مگر عطیہ کی زندگی ناہموار ہی تھی۔ اس کے چہرے کے جو حصے دکھتے تھے وہ بھی ماند پڑ گئے۔ ایک مسلسل ٹینشن سوار رہنے کی وجہ سے وہ بیمار رہنے لگی۔ ساس ہمدردی سے بیٹی بنی تھیں۔ وہ اٹھتے بیٹھتے طعنے دینے لگیں۔ رضوان قریبی کلینک پر چیک کرواتا رہا۔ مہینوں بعد اس نے بڑے شہر دکھانے کی حامی بھری۔ وہ گاڑی لے کر آیا تو ساس نے شمرین کو چڑ کر دیکھا۔

"اتنے سال میرے بیٹے نے اس کے نخرے اٹھانے کے علاوہ کچھ نہیں کیا۔ اب کرائے کی گاڑی لایا ہے۔ جاؤ آخری دفعہ مل لو۔ اپنی ماں سے۔" دادی نے نخوت سے کہا۔

وہ قبولیت کی گھڑی تھی۔ شہر جا کر معلوم ہوا کہ عطیہ اپنے اندر کتنے مرض چھپائے بیٹھی تھی۔ آپریشن

کی تیاریاں ہورہی تھیں۔ مگر وہ اس سے پہلے ہی چل بسی۔ خود چل کر گاڑی میں سوار ہوئی تھی۔ جب چار کندھوں پر آئی تو کسی کو یقین ہی نہ آیا۔ یوں عطیہ کی کہانی ختم ہوئی۔

دادی نے شہرین کی پڑھائی چھڑوانے کی بات کی۔ شہرین بھڑنے لگی اور رضوان گونگا بہرا بنا رہا۔ آسیہ خالہ نے احمد کو اپنے پاس کینیڈا بلوالیا۔ شہرین کو بہزاد کراچی لے آیا اور اس کا ایڈمیشن کروا دیا۔ حیا معصوم اس ہی ماحول میں رہ گئی۔ دن میں کالج جاتی اور واپس آ کر گھر کے کام کرتی۔ عطیہ کے بعد رضوان نے ایک تندور والے سے بات کر لی۔ وہ توے کی روٹیاں بناتا تھا۔ اب ہر روز مناسب قیمت پر دکان کے ملازمین کا کھانا وہاں سے آنے لگا۔ جس روز پہلی بار وہاں سے کھانا آیا تو رضوان نوالہ توڑ کر پھوٹ پھوٹ کر رو دیا۔

☆☆☆

فوزیہ بیگم نے جو سوچا تھا وہ کر گزریں۔ جس دن انہوں نے رشتہ گروپ میں کوائف لگائے۔ اس ہی دن ایک لڑکی والوں نے رابطہ کر لیا۔ اگلے دن وہ نعیم کو بھی ساتھ لے کر رشتہ دیکھنے چلی گئیں۔ ان کے پیچھے سے موقع جان کر شہرین نے کچن میں ادھم مچا دیا۔ رامش نے چلتے پھرتے دیکھا کہ وہ کئی برتن چولہے پر رکھ کر کچھ پکا رہی تھی۔ کاؤنٹر بھی بھرا ہوا تھا۔ فریج سے برف نکال کر وہ زور و شور سے کپڑے میں لپیٹ کر ڈنڈے سے کوٹ رہی تھی۔ رامش نے سمجھا کہ میزبانوں کی غیر موجودگی میں ان کا فائدہ اٹھایا جا رہا ہے۔ وہ ٹھنڈی آہ بھر کر دوبارہ اپنے کمرے میں چلا گیا۔

فوزیہ اور الماس کو نازش پسند آئی تھی۔ وہ امیر بھی تھی اور اسٹائلش بھی۔ لڑکی والوں کو بھی نعیم اچھا لگا تھا۔ آج کے زمانے میں کہاں اتنا معصوم اور شرمیلا لڑکا ملتا ہے۔ دو دن بعد لڑکی والے ان کا گھر بار دیکھ گئے۔ ان کو یقین ہو چلا کہ اتنا کم گو لڑکا نازش پر کوئی روک ٹوک نہیں لگائے گا اور نازش کے آگے پیچھے پھرے گا۔ یوں جھٹ پٹ بات پکی ہو گئی۔

فوزیہ نے فوراً منگنی کی تیاری شروع کر دی۔

شہرین نے پرائیوٹ پرچے دینے تھے اور امتحانوں کی تاریخ قریب آ چکی تھی۔ مگر فوزیہ مامی اسے ایک لمحے کی فرصت نہیں دے رہی تھیں۔ صبح سے وہ زیتون کے ساتھ اسٹور ٹھیک کر رہی تھی۔ فوزیہ اور الماس لاؤنج میں صوفے پر جمی بیٹھی تھیں۔ شہرین اسٹور کا سامان انہیں لا لا کر دکھا رہی تھی۔ بار بار چکر لگا کر اس کی کمر رہ گئی تھی۔

الماس حرے سے انسٹا پر نئے کپڑوں کے ٹرینڈ دیکھتے ہوئے ماں سے مشورہ کر رہی تھی۔

"ہم چھ ہی غیر شادی شدہ کزنز رہ گئی ہیں۔ ہم سب اس کپڑے کا گاؤن سلوا لیتی ہیں۔ بہت کلاسی لگے گا۔" الماس نے ایک چمکیلے کپڑے کی تصویریں ماں کو دکھائیں۔ جو کئی رنگوں میں دستیاب تھا۔

"چھ نہیں سات کزنز۔ شہرین کا بھی تو بنوانا ہو گا۔" فوزیہ نے یاد دہانی کروائی۔

"اس پر اتنا خرچ کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ ہماری بھی لک خراب کرے گی۔ اس جھلی کو گاؤن سنبھالنا کہاں آتا ہے۔" الماس نے تصاویر اسکرول کرتے ہوئے کہا۔ پیچھے شہرین اسٹور سے ملنے والے پردے لا رہی تھی۔ اپنے ذکر پر اس کے قدم رک گئے۔

"پورا خاندان جانتا ہے وہ ہمارے گھر رہتی ہے۔ اپنے اجڈ گنوار انداز میں وہ جائے گی تو ہماری ہی بے عزتی ہو گی اور نعیم کے سسرال والے کیا کہیں گے کیسے رشتہ دار ہیں ہمارے، سمجھا کرو۔" فوزیہ نے طریقے سے سمجھایا۔

شہرین کو پچھلی عید یاد آ گئی۔ اس نے مامی کا دیا سوٹ پہنا تھا اور سارا دن مامی اسے ٹوکتی رہی تھیں کہ دوپٹا صحیح اوڑھو۔ یہ کیسے کانٹے پہن لیے سوٹ کی گریس خراب کر دی۔ ایسے نہ بیٹھو۔ ایسے چلو۔ وہ اچھے کپڑے پہن کر بھی قابل قبول نہیں ہو سکتی تھی اس لیے اس نے دوسروں کو رام کرنے کے سارے

جھنجٹ ترک کر دیے تھے۔

"مامی! ان پردوں کا کیا کرنا ہے؟" شہزین نے تھک کر پردے فوزیہ کے سامنے ڈھیر کیے۔

رامش جو اپنا سوٹ کیس گھسیٹتے سیڑھیوں سے نیچے آ رہا تھا۔ اس کو شہزین کا انداز سخت بدتمیز لگا۔

"شازی! یہ دیکھو کتنا اچھا کپڑا ہے۔ سیدھا میکسی اسٹائل گاؤن بھی سل جائے تو بھی ریڈ کارپٹ لک آئے گی۔" الماس نے موبائل اسکرین شہزین کی طرف بڑھائی۔ وہ نہیں جانتی تھی کہ شہزین نے اس کے تبصرے سن لیے ہیں۔ فوزیہ دھونس سے کام لیتی تھی اور الماس میٹھی بن کر اپنا الو سیدھا کرواتی تھی۔

"میں دوپٹا ضرور لیتی ہوں۔ گاؤن کے ساتھ کیسے لوں گی۔ میرا مت بنوانا۔" اس نے رکھائی سے کہا۔

"ایسے کیسے نہیں تم میری بہن جیسی ہو اور ایک دن دوپٹا نہیں لوگی تو کیا فرق پڑے گا۔ میں نے یہ رائل بلیو سلیکٹ کیا ہے تم بھی اپنا کلر دیکھ لو۔" الماس نے موبائل پر تصویریں آگے کیں۔

"میں کہہ رہی ہوں نا میں دوپٹا لوں گی۔" شہزین کو بات رد ہونے پر غصہ آنے لگا تھا۔

"ایک وژیول اپیل ہوتی ہے۔ سب کو ایک جیسا لگنا چاہیے۔" الماس نے موبائل واپس لیا۔

"پھر تم سب بھی دوپٹا کیوں نہیں لے لیتیں؟ ہماری لک میں یکسانیت آجائے گی۔" شہزین نے ہر لفظ چبا کر بولا۔

"حد کرتی ہو ہمارے گھر کی اتنی بڑی خوشی ہے اور صبح سے تمہارا منہ بنا ہے۔" فوزیہ نے لتاڑا۔

سیڑھیاں اترتے رامش کو لگا بالکل صحیح لتاڑا گیا ہے۔ ان لوگوں کا احسان مند ہونے کے بجائے۔ ان کی ہی خوشیاں ماند کرنے پر تلی ہے۔

"میں اتنے پیار سے کپڑے دکھا رہی ہوں اور تم۔" الماس نے خود پر دکھ طاری کیا۔

رامش کا سوٹ کیس آخری سیڑھی سے نیچے اترا تو سب اس طرف متوجہ ہو گئے۔

"ارے بیٹا! کہاں جا رہے ہو۔ اب ادھر ہی رہو تمہارا اپنا گھر ہے۔" فوزیہ سب چھوڑ چھاڑ رامش کی طرف بڑھیں۔ الماس بھی اٹھ کر سیڑھیوں میں آ گئی۔

"دفتر سے کالز آ رہی ہیں۔ اب حالات ٹھیک ہیں۔ کام بھی دوبارہ شروع کرنا ہے۔"

رامش نے کن انکھیوں سے الماس کو دیکھا اور پھر نہ چاہتے ہوئے بھی شہزین کو دیکھا۔ وہ اسے ناپسند کرتا تھا مگر دھیان اس کی ہی طرف جاتا تھا۔

"ہمارے گھر میں فنکشن ہونے والا ہے۔ اس وقت جانا تو بہت غیروں والی حرکت ہے۔" الماس نے بھی کھلے بال جھٹک کر تبصرہ کیا۔

"ایسے الزام مت دیجیے۔ آپ ایک حکم کریں گی میں حاضر ہو جاؤں گا۔ لیکن ابھی میں نہیں گیا تو پھنسا ہوا کام دوبارہ شروع نہیں ہو سکے گا۔" رامش نے کندھا فوزیہ کے آگے کیا جنہوں نے کندھے پر پیار دیتے ہوئے اس کی بلائیں لیں۔

سوٹ کیس گھسیٹ کر باہر جاتے ہوئے اس کا بہت شدت سے دل کیا تھا کہ ایک بار پھر مڑ کر شہزین کو دیکھے مگر اس کو سوچ کر ہی غصہ محسوس ہونے لگا۔ اس لیے وہ بغیر مڑے باہر نکل گیا۔

"تم لوگ خود کوئی ہاتھ پاؤں نہ ہلانا۔ ساری فکریں ماں کے لیے ہی ہیں۔ اچھا بھلا لڑکا تھا۔ کچھ اس کو ٹائم دیتیں دوستی کرتیں۔ اس کی دلچسپی بڑھتی۔" فوزیہ نے الماس کی کمر پر چپت رسید کی۔

"جو سر پر سوار ہوتی ہیں ان سے لڑکے دور بھاگتے ہیں۔ میں ہینڈل کر لوں گی۔ پہلے یہ خود دوڑ دوڑ کر آئے گا پھر اپنے ماں باپ کو بھی بھیجے گا، آپ دیکھنا۔" الماس اتر کر دوبارہ صوفے کی طرف مڑی۔

"تم کیوں بت بنی کھڑی ہو۔ یہ پردے تہ لگا کر سنبھال لو۔ جب تمہاری دادی یا ابا آئیں گے تو ان کے ہاتھ اپنے گھر بھجوا دینا۔" فوزیہ نے اسے برخاست کیا۔ وہ لب بھینچے پردے سمیٹنے لگی۔

☆☆☆

دانیہ کیلا پیس کر اپنی چھوٹی بیٹی منی کو کھلا رہی تھی۔ بڑی بیٹی اقصیٰ صوفے پر اوندھی لیٹی کارٹون دیکھتے ہوئے جیم ٹوسٹ کتر رہی تھی۔

"تمہاری ساس کا آج بھی فون آیا تھا۔ تمہارے دیور کی منگنی ہے۔ تم اشارہ کرو سونے کی پالکی لے کر آئیں گی۔ تمہیں لے کر جانے۔" اس کی امی پاس آ بیٹھیں۔

"مجھے نہیں ان کے بیٹے کو ان کی توجہ کی ضرورت ہے۔ پہلے کہا تھا کہ گریجویٹ ہے۔ کہیں سے گریجویٹ نہیں لگتا۔" اس نے ماتھے پر بل ڈال کر بے زاری ظاہر کی مگر حقیقت تھی کہ شوہر سے دوری اب اس کی برداشت سے باہر ہو چلی تھی۔

"ہم نے کون سا فخری دیوار پر سجانی ہے۔ ملنے نہیں آتا مگر باقاعدگی سے اپنی بچیوں کا خرچا تو بھیج رہا ہے۔ اب غصہ تھوک دو۔" انہوں نے اقصیٰ کے بال سنوارے۔ دانیہ کے ہاتھ رک گئے۔

"ماما! یہ آپ کہہ رہی ہیں؟" "آپ نے ہی تو کہا تھا۔ جب تک آ کر اپنی آوارہ گردی کی معافی نہ مانگے، قسم نہ کھائے واپس نہ جانا۔" دانیہ ورطہ حیرت میں تھی۔

"چھ مہینے پہلے کہا تھا۔ چھ مہینے میں چھ بار خرچا دینے کے علاوہ نہیں آیا۔ معافی مانگنے کہاں آئے گا۔ شوہر کو اتنی دیر اکیلا چھوڑ دو تو باہر مصروفیات ڈھونڈ لیتے ہیں۔" اب تو ان کے بھی ہاتھ پاؤں پھولنے لگے تھے۔

"جنہوں نے باہر مصروفیات ڈھونڈنی ہوں ان کو گھر بیٹھی بیوی سے بھی فرق نہیں پڑتا۔ بیوی گھر بیٹھی راہ تکتی رہ جاتی ہے۔" وہ پھر سے بچی کو کھلانے لگی۔

"میری مانو موقع اچھا ہے۔ انہوں نے بھی خاندان بھر کو جواب دینا ہے۔ تمہاری ساس کو پابند کرتی ہوں۔ فہیم کو کہیں وقت پر گھر واپس آئے۔ تم بھی احسان کر کے جانا۔ مگر اب چلی جاؤ دل میں ہول اٹھنے لگے ہیں۔" اس کی ماما نے صوفے کی پشت سے سر ٹکایا۔

دانیہ منہ پھیر کر آنسو چھپا گئی۔ وہ اپنے ڈولتے دل کا حال سنا دے تو دل دھڑکنا بھول جائیں۔

☆☆☆

بھوری اینٹوں کی تین منزلہ عمارت کا ہر دروازہ نیلا پینٹ کر دیا گیا تھا۔ وکٹورین دور کا یہ مکان جب ان کی کمپنی کو ملا تھا تو ہر دیوار کا رنگ فرق تھا۔ باہری طرف آدھا گھر سستی ٹائیلوں سے ڈھکا ہوا تھا۔ وکٹورین بالکونی کے جنگلے زنگ آلود تھے اور ان پر سے اتنی تاریں گزر رہی تھیں کہ بالکونی نظر آنا ہی بند ہو چکی تھی۔ اس سب کے باوجود جب رامش اور اس کی ٹیم وہاں پہنچی تھی تو ابتدائی سروے کے بعد انہوں نے وثوق سے کہہ دیا تھا کہ عمارت کا ڈھانچہ اب بھی اتنا مضبوط ہے کہ اگلے پانچ سو سال آرام سے گزار سکتا ہے۔

اس مکان کی پرانی تصاویر ڈھونڈی گئیں۔ رامش نے اس زمانے کے فن تعمیر کے حساب سے مرمت کر کے نقشے بنائے۔ عمارت کو اس کی اصلی حالت میں لانے کے لیے خوب جان ماری گئی۔ لیکن جب دیواروں کے رنگ و روغن کی باری آئی تو انہوں نے دل کی مانی اور تاریخ سے ہٹ گئے۔

اب اس مکان میں ایک ریسٹورنٹ کھلتا تھا۔ تاریخ سے محبت اپنی جگہ مگر آج کے لوگوں کے لیے اسے پرکشش بنانا بھی ضروری تھا۔ اس لیے تمام دروازے خوش رنگ گہرے نیلے کر دیے گئے۔ اب یہ مکان دور سے نمایاں ہوتا تھا اور یورپ کی کسی گلی کا منظر دیتا تھا۔

شانزے نے دوسری منزل کی بالکونی کے دونوں نیلے دروازے وا کیے۔ وہ خود بھی اس گھر کی طرح مشرق اور مغرب کا امتزاج لگ رہی تھی۔ سفید کالر والی اونچی شرٹ کے نیچے اس نے کھلا کالا ٹراؤزر پہن رکھا تھا۔ جبکہ پاؤں میں آگے سے بند پیچھے سے کھلی سندھی چپل تھی۔ نکڑ کی دکان سے آئی

سرا ایک کپ میں چائے پیتی وہ فر فر انگریزی میں ہدایات جاری کر رہی تھی۔ اس نے رامش کو مڑ کر دیکھا جو بہت دیر سے اس پر غور و فکر کر رہا تھا۔

"اگر مجھ سے چھٹکارا پانے کا سوچ رہے ہو تو بھول جاؤ۔ جب تک میں ادھر ہوں۔ تم ادھر ہی رہو گے۔" شانزے نے یاد کروایا۔

"تم سے چھٹکارا پانے کی کوشش کرنا میں نے عرصہ ہوا چھوڑ دیا ہے۔" رامش نے ہنوز گھورتے ہوئے کہا۔

"عقل مند ہو۔ ایک میں ہی تو ہوں جو تمہارے منہ پر سچ بولنے کی جرات رکھتی ہوں۔"

شانزے کہہ کر آتش دان کے اوپر روایتی کاریگری والے ماربل کے ڈیکوریشن پیس رکھنے لگی۔ وہ انٹیریئر ڈیکوریٹر تھی جو اکثر رامش کی کمپنی کے ساتھ کام کرتی تھی۔

رامش اسے چار سال سے جانتا تھا اور اس کا دعوا تھا کہ وہ شانزے کو صحیح سے سمجھ نہیں پایا۔ دوسری طرف وہ یہ بھی حلفیہ کہہ سکتا تھا کہ اپنے ہم عمروں میں ایک شانزے ہی ہے جو اسے سب سے بہتر جانتی ہے۔ وہ اس کی فرینڈ کے کزن تھی۔ کچھ دن لگاتار آ کر وہ یونیورسٹی میں مختلف آپشن چیک کرتی رہی تھی۔ مگر اس کا کسی بھی فیلڈ میں دل نہیں لگا تھا۔ اس کے فادر فارن آفس میں تھے اور کوریا میں پاکستان کے ایمبیسڈر رہ چکے تھے۔ شانزے اور اس کی بہن علیزے ان کی دو ہی بیٹیاں تھیں۔ اور دونوں نے پریکٹیکل لائف پہلے دیکھی تھی اور زندگی کی تھیوری بعد میں پڑھی تھی۔ اس کی یونیورسٹی میں رامش سے ہلکی پھلکی ہائے ہیلو ہوئی تھی۔ مگر اس کے بعد شانزے نے رامش کو اوجھل نہیں ہونے دیا تھا۔

وہ ہر ضرورت کے موقع پر اس سے رابطہ کرتی اور پیچھے پڑ جاتی۔ اس کا انداز اتنا والہانہ تھا کہ رامش جیسا اپنے آپ میں رہنے والا انسان بھی اس کے سامنے اپنے ظاہری پردے برقرار نہیں رکھ سکا۔

اس مکان میں رامش کی ذمہ داری ختم ہو چکی تھی۔ لیکن اب وہ شانزے کی ڈیوٹی پر تھا۔ اس کا آرڈر تھا کہ رامش اس کا ہاتھ بٹائے۔ رامش جتنی دیر سے ادھر تھا دونوں جیبوں میں ہاتھ ڈالے صرف مشورے دے رہا تھا۔ کام ختم ہونے کو تھا کہ رامش کو کال آ گئی۔

"ہیلو!" رامش نے راز داری سے فون اٹینڈ کیا تو شانزے کے کان کھڑے ہو گئے۔

"میں نے آپ کو یاد دلانے کے لیے کال کی ہے کہ آپ مہمان نہیں گھر کے فرد ہیں۔ نعیم بھائی کی انگیجمنٹ پر سب لڑکے ایک مخصوص بلیک کرتا پہن رہے ہیں۔" الماس کی چہکتی ہوئی آواز کے پیچھے بہت شور شرابا تھا۔

"جی شیور مجھے بتا دیں، میں بنوا لیتا ہوں۔" رامش سنبھل کر بولا۔

"میرے ہوتے ہوئے آپ کیوں بنوائیں گے۔ آپ بس اتنی زحمت کر لیں کہ بازار آ جائیں۔ میں ادھر ہی ہوں۔ درزی آپ کا ناپ لے لے گا۔" کام کے بہانے میں اگر کوئی مقصد پوشیدہ تھا بھی تو واضح نہیں ہو رہا تھا۔

"او کے۔ لوکیشن بھیج دیں۔ میں آتا ہوں۔" آخری جملہ کہتے ہوئے رامش بالکونی میں نکل گیا تھا۔ تاکہ شانزے نہ سن لے۔ اس نے بات کر کے فون بند کیا اور مڑا تو پیچھے شانزے کمر پہ ہاتھ باندھے کھڑی تھی۔

"کہاں جا رہے ہو؟" شانزے کو اس کی خبر لینے میں بے حد مزا آتا تھا۔

"کوئی خاندانی شادی ہے، کرتے کا ناپ دینے جا رہا ہوں۔ چلو تمہیں راستے میں چھوڑ دوں۔" اس نے سائڈ سے نکلتے ہوئے کہا۔

"میں گیسٹ ہاؤس جا کر کیا کروں گی۔ عرصے سے پاکستانی شادی نہیں دیکھی میں بھی ساتھ چلتی ہوں۔" وہ بیگ کندھے پر ڈال کر تیار ہو گئی۔

"کچھ جگہ تمہارا جانا تمہاری صحت کے لیے برا ہے اور کچھ جگہ تمہارا جانا، میری صحت کے لیے اچھا

نہیں۔" رامش کہتے ہوئے تیزی سے سیڑھیاں اتر رہا تھا۔ "یہ جگہ دوسری قسم کی ہے۔" رامش نے نیچے پہنچ کر اعلان کیا اور اس سے پہلے کہ شانزے آتی۔ گاڑی میں بیٹھ کر چلا گیا۔ شانزے کو اس نے گاڑی سے میسج کر دیا کہ ٹیکسی کروالے۔

شانزے کو اس کے یوں چھوڑ کر جانے پر غصہ نہیں تھا۔ لیکن وہ کس سے ملنے جا رہا ہے۔ یہ سوچ سوچ کر تجسس سے اس کے پیٹ میں تتلیاں ناچنے لگی تھیں۔

☆☆☆

رامش نے ٹاپ دے دیا تھا۔ الماس کے ساتھ اچھا وقت گزرا تھا۔ اس لیے جب الماس نے کافی کا کہا تو وہ رک گیا۔ ان دونوں نے باتیں کرتے ہوئے تسلی سے کافی پی تھی۔ رامش کے لیے یہ صرف ایک خوش گوار شام تھی۔ الماس اسے جیتنے کے ارادے سے آئی تھی اور خود دل ہار بیٹھی تھی۔ رامش کی پرسنالٹی، باتیں ..... ایک کرزما تھا جو اس کے ذہن پر حاوی ہو چکا تھا۔ اس نے گھر آ کر بھی ایسی ہی رپورٹ فوزیہ کو دی۔ فوزیہ کا بس نہیں چل رہا تھا کہ نعیم کی بری کے ساتھ الماس کا جہیز بنانا بھی شروع کر دیں۔ انہوں نے فوراً نیلوفر کو فون کیا اور منگنی پر اصرار دے کر بلانے لگیں۔

☆☆☆

بستر پر لیٹ کر اس نے تکیہ منہ کے اوپر رکھ لیا اور وزن ڈالنے لگا۔ وہ جانتا تھا ایسے اس کا دم نہیں گھٹنے والا۔ مگر وہ اضطراب کی حالت میں اکثر ایسی حرکتیں کر جاتا تھا۔ اس نے منہ سے تکیہ اٹھایا۔ وہ عجیب تھا اپنی منگنی کا سن کر دل میں لڈو پھوٹنے چاہیے تھے کہاں اس کا دم گھٹ رہا تھا۔ اتنے لوگ سب کی نگاہ اس کی سمت ہوگی۔ وہ تو دکان یا بینک میں بھی چلا جاتا تھا تو گھبراہٹ کے مارے پسینے چھوٹ جاتے تھے۔ اسکول یونیورسٹی میں کونے میں بیٹھ کر صرف کتابوں میں دل لگاتا تھا۔ اس لیے پی ایچ ڈی تک پہنچ گیا تھا۔ اب تک اس کی ماں شرمیلا ہے، معصوم ہے کے لیبل میں اس کو چھپاتی آئی تھیں۔ مگر اب لگ رہا تھا کہ وہ برہنہ ہونے والا ہے۔ سب اس کو دیکھیں گے اس میں خامیاں نکالیں گے۔ سب اس کو بے وقوف، کم عقل سمجھیں گے۔ وہ جیسے جیسے سوچ رہا تھا اس کا دل تیزی تیزی دھڑک رہا تھا۔ اسے الٹی آنے کے قریب تھی۔

"حیا! میری گڑیا کیسی ہو؟" باہر ثمرین فون پر بات کر رہی تھیں۔

نعیم نے اپنی ساری توجہ اس سمت کر لی اپنی سوچوں سے فرار حاصل کرنا لازمی ہوتا جا رہا تھا۔

"تم ابو کو منا لو۔ منگنی پر آ جاؤ تمہیں دیکھنے کا بہت دل کر رہا ہے۔" ثمرین نے فریاد کی۔

"ابو کو کہا تھا میں نے مگر وہ کب دکان اکیلا چھوڑتے ہیں۔" حیا نے سوچا سمجھا جواب دیا مگر پیچھے بیٹھے ہوئے دادی چلانے لگیں۔

"اس سے پوچھ یہ کیسا دعوت نامہ بھیجا ہے۔ اس کے ماموں نے۔ مجھ بزرگ کو بلایا تک نہیں۔ میں دیکھتی ہوں، میں نہیں جا رہی تو کون جائے گا۔"

دادی پل پل کی نفرت سنبھال کر رکھتی تھیں اور موقع ملتے ہی نچھاور کرنے سے نہیں چوکتی تھیں۔ حیا نے ماؤتھ پیس پر ہاتھ رکھا تھا۔

"میرے امتحان سر پر ہیں۔ کچھ پیسے جو جمع ہیں۔ اس کے لیے سنبھال رکھے ہیں اب ہر بار ماموں سے مانگنا اچھا نہیں لگتا۔ ورنہ میں آ جاتی۔"

"تمہارے پاس تو ہوں گے۔ کسی کو بغیر بتائے بس پکڑ لو ایک بار تم یہاں آ گئیں تو ممانی خود ہی واپسی کا ٹکٹ کٹوا کر واپس بھجوا دیں گی۔" ثمرین نے ہنس کر ظاہر کیا کہ اس نے دادی کی کوئی بات سنی ہی نہیں۔

"بھائی نے بھی تصویریں بھیجی تھیں مگر کمپیوٹر ہی خراب ہے۔" حیا نے موضوع بدلا۔

"اس کے ماموں مامی ہماری بچی لے کر گئے ہیں۔ خدمتیں کرواتے ہیں۔ فوزیہ سے اتنا نہیں ہوتا دعا سلام کا فون کر لے۔ پچھلی بار ہم گئے تھے تو بن ٹھن کر خود سہیلی کے گھر نکل گئی تھی۔ ملازم نے سوکھی

چائے سامنے رکھی۔" دادی پھر پھنکاریں۔

"تم پڑھائی پر دھیان دو کچھ ہی تو دن رہ گئے ہیں۔ پھر نوکری ڈھونڈ کر مجھے بلا لینا یا خود واپس آ جانا۔" حبا نے الوداع کہنا چاہا۔

"ویسے دادی کہتی تو ٹھیک ہیں فوزیہ ممانی ہمارے معاملوں میں غریب ہو جاتی ہیں۔" شہرین نے کہا پیچھے کہیں دور کچھ گھسیٹے جانے کی آواز آ رہی تھی۔ مگر فوزیہ اور الماس دونوں گھر میں نہیں تھیں۔ اس لیے وہ بنا پروا کیے بولے گئی۔

"الماس کو تو سونے سے لاد دو پھر بھی کہے گی کچھ کمی ہے۔ کمی کپڑوں میں نہیں اس کے چہرے پر ہے۔ ایسی تیکھی بھنویں بنواتی ہے کہ سلیپنگ بیوٹی والی مکار جادوگرنی لگتی ہے۔ فوزیہ آنٹی کا قد بھی چھوٹا اوپر سے موٹاپا بھی ان کو کہا تھا کہ یہ اسٹائل آپ پر سوٹ نہیں کر رہا۔ مگر وہ نیا جوڑا پہن کر پینگوئن کی طرح چلتی شیشے کے سامنے خوشی سے منڈلاتی رہیں۔"

شہرین عام طور پر ان کی برائی نہیں کرتی تھی۔ مگر آج کل پڑھائی کا وقت نہ ملنے پر وہ سخت نالاں تھی اس لیے کہہ بیٹھی۔

گھسیٹے جانے کی آواز اب قریب آ چکی تھی۔ شہرین نے مڑ کر دیکھا۔ رامش اپنا بیگ گھسیٹتے ہوئے اب قریب آ چکا تھا۔

"حبا! میں تمہیں بعد میں فون کرتی ہوں۔" چوری پکڑے جانے کے انداز میں شہرین نے فون بند کیا۔

رامش کو ایک احسان فراموش لڑکی نظر آ رہی تھی جو گھر والوں کی غیر موجودگی میں فون پر گپیں ہانک کر ان کی ہی برائیاں کرتی تھی۔

"مامی بازار گئی ہیں۔" شہرین نے اطلاع دی۔

"کمرا کھلا ہے؟" رامش نے مختصر پوچھا۔

"ہاں جی۔" شہرین نے سوٹ کیس پکڑنے کے لیے ہاتھ بڑھایا۔

"کوئی ضرورت نہیں۔" رامش نے غصیلے انداز میں کہا اور اوپر چلا گیا۔

☆☆☆

"تمہیں الماس کیسی لگی؟" نیلوفر نے دو روز پہلے ہی رامش سے پوچھا تھا۔

"ٹھیک ہے۔ اچھی ہے۔ مگر آپ کی بہو کی نظر سے میں نے اس کو نہیں دیکھا۔" رامش نے سعادت مندی سے جواب دیا۔

"کیوں نہیں دیکھا۔ پڑھی لکھی ماڈرن لڑکی ہے۔ تمہیں دیکھنا چاہیے تھا۔" نیلوفر نے کہا تو رامش سٹپٹا گیا۔

"آپ بھول رہی ہیں آپ فوزیہ آنٹی اور ان کے خاندان کو کس قدر ناپسند کرتی ہیں۔" رامش نے یاد کروایا۔

"وہ جائیداد کے معاملے الگ ہیں۔ ماں باپ نے ہی ان کو انصاف نہیں سکھایا تو ان کا کیا قصور مجھے بہت اصرار کر کے فوزیہ بلا رہی ہے۔ مگر میں آ گئی تو یہ خوش فہمی کا شکار ہو جائیں گے۔ جو میں نہیں چاہتی۔ اس لیے پہلے تم دیکھ لو سمجھ لو۔ ہمارے لیے مناسب بھی ہے۔" نیلوفر اپنا ذہن بنا چکی تھیں۔

"مجھے آپ کو ڈر ہے کہ آپ کے سرکل کی امیر کبیر لڑکی آ گئی تو وہ آپ کو اور گھر کو ٹائم نہیں دے گی۔" رامش نے پتے کی بات کہی۔

"جو بھی ہو اپنا خاندان بہتر ہی ہوتا ہے۔ الماس اس انگریزی ملنگ سے بہتر ہی ہوگی۔ جو تمہارے آس پاس منڈلاتی رہتی ہے۔" نیلوفر نے وہ کہہ ہی دیا جس کا انہیں ڈر تھا۔

"ماما! شانزے میری دوست ہے۔ وہ کسی سیلبرٹی سے شادی کرے گی۔ میرے جیسا سادہ انسان اس کے معیار پر نہیں اترتا۔" اس نے ماں کو ہزارویں بار بتایا۔

"اگر اسے کوئی سیلبرٹی نہ ملا تو اس نے تمہیں ایک اشارہ کرنا ہے اور تم اسے انکار نہیں کر پاؤ گے۔ یہ بھی میں اچھی طرح جانتی ہوں۔"

رامش خاموش رہا وہ جانتا تھا کہ ماں سچ کہہ رہی ہیں۔ وہ شانزے سے شادی نہیں کرنا چاہتا تھا۔

مگر شانزے اپنی بات منوا ہی لیتی تھی۔ ایک دفعہ نیلوفر دو ماہ کے لیے کینیڈا جا رہی تھیں۔ انہوں نے سارا دن ایک ساتھ گزارنا تھا پھر رامش نے اسے ڈراپ کرنا تھا۔ مگر شانزے کی کال آ گئی، انہیں شاپنگ میں مدد چاہیے تھی۔ رامش گھنٹے کا کہہ کر گھر سے نکلا تھا۔ شانزے ایک دو دکانوں کے بعد اسے کھڑے پیر لاہور جانے والی موٹروے پر لے کر نکل گئی۔ اور وہ منع بھی نہیں کر سکا۔ بغیر کسی سامان کے وہ دو دن لاہور میں ایک ہوٹل میں رہ کر واپس آئے تھے۔ رامش کو ماننا پڑا تھا کہ وہ فی البدیہہ ٹرپ اس نے بہت انجوائے کیا تھا۔

"چلیں ٹھیک ہے۔ میں الماس کو کنسیڈر کر دوں گا۔" رامش نے حامی بھر لی۔

اب وہ اس ہی نیت سے سامان اٹھا کر یہاں موجود تھا۔

☆☆☆

وہ نہا کر نکلی تو سوچا نیا جوڑا پہن کر دیکھ لے۔ اس کے حصے میں گہرا ابرار رنگ آیا تھا جو یقیناً کسی اور کو پسند نہیں آیا تو اس کو مل گیا۔ بڑے لڑ جھگڑ کر اس نے دوپٹے کی منظوری لے لی تھی۔ اس نے پہلی بار بنا چنٹوں کی میکسی پہنی تھی۔ جو اس کے نازک خدوخال کو بے حد پرکشش بنا رہی تھی۔ اس نے آئینے میں خود کو دیکھا۔ کھلے گھنے بال کمر پر گر رہے تھے۔ چہرے پر ویسے ہی دیسی خوراک کی لالی تھی۔ اسے خود میں اور اشتہاروں میں نظر آنے والی لڑکیوں میں کوئی فرق نظر نہیں آیا۔ پیچھے شمسہ بیگم بھی یک ٹک اپنی نواسی کو دیکھے جا رہی تھیں۔ عطیہ بھی ایسی ہی تھی۔ بس چہرے کے داغ نے کیا دن دکھائے۔ وہ نگاہوں سے شمزین کی بلائیں لینے لگیں۔

شمزین گھوم کر، کبھی پوز بنا کر آئینہ دیکھ رہی تھی جیسے تصویریں کھنچوا رہی ہو۔ خود پر گزرے یہ فارغ لمحے بھی آسائش تھی۔ یہ لمحے وہ جب بھی بٹورتی چوری سے بٹورتی۔

"شمزین۔" باہر الماس نے زور سے آواز لگائی۔ شمزین کو لگا چوری پکڑی گئی۔ وہ گھبرا کر بغیر دوپٹے کے ہی باہر دوڑی۔

"جی کوئی کام ہے۔" تیزی سے آ کر وہ رکی تو اس کے گھنے بال کندھے پر گر گئے۔ سامنے الماس کے ساتھ رامش بیٹھا تھا۔ شمزین کو دیکھا تو لگا وقت تھم گیا۔

وہ دونوں بہت دیر سے باتیں کر رہے تھے۔ فوزیہ بیگم اپنے کمرے سے دیکھ رہی تھیں۔ ملازم آ جا رہے تھے۔ بظاہر کوئی غیر اخلاقی بات نہیں تھی۔ لیکن دونوں ایک دوسرے کی نیت جانتے تھے۔ رامش کو الماس اچھی لگی تھی۔ وہ جانتا تھا کہ الماس سامنے ہو تو اچھی لگتی ہے مگر اس میں ایسی کوئی بات نہیں ہے کہ اگر وہ نہ ہو تو رامش بے قراری محسوس کرے۔ وہ خود کو سمجھا رہا تھا کہ آہستہ آہستہ محبت اپنے سارے جذبوں کے ساتھ آ ہی جائے گی۔ وہ کون سا کسی اور سے محبت کرتا تھا۔ ارینج میرج تو ایسے ہی ہوتی تھی۔ مگر اب یوں اچانک شمزین سامنے آئی تو وہ پلک جھپکنا بھول گیا۔ الماس کی بھی سٹی گم ہو گئی تھی۔ اس نے شمزین کے لیے وہ کپڑا لیا تھا جو کسی اور کو پسند نہیں آیا تھا۔ اوپر سے لائٹ براؤن کلر کا وہ چمکیلا کپڑا شمزین کے کندھوں سے ڈھلک رہا تھا۔ اس کی لمبی گردن اور گلابی لگ رہی تھی۔ کمر تک پہنچ کر میکسی کا طوطا گرین رنگ شروع ہو جاتا تھا۔ سب لڑکیوں نے یہ تیز رنگ کپڑا سائیڈ پر رکھ دیا تھا کہ دیکھ کر ہی کھٹی کیری کا ذائقہ منہ میں آ جاتا ہے۔ وہی کھٹا رنگ اب شمزین کی کمر سے ڈھلک رہا تھا تو لگ رہا تھا سرسبز وادی میدان میں اتر رہی ہے۔ ڈھیلے جھولدار گھریلو درزنوں کے سلے کپڑوں میں اس کی فگر نظر کہاں آتی تھی۔ نیچے سے چوڑی ہو کر میکسی بائل گرین رنگ میں ڈھل گئی تھی یہ اچھا خوش نما رنگ تھا۔

الماس نے شکر کا سانس لیا۔ شمزین کے دودھیا پاؤں چھپ گئے تھے۔

شمزین نے دونوں کو اپنا سر سے پاؤں تک

معائنہ کرتے دیکھا تو دوبارہ مخاطب کرنا ضروری سمجھا۔

"کوئی کام تھا؟" اس نے پوچھا۔

"وہ...... ہاں دو کپ کافی بنا دو۔" الماس نے ذہن پر زور ڈال کر بات یاد کی۔

شہزین اچھا کہتے ہوئے میکسی اٹھا کر واپس چلی گئی۔ اس کے پلٹنے میں اس کی نازک ایڑیاں بھی نظر آ گئیں۔ رامش گم صم گنگ بیٹھا تھا۔

"ہاں تو میں بتا رہی تھی۔ ہمیں راستہ نہیں مل رہا تھا۔" الماس نے سلسلہ کلام زبردستی دوبارہ جوڑا۔ رامش کا ذہن مستقل بھٹک چکا تھا۔ اسے الماس کی کوئی بات سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔ اس کا دل تو اس بے قراری کے حصار میں تھا۔ جو شہزین کے جانے کے بعد سے وہ محسوس کر رہا تھا۔

☆☆☆

آخر نعیم کی دلہن اپنی دونوں بچیوں کے ساتھ واپس آ گئی تھی۔ دانیہ نخرے دکھانے میں مصروف تھی اور فوزیہ بیگم اس کے نخرے اٹھانے میں۔ پرس سے پیسے نکال کر ان نے پوتیوں کے سر سے وارے۔ چھوٹی بچی کو ایسے خود سے چھکارا کہ وہ بھاں بھاں کر کے رونے لگی۔ خوش قسمتی سے نعیم بھی وہاں موجود تھا۔ رامش دیکھ رہا تھا کہ کیسے فوزیہ بیگم چاہ سے دانیہ کو منگنی کی تیاریاں دکھا رہی ہیں اور دانیہ ٹیڑھے منہ سے مختصر تبصرے کر رہی ہے۔ ایسی حرکتوں پر اس نے شہزین کو تو احسان فراموش قرار دے دیا تھا۔ مگر دانیہ کا رویہ اسے ماضی کی باتوں کا ری ایکشن معلوم ہوتی تھیں۔ جو بھی تھا وہ اس خاندانی جھمیلے میں پڑنے والا نہیں تھا۔ اس لیے اٹھ گیا۔

"مجھے ایک دوست سے ملنے جانا ہے۔" اس نے عذر پیش کیا جو سب نے خندہ پیشانی سے قبول کر لیا۔ پچھلی بار وہ چیف گیسٹ تھا اس بار دانیہ تھی۔

☆☆☆

الماس کو ایک پل چین نہیں آ رہا تھا۔ اس نے منع بھی کیا تھا کہ شہزین کے لیے میکسی نہ بنوائیں۔ مگر فوزیہ کو دکھاوا عزیز تھا۔ اب کیسے چمک رہی تھی وہ شہزین۔ الماس نے تلملا کر یاد کیا۔ سب سے زیادہ اسے رامش کے تاثرات دیکھ کر جلن ہو رہی تھی۔ الماس کو لگا اگر شہزین بیچ میں نہ آئی ہوتی تو رامش نے اپنی ماں باپ کو بلا ہی لیا ہوتا۔ اپنی الماری سے اس نے کچھ پرانے کپڑے نکالے اب اسے شہزین کو اپنی اترن دینا بھی گوارا نہیں تھا۔

"میں آگ لگا دوں گی مگر شہزین کو نہیں دوں گی۔ وہ کپڑوں کی گٹھڑی بنا کر زیتون کو ڈھونڈتی پہنچی۔ زیتون اسٹور میں استری کر رہی تھی۔"

"زیتون! یہ کپڑے تم گھر لے جاؤ۔ اگر اب مجھے یہ کپڑے نظر بھی آئے تو تمہاری خیر نہیں۔" الماس نے کپڑے میز پر رکھے۔ استری والے ڈھیر میں شہزین کی میکسی بھی پڑی تھی۔

"یہ ادھر کیا کر رہی ہے؟" الماس کے پوچھنے پر زیتون گھبرا گئی۔

"وہ جی میں نے کہا استری کر دیتی ہوں۔ شہزین باجی کے امتحان ہونے والے ہیں۔ پڑھائی کا وقت نہیں مل رہا۔" زیتون منمنائی۔

"اچھا ٹھیک ہے۔" الماس نے خلاف توقع غصہ نہیں کیا۔

"میرا لال پرس نہیں مل رہا۔ مجھے ڈھونڈ دو۔" الماس نے پیار سے کہا۔

"جی اچھا بس دو منٹ۔" زیتون نے کہا۔

"ابھی اور اسی وقت۔" الماس چلائی تو زیتون گھبرا کر استری کا سوئچ نکال کر چلی گئی۔

الماس نے سکون سے دوبارہ سوئچ لگایا۔ استری اسٹینڈ پر شہزین کی میکسی بچھائی اور عین پیٹ پر استری رکھ کر آن کر دی۔

☆☆☆

رامش کا کراچی سے کام ختم ہو چکا تھا اب جب تک وہ یہاں تھا فوزیہ کے گھر رہتا تھا۔ لیکن اس کا ایک دوست عمر رہنے کے لیے پورشن ڈھونڈ رہا تھا۔ رامش بھی ساتھ آ گیا۔ دروازہ ایک درمیانی عمر

کی خاتون نے کھولا۔

"جی میں شاہانہ ہوں۔ مجھے یاد ہے آپ نے فون کیا تھا۔ اوپر کا پورشن ہے، سیڑھیاں باہر سے ہیں۔ میں دروازہ کھلواتی ہوں۔ میرے شوہر بزنس کے سلسلے میں شہر سے باہر گئے ہیں۔ لیکن آپ فائنل کریں۔" خاتون نہایت باتونی تھیں۔

"اس عورت کو میں نے کہیں دیکھا ہے۔" وہ دونوں چابی لے کر اوپر چڑھ رہے تھے تو رامش نے کہا۔

"اسٹیج ایکٹریس ہے۔ جوانی میں فلموں میں ہیروئن کی سہیلی بھی بنتی تھی۔" عمر نے بتایا۔ وہ اوپر پہنچے تو ہیل کی ٹک ٹک کرتی شاہانہ بھی آ گئی۔ اس کے ہاتھ میں اپنی باتونی اٹھا رکھی تھی۔

"کچن امریکن ہے۔ دونوں کمرے بہت کھلے ہیں۔" شاہانہ نے پردے کھسکا کر بالکونی کا دروازہ کھول دیا۔ رامش اور عمر اس کی بے تکلفی پر نظروں کا تبادلہ کر کے کمرا باتھ روم دیکھنے لگے۔ عمر جیسے کنوارے کے لیے یہ مختصر پورشن بھی کافی تھا۔

"باجی! ایسا پوچا لگا دیا ہے، چاہے اب آپ فرش پر ناگن ڈانس کر لیں۔" ملازمہ ٹرے میں شیشے کی بوتل لے کر اوپر آئی تھی۔

شاہانہ نے اسے گھور کر دیکھا تو وہ فوراً سیدھی ہو گئی۔

"میڈم! میں نے موپ لگا دیا ہے۔" ملازمہ کو سخت ہدایت تھی کی مہمانوں کے سامنے انگریزی بولا کرے۔

"ایک بوتل کیوں لے آئی ہو، دو مہمان ہیں۔" شاہانہ نے ٹوکا۔

"نہیں جی، ہم نہیں پئیں گے۔ مجھے آگے جانا ہے۔ باقی میں آپ کے ہزبینڈ سے بات کر لوں گا۔" عمر نے کہتے ہوئے باہر راستہ بنایا۔ رامش بھی پیچھے نکلا پھر اس نے مڑ کر کن انکھیوں سے شاہانہ کو دیکھا۔ شاہانہ نے سوڈے کی بوتل دانتوں میں دبا کر کھولی اور غٹا غٹ پینے لگی۔

رامش مسکرا کر سیڑھیاں اترنے لگا بہت دلچسپ خاتون تھیں۔ مگر رامش کو وہ اداس اور اکیلی محسوس ہو رہی تھیں۔ جیسے من پسند محل کا قیدی۔

"ہاں جناب! اب بتائیں کن سوچوں میں گم ہو۔" گاڑی میں بیٹھتے ہوئے عمر نے دریافت کیا۔

"میں کم بولتا ہوں۔" رامش نے پہلو بدلا۔

"چلو کچھ کھاتے ہیں۔" عمر ایک اچھا تھیرا پسٹ ثابت ہو سکتا تھا کیونکہ وہ صرف سنتا تھا۔

"میں سوچتا ہوں۔ ہمیں لوگوں کا امپریشن قائم کر لینے میں جلدی نہیں کرنی چاہیے ہر انسان میں کچھ اچھائیاں بھی ہوتی ہوں گی۔ ضروری نہیں کہ بچپن میں جو آوارہ بدتمیز ہو بڑے ہو کر وہ ویسا ہی رہے۔" رامش خود ہی بولنے لگا تھا۔

☆☆☆

ساری ملاقات کے آخر میں فیصلہ یہ ہوا کہ رامش کو کسی سے فی الحال کوئی بھی لینا دینا نہیں ہے۔ وہ اوور تھنک کر رہا تھا۔ مہمان بنے دعوت اڑائے الماس کو پرکھے اور بس۔ یہی سبق دہراتا ہوا وہ واپس گھر پہنچا تو آگے فوزیہ کا واویلا باہر تک سنائی دے رہا تھا۔

"یہ ستاروں والا ریشمی پڑا تھا ساری استری ستیاناس کر دی۔" فوزیہ زیتون کو ڈانٹ رہی تھی۔

"باجی! قسم لے لو میں تو یہ استری بھی ٹھیک کر رہی تھی۔" زیتون کی سہمی آواز سے لگ رہا تھا وہ بہت دیر سے جھڑکیاں کھا رہی تھی۔

"تمہارے ہاتھ ٹوٹ گئے تھے جو زیتون کو اتنا مہنگا جوڑا تھما دیا۔ سارا پیسہ برباد کیا۔ عین بیچ سے جلا ہے۔ اب یہ کس کام کا۔ مفت ہاتھ آ رہا تھا اس لیے قدر نہیں تھی۔" فوزیہ نے توپوں کا رخ ثمرین کی طرف کیا۔

"اس کے امتحان ہونے والے ہیں اس لیے پڑھ رہی ہے۔" الماس بھی قریب بیٹھی اور اس تماشے سے بہت محظوظ ہو رہی تھی۔

رامش سب سن چکا تھا۔ وہ بڑھ کر منظر میں

شامل ہوا۔ الماس کے چہرے کا سکون دیدنی تھا۔ رامش پر انکشاف کا ایک جھماکا ہوا۔ صبح جب شہزین یہ میکسی پہن کر باہر آ گئی تھی تو الماس کے تاثرات کسی سے چھپے نہیں تھے۔

''ارے بیٹا! تم دیکھو نا فنکشن والے گھر کے سو بکھیڑے ہیں۔ میں اکیلی کیا کیا کروں۔'' فوزیہ نے رامش کو دیکھ کر بات سنبھالی۔ پھر شہزین سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔

''اب اٹھاؤ یہ سب۔''

رامش شہزین کو دیکھتا ہی رہ گیا۔ شہزین کا اڑا ہوا رنگ اور پتھرائی ہوئی نگاہیں۔ وہ یک ٹک اس میکسی کو دیکھے جا رہی تھی۔ گو اس کو سب سے بدرنگ کپڑا ملا تھا مگر اس نے جب پہنا تھا تو کیسا کھل اٹھا تھا۔ کسی کی کوئی چیز بس اسے اتنی حسین لگی تھیں اور زندگی کی بے شمار چیزوں کی طرح کیسے پلک جھپکتے چھن گئی تھی۔ شہزین نے دکھ کی صورت بن کر جھک کر وہ برباد ہوئی میکسی اٹھائی اور باہوں میں بھر کر کمرے سے باہر چلی گئی۔ رامش اسے بے بسی سے دیکھتا ہی رہ گیا۔

''آئیں رامش! میں کافی بنواؤں۔'' الماس نے بے موقع کھل بتیسی دکھاتے ہوئے کہا۔

''نہیں میں پی چکا ہوں۔'' رامش نے غمگین ہو کر کہا پھر اوپر سیڑھیاں چڑھنے لگا۔

وہ کیوں غمگین تھا اس نے۔ دل ٹٹولا کیونکہ اب وہ شہزین کو وہ میکسی پہنے دوبارہ نہیں دیکھ سکے گا۔ دل نے جواب دیا۔ وہ خود سے ہی شرمندہ ہو کر کمرے کی طرف جانے لگا۔

''میکسی اڑ کر تو استری کی میز پر نہیں آ سکتی تھی۔ نہ ہی استری میں جان ڈل گئی تھی جو خود ہی چل گئی۔ میں نہیں سمجھتی کیا کہ یہ سب الماس باجی نے کیا ہے۔ معصوم کا نقصان کیا الٹا اسے ہی ڈانٹ سنائی۔'' رنگ مال سے استری صاف کرتے ہوئے بڑبڑا رہی تھی۔

وہ کمرے میں آیا تو تمام دور رہنے اور اپنے کام سے کام رکھنے کے درس بھول چکا تھا۔ گھر کی گلی میں چلتی پلاسٹک کی لالٹین نظر آ رہی تھی۔ ساری احتیاط بالائے طاق رکھ کر وہ تیز قدموں سے نیچے جانے کے لیے بڑھا تھا۔

☆☆☆

وہ کرسی پر پاؤں اونچے رکھے بیٹھی تھی۔ جلی ہوئی میکسی اس کی گود میں پھیلی ہوئی تھی۔ جھلسے ہوئے ستاروں کے نیچے وہ اپنے دودھیا ہاتھ رکھے بیٹھی تھی۔ ٹپ ٹپ آنسو ریشمی کپڑے میں جذب ہو رہے تھے۔ رامش اسے دیکھتا گیا۔ آج پہلی بار اسے شہزین بے ضرر لگی تھی۔ شہزین کی اس پر نظر پڑی تو اس کے آنسو فوراً رک گئے۔ جیسے اجنبی کے سامنے بہنا گستاخی ہو۔

''اچھا ڈریس تھا اب تو ضائع ہو گیا۔'' رامش افسوس کا اظہار کرتے ہوئے شہزین کے سامنے آ گیا۔

''زندگی بھری پڑی ہے خوب صورت ناکارہ چیزوں سے کیا کیا جائے۔'' اس نے ہتھیلی سے گال رگڑ لیے۔

رامش نے دیوار کے ساتھ ٹیک لگا کر سینے پر ہاتھ باندھ لیے۔

''جس نے بھی یہ کیا ہے میں کہتا ہوں وہ اپنی خیر منائے۔ ایک دفعہ میں نے یہ گستاخی کی تھی۔ یاد ہے تم نے میرا سانس لینا مشکل کر دیا تھا۔'' رامش سالوں بعد اس بات پر ہنسا تھا۔

''اگر میں تمہارے پیچھے نہ پڑتی تو باقی سب میرے پیچھے پڑ جاتے۔ بلی کا بکرا بننے سے بہتر تھا قصائی بن جاؤ۔'' شہزین اب اتنی بڑی ہو گئی تھی کہ اپنے رویے کا تجزیہ کر سکتی تھی۔

''تمہارے پیچھے کیوں پڑتے تم تو ان کی کزن تھیں۔'' رامش نے کہا۔ شہزین حیرت سے اسے دیکھتی رہ گئی۔

''تم جانتے ہو نہ میری قمیص پھٹی تھی۔ نیچے بنیان آٹے کے تھیلے کی بنی ہوئی تھی؟'' اسے لگا

رامش سب بھول چکا ہے بس اسے یاد ہے۔
"مجھے تب اردو پڑھنی نہیں آتی تھی۔" اس نے بہت مشکل سے اقرار کیا۔

"میرے ابو سب کے مقابلے میں کم کماتے تھے۔ ہم چھوٹے شہر سے نئی خریداری کر کے جب یہاں آئے تھے تو معلوم ہوا تھا کہ ہمارے جیسے کپڑے جوتوں کا فیشن تو کب کا پرانا ہو گیا ہے۔ اب تو ویسے کپڑے ہمارے رشتہ داروں کے ملازم پہن رہے ہیں۔ پھر دادی کی سختی تھی کبھی جو ہم نے جینز یا فراک پہنا ہو۔ وہی تھان سے لیا پھولوں والا کپڑا اور اس کی شلوار قمیص۔ یہ شہری کزن ہمیں کبھی قبول نہیں کرتے تھے۔" شمرین نے تفصیل بتائی۔

"ایسا تو نہیں تھا۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے تم لیڈر تھیں۔ ہر گیم تمہاری پسند سے ہوتا تھا۔" رامش نے یاد کروایا۔

"میں ہر وہ شرارت جانتی تھی جن سے میرے کزنز کو منع کیا جاتا تھا۔ ہر کھیل میں سب سے پہلے میں کودتی تھی۔ اس لیے لیڈر بن جاتی تھی۔" اس نے اٹھ کر جوتے پہنتے ہوئے کہا۔

"تم بدتمیز بھی بہت تھیں مجھے وہ وقت نہیں بھولتا۔" رامش نے آخری حساب کھولا۔

"تمیز دار ہوتی تو تمہاری طرح ہی منہ چھپا کر روتی رہتی۔ بدتمیز تھی تو اس ٹرپ میں خوب انجوائے کیا۔ اب میں بدتمیز نہیں رہی تو دیکھو کیا ہو رہا ہے۔" اس نے جلی ہوئی میکسی پھیلا کر رامش کو جتاتے ہوئے دکھائی۔ یعنی وہ بھی جانتی تھی میکسی جلی نہیں جلائی گئی ہے۔

رامش ٹیک چھوڑ کر سیدھا کھڑا ہو گیا۔ سالوں پرانا حساب بے باق ہوا تھا۔

"چلتی ہوں۔" اس نے لالٹین بند کی اور جانے لگی۔ رامش نے اسے جاتا دیکھ اقرار کیا کہ شمرین کو سوچنا اس کے اختیار سے باہر ہو چکا تھا۔

☆☆☆

انسان اپنے اصل کو بہت جلدی پہچان لیتا ہے۔ بدن کی مٹی جیسے اپنا خمیر جانتی ہو۔ دانیہ بھی حیرت زدہ تھی۔ منی نے چند گھنٹے لگائے تھے وہ باپ سے بھی مانوس ہو گئی تھی اور ایسے بے فکری سے سو جاتی تھی جیسے یہیں پیدا ہوئی ہو۔ اقصیٰ بھی اپنے پرانے کھلونے دیکھ کر ناچتی پھر رہی تھی۔ نانی کے گھر وہ سارا سارا دن موبائل پر کارٹون دیکھتی تھی۔ مگر یہاں وہ خود ہی ایک سے اگلی مصروفیت نکال رہی تھی۔ نعیم بھی ہشاش بشاش تھا۔ وقت پر گھر آتا تھا۔ مگر دانیہ کے دل کو لگے دھڑکے کم نہیں ہو رہے تھے۔

"آج میرے پاس فراغت ہے۔ چلو بچیوں کی شاپنگ کرا آئیں۔" نعیم نے منی کو گود میں اٹھا کر جھولا دیا۔

دانیہ بغیر جواب دیے بال برش کرتی رہی۔ ان دونوں کے بیچ گہری اجنبیت آ چکی تھی۔ نعیم بچیوں سے بات کرنے لگا۔

"میری گڑیا نئے کپڑے لے گی؟ ایسا کرتے ہیں دونوں کے لیے جنگ سوٹ لے لیتے ہیں۔" نعیم نے کہا۔

"جمپ سوٹ ہوتا ہے۔" دانیہ نے اگلے ہی لمحے صحیح کی۔ نعیم جھینپ گیا۔

"بابا! جنگ سوٹ، بابا جنگ سوٹ۔" اقصیٰ ہنس ہنس لوٹ پوٹ ہو لی۔

"میں نیچے انتظار کرتا ہوں تم لوگ آ جاؤ۔" نعیم نے راہ فرار اختیار کی۔

☆☆☆

"نازش کی ساڑھی درزی سے نہیں آئی تم نے تو ہر چاہ پورے کیے۔ بھابھی کے معاملے میں اتنی لاپروائی۔ زیور کے ساتھ سارے کپڑے بھیجنے ہیں۔" فوزیہ شدید غصے میں تھیں جو الماس کو بھی ڈانٹ دیا۔

"میں پارلر جا رہی ہوں۔ آپ کسی اور کو بھیج دیں۔ وہ مجھے پک کرنے آ گئی ہیں۔" الماس اپنی کزنز کے ساتھ فوراً نکل گئی تھی۔

"کل فنکشن ہے۔ دلہن کا جوڑا بھیجنا ہے۔

اب مہمان چھوڑ کر میں بازار تو جانے سے رہی۔ ڈرائیور کو بس اڈے پر بھیجا ہوا ہے۔"

فوزیہ بیگم واقف تھیں کہ ساتھ والے کمرے میں رامش اپنی گلابی چائے پینے میں مصروف ہے۔ پھر بھی انہوں نے لہجے میں بناوٹ نہیں ڈالی۔ اب ان کے پاس بناوٹوں کی فرصت نہیں تھی۔ رامش کو جب سے انسٹنٹ کشمیری چائے ملی تھی۔ وہ اس کے ساشے بٹوے میں لیے پھرتا تھا۔

"شمرین......" فوزیہ بیگم کی تان آخر اس پر ہی ٹوٹی۔

"جی مامی!" شمرین ایک پرانے زمانے کی قمیص اور دھاگا پکڑے آئی۔

"یہ کہاں سے آیا؟" فوزیہ اس کی تفتیش میں لگ گئیں۔

"یہ میری امی کا ہے۔ تھوڑا تنگ کر کے پہن لوں گی۔" شمرین نے وضاحت دی۔

فوزیہ نے اس قدیم زمانے کے سوٹ کو دیکھ کر تیوری چڑھائی۔ رامش نے کرسی پر ٹیڑھا ہو کر وہ قمیص دیکھی اور پھر سے کشمیری چائے پینے لگا۔

"یہ سب چھوڑ دو ابھی درزی کے ہاں جاؤ اور نازش کی ساڑھی اور ایک جوڑا سلا پڑا ہے وہ لے آؤ میں رکشا منگوا دیتی ہوں۔ اب اتنی بھی ننھی نہیں ہو کہ بازار نہ جا سکو۔ دادی نے تو جیسے قید کر کے رکھا تھا۔"

وہ اعتراض کرتی اس سے پہلے فوزیہ نے سنا ڈالیں۔

"میں نانی کو ساتھ لے جاؤں؟ حوصلہ رہتا ہے۔" وہ گھبرا گئی تھی۔

"تاکہ وہ ایک ایک جوڑے پر دس دس باتیں سنائیں۔ شرافت سے جاؤ اور سیدھا لفافہ مجھے لا کر دینا۔ میں رکشا منگوا دیتی ہوں۔" شمرین ہدایات سن کر سر ہلاتی کمرے میں چلی گئی۔

"زیتون! ذرا کسی کو گلی کے کونے پر بھیجنا۔" فوزیہ بیگم نے آواز لگائی۔

رامش فوراً بوتل کے جن کی طرح حاضر ہوا۔

"آنٹی! میں منگوا دیتا ہوں۔ اب تو ایک کلک کرو سب گھر پر آ جاتا ہے۔ کہاں جانا ہے؟" اس نے سعادت مندی سے کہا۔

"بڑے اچھے بچے ہو۔ بالکل میری الماس جیسے وہ بھی ہر ایک کی مدد کو تیار رہتی ہے۔" فوزیہ بیگم نے بازار کا ایڈریس بتایا اتنے میں شمرین بھی ایک بڑا سا ڈبا پکڑے آ گئی۔

"یہ لو پیسے اندر کی جیب میں ڈال لینا اور بغل میں پرس دبا کر جانا۔" فوزیہ کی ہدایات جاری تھیں۔

"رکشا آ گیا ہے۔" رامش نے اعلان کیا پھر راستہ سمجھانے کے بہانے شمرین کے پیچھے ہی باہر نکل گیا۔

شمرین رکشے میں سوار ہوئی تو ساتھ رامش بھی بیٹھ گیا۔ شمرین ٹپٹا گئی مگر رامش نے سکون سے رکشے والے کو چلنے کا کہا۔

"یہ کیا حرکت ہے؟" شمرین کی جان پر بن آئی۔

"مجھے بھی بازار میں کچھ کام تھا۔" رامش ہل جل کر اپنی ٹانگوں کے لیے جگہ بنانے لگا۔

"مامی بہت خفا ہوں گی۔ انہوں نے ماموں کو بتا دینا ہے۔ اپنی غلطیوں کے لیے وہ سیدھا دادی کو بھی فون لگا سکتی ہیں۔" شمرین چلا پڑی جا رہی تھی۔

اگر کوئی پوچھتا کہ بچپن کی شمرین اور اب کی شمرین میں کیا فرق ہے تو رامش کہتا کہ بچپن کی شمرین کو یہ ڈر نہیں تھا کہ اس کے کردار پر کوئی انگلی اٹھائے گا۔ اس لیے وہ شمرین زیادہ بہادر تھی اور جس مامی سے وہ ڈر رہی تھی ان کی بیٹی کے ساتھ وہ بازار کا اس سے بھی ذاتی ٹرپ لگا چکا تھا۔ اب تو وہ آ گیا تھا۔

"یہ ڈبا مجھے پکڑا دیں اس کو جیسے آپ نے پکڑا ہوا ہے اس کے اندر جو بھی ہے ٹوٹ جائے گا۔"

اس نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔ شمرین رکشے کی دیوار سے لگی بیٹھی رہی۔

"اس میں ویسے ہے کیا؟" شمرین کی مضبوط

گرفت کے باوجود اس نے ڈبا کھینچ لیا تھا اور اب کھول کر دیکھ رہا تھا۔ اندر ڈیکوریشن کا سامان تھا۔ رامش نے ایک شیشے کا گلاس نکالا۔

"موم بتیاں ہیں میں بناتی ہوں۔" شہرین نے بتایا۔ اس کا دھیان بٹا تھا۔ رامش نے گلاس میں دو رنگوں کی موم کو دیکھا جو جگہ جگہ سے خالی تھی۔ اس لیے حسین لگ رہی تھی۔

"یہ خالی جگہ کیسے چھوڑتے ہیں؟" رامش اس کا دھیان مزید بھٹکانا چاہتا تھا۔

"برف کوٹ کر اوپر موم ڈال دیں تو ایسی بنتی ہیں۔" شہرین نے نپا تلا جواب دیا۔

رامش کو یاد آیا ایک دن اس نے شہرین کو کچن میں ایسا ہی کچھ کرتے ہوئے پایا تھا۔ تب وہ سمجھا تھا کہ شہرین کھانے پینے کو کچھ بنا رہی ہے۔ پھر ایک ایک کر کے اس نے ساری کینڈلز نکال کر دیکھیں۔ کسی میں پھول کی پتیاں تھیں۔ کسی میں افشاں اور ایک آدھی پر موتی بھی ڈلے تھے۔ سارا راستہ موم بتیوں کے سوال جواب میں گزر گیا۔

شہرین نے گفٹ شاپ پر پہلے موم بتیاں بیچیں اور پچھلی کا حساب لیا۔ پھر وہ درزی کے پاس گئی اور موٹے وزنی تھیلے گھسیٹتے ہوئے لائی۔ رامش ریڈی ٹو ویئر کپڑوں کی دکان کے سامنے ٹہلتا رہا۔ اسی دوران شانزے کی کال آ گئی۔

"کل رات فنکشن ہے پرسوں صبح میں نکل جاؤں گا۔ پرسوں ڈنر پر ملتے ہیں۔" رامش نے اسے ٹھنڈا کیا۔

"تم روایتی فنکشن انجوائے کرو اور میں اکیلے بیٹھ کر سڑوں ناٹ پاسیبل۔" شانزے برا مان گئی۔ پیچھے فلائٹ کی اناؤنسمنٹ شروع ہو چکی تھی۔

"یہ خاندانی شادیوں میں کوئی انجوائے نہیں ہوتا۔ میں بھی ماما کے کہنے پر رکا ہوا ہوں، ورنہ تمہارے ساتھ ہی واپس جاتا۔" رامش نے آہ بھر کر اداسی کا یقین دلانا چاہا۔

"آنٹی نے کیوں کہا ہے؟ کیا کوئی لڑکی دیکھ رہے ہو؟ کون ہے بتاؤ مجھے۔" شانزے فوراً پیچھے پڑ گئی۔

"ارے کچھ بھی نہیں ہے۔ میں پرسوں آ کر ملتا ہوں بائے۔" رامش نے اپنی سمت آتی شہرین کو دیکھ کر کال بند کی۔

"میرا کام ہو گیا ہے۔ میں رکشا لے کر جا رہی ہوں۔ آپ بعد میں آ جائیے گا۔" شہرین نے مروتاً بتایا اور نکلنے کی کوشش کی۔

"آپ چلی جائیں گی تو میرا کام کیسے ہو گا؟" رامش معنی خیزی سے مسکرایا۔ شہرین جاتے جاتے رک گئی۔

"آپ کا ڈریس جل گیا تھا۔ تو میں چاہ رہا تھا آپ کو ایک نیا ڈریس لے دوں۔" رامش نے اپنے پیچھے والی دکان کی طرف اشارہ کیا۔ شہرین گنگ رہ گئی۔ مخاطب کے چہرے پر نہ ہی احسان تھا نہ چیرٹی۔ اگر تھی تو چاہ تھی۔ اسے بنا سنورا دیکھنے کی چاہ۔ اسے خوش دیکھنے کا ارمان اور شہرین اس چاہ سے ڈر گئی۔

"مجھے نہیں چاہیے۔ میں نے انتظام کر لیا ہے۔" شہرین نے نظریں پھیر لیں۔ پہلی بار ہوا تھا کہ اس سے نظروں کی تاب نہیں لائی جا رہی تھی۔

"وہ پرانے زمانے کا سوٹ آپ کو پہننے کی بالکل ضرورت نہیں۔ آئیں کچھ اچھا سا لیتے ہیں۔" رامش دروازہ کھول کر اندر چلا گیا۔

شہرین کی ہتھیلیاں پسینے پسینے ہو گئی تھیں۔ رامش گاؤن، میکسی لہنگے بہت خوش رنگ کپڑے نکلوا رہا تھا۔ مگر اس میں اندر جانے کی ہمت نہیں تھی۔ دروازے کے پار سے ہی رامش نے ایک گلابی سوٹ لہرایا۔ شہرین نہ چاہتے ہوئے بھی مسکرا دی۔ پھر بھی ٹس سے مس نہ ہوئی۔ رامش کو ہی باہر آنا پڑا۔

"ایک بار ٹرائے تو کر لو۔" رامش نے آداب شاپنگ یاد کروائے۔

"آپ یہ سب کیوں کر رہے ہیں۔ میں نے انتظام کر لیا ہے۔ مجھے نیا سوٹ نہیں لینا۔" اس نے

نرمی چھوڑ کر غصے سے بات کرنا چاہی۔ مگر لہجہ گزارشانہ ہوگیا۔

"مجھے خوشی ہوگی پلیز۔" رامش نے منت کی۔

شانزے ہوتی ایک کے بجائے چار سوٹ لے لیتی۔ الماس بھی مروت میں منع تو کرتی ساتھ دیکھتی جاتی اور اب تک کوئی پسند بھی کر چکی ہوتی۔

"مجھے اپنی چادر کا علم ہے۔" وہ دو قدم اور پیچھے ہوئی۔

"میں لے کر دے رہا ہوں۔"

"کیوں؟ آپ کا میرا تو کوئی تعلق نہیں۔ نہ میں آپ کی دوست ہوں نہ رشتہ دار اور جن کی میں رشتہ دار ہوں وہ آپ کی اس حرکت پر میرے بارے میں کیا سوچیں گے۔" اب اس کی آواز بلند ہوئی تھی۔

"کسی کے پاس اتنا فالتو وقت نہیں ہے کہ دوسروں کے بارے میں سوچے۔ اٹ از نو بگ ڈیل۔" رامش نے کندھے اچکائے۔

"کیا آپ نے نہیں سوچا تھا کہ مجھے اس گھر میں رکھ کر احسان کیا جا رہا ہے۔"

لوگوں کی یہ سوچ ان کے چہروں پر لکھی جاتی تھی۔ شمرین نے بھی متعدد بار رامش کا چہرہ پڑھا تھا۔

رامش لاجواب ہوا۔

"سوچنے والے سوچیں گے کہ میں نے اپنا دکھ رویا ہے، فرمائش کی ہے، مطلب نکالا اور مجھے یہ ہرگز گوارا نہیں۔" اس بار سب کہہ کر شمرین مڑ گئی۔ آگے جا کر اس نے ایک رکشا بلا لیا۔ رامش کا موڈ خراب ہوگیا تھا۔ یہ خودداری کا انوکھا انداز تھا اور ڈر ڈر کر جینے کا انوکھا طریقہ۔ وہ پیر پٹختے ہوئے رکشے میں سوار ہوا تھا۔

"دیکھیں میں انسانیت کے ناتے ایک اچھا کام کرنا چاہ رہا تھا۔ مجھے آپ سے اور کوئی غرض نہیں۔" رامش نے وضاحت کی۔

"مان لیا۔" شمرین نے ہنسی دبائی۔

"میں لڑکیوں میں بالکل دلچسپی نہیں رکھتا اور ہم دونوں کے مزاج میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ وہ تو میں فارغ تھا تو سوچا......"

باقی سارا راستہ وہ وقفے وقفے سے اپنی حرکت کے ازالے کے لیے وضاحتیں دیتا رہا۔

رکشا رکا تو شمرین نے فوراً اندر بھاگنے کی کی۔ کہیں مامی دونوں کو ساتھ نہ دیکھ لیں۔ وہ دوڑ کر لان میں پہنچی مامی اور الماس ادھر ہی کھڑی تھیں۔ دونوں کے چہرے پر غصہ اور تناؤ تھا۔ شمرین کو خون خشک ہوتا محسوس ہوا۔ وہ وہیں رک گئی۔ اتنے میں پیچھے سے رامش بھی آ گیا اور شاک ہوگیا۔

"شانزے! تم ادھر؟"

رامش کے استفسار پر شمرین نے توجہ دی۔ پاس ہی ایک بہت اسٹائلش لڑکی اپنا کیری بیگ تھامے کھڑی تھی۔ اس نے زنانہ بزنس سوٹ کے انداز میں گرے چنٹوں والی پتلون پہنی تھی جو پنڈلیوں تک آتی تھی۔ اسمارٹ چھوٹی سی جیکٹ کے نیچے بغیر آستینوں والا ٹینک ٹاپ تھا۔ لیکن زیور اس کا سارا دیسی تھا۔ بڑے بڑے جھمکے اور چوڑا سا نیکلس۔

"ہائے رامش! تم نے ہی تو بلایا تھا۔ کیا کہا تھا خاندانی شادیاں؟ بس ایڈریس دینا بھول گئے تھے وہ میں نے عمر سے لے لیا تھا۔" شانزے بولتے ہوئے رامش سے بغل گیر ہو کر واپس بھی آ چکی تھی۔

فوزیہ اور الماس کے چہرے کے بل اور تناؤ کئی گنا بڑھ گئے تھے۔ شمرین نے سکون کا سانس لیا۔ ان کے غصے کی وہ وجہ نہیں تھی۔

"یہ میری فرینڈ ہے۔ شانزے زیادہ تر باہر رہی ہے۔ پاکستانی کلچر کا بہت شوق ہے۔" رامش نے فوزیہ آنٹی کے سامنے بھرم رکھا۔

الماس نے ماں سے نظریں ملائیں۔ اس کی نظروں میں اس کے وسوسے صاف لکھے تھے۔ اس بار بی ڈول جیسی فرینڈز کے ہوتے ہوئے رامش اس کی طرف توجہ دے یہ کیسے ممکن تھا۔ فوزیہ بھی بیٹی کے

مستقبل کی خاطر جلد از جلد کوئی راستہ سوچنے لگیں۔

"اچھا تمہیں کلچر دیکھنے کا شوق ہے۔ پھر تو تمہیں شنمرین کے ساتھ کمرا دیتی ہوں۔ بہت روایتی بچی ہے۔ ہاہاہا۔"

فوزیہ نے زبردستی کا قہقہہ لگایا اور آنکھوں آنکھوں میں بیٹی کو تسلی دی۔ شنمرین جیسی گنوار کے ساتھ رہ کر وہ خود سر پیٹ لے گی۔ وقت سے پہلے ہی ٹکٹ کٹالے گی۔

اس اعلان پر شنمرین نے شانزے کو سر سے پاؤں تک دیکھا اور تھوک نگل کر رہ گئی۔

☆☆☆

"پنکھا کھول دوں؟" شنمرین نے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔

"کیا کھول دوں؟" شانزے مسکرا دی۔

شنمرین نے فوراً شرمندہ ہو کر نظریں چرائیں۔ اسے پہلے ہی ڈر تھا کہ میڈم صاحبہ کے ساتھ اس کا گزارا مشکل ہو گا۔ نیچے نانی کے ساتھ ایک اور بزرگ مہمان کو ٹھہرایا ہوا تھا۔ شنمرین کو جگہ تو بدلنی ہی تھی۔ لیکن یہ تو نئی مصیبت پڑ گئی۔ شانزے کو دیکھ کر لگ ہی رہا تھا کہ وہ سوچتی بھی انگریزی میں ہو گی۔ جبکہ شنمرین تو بائیک کو بھی اکثر گاڑی ہی کہہ دیتی تھی۔ کیونکہ اس کے گھر میں یہی بول چال رائج تھی۔

"کتنا کیوٹ بولتی ہو تم۔" شانزے نے شنمرین کے اڑتے رنگ کو دیکھ کر وضاحت کی۔

"میں پانی لے کر آتی ہوں۔" شنمرین نے بھی نظر چرا کر دوڑنا چاہا۔ لیکن آج مقابل شانزے تھی۔ اس نے فوراً اٹھ کر شنمرین کا بازو دبوچ لیا۔

"رکو، کدھر جا رہی ہو۔ ایسے منہ کیوں لٹکا لیا ہے؟ تم نے جو کہا وہ کیوٹ تھا۔ تم شرمندہ کیوں دکھ رہی ہو۔" شانزے نے کندھے سے پکڑ کر شنمرین کا چہرہ اوپر کیا۔

"نہیں تو، میں ویسے ہی جا رہی تھی۔" شنمرین کے لیے چھپنے کی جگہیں ختم ہو گئی تھیں۔ یہ نئی مخلوق تھی جو آنکھوں میں آنکھیں ڈالے بنا ڈرے سب کہہ رہی تھی۔

"نہیں، تم اس لیے جا رہی ہو کیونکہ تمہیں میرا ہنسنا اچھا نہیں لگا۔ شکل صورت سے تم دنیا کی ہائی لیول خوب صورت لڑکیوں میں آتی ہو۔ انداز سے پڑھی لکھی بھی ہو۔ پھر کسی کا کچھ کہہ دینا اتنی بڑی بات کیوں ہے۔ تمہیں خود پر اعتماد ہونا چاہیے۔" شانزے نے کسی دیرینہ دوست کی طرح کہا۔

"آپ کے لیے کہنا آسان ہے۔ آپ نے کبھی چھوٹے شہر کی لڑکی کی زندگی نہیں گزاری ہو گی۔" اس نے بھی جل کر جواب دیا۔

شانزے پھر سے ہنس دی۔

"سب کے ساتھ سب طرح کی چیزیں ہوتی ہیں۔ بچپن میرا باہر گزرا ہے۔ جب بھی ہم پاکستان سے باہر جاتے تھے۔ ایک چیز ضرور لے کر جاتے تھے اور وہ چیز تھی لوٹا۔" شانزے نے شنمرین کو بیڈ پر بٹھا لیا۔

"باہر واش رومز میں مسلم شاور نہیں ہوتے۔ اگر لوٹا نہ ہو تو ہم پانی کی بوتلیں رکھتے تھے۔ جب بھی ہمارے فارن فرینڈز آتے تھے تو یہ ضرور پوچھتے تھے کہ باتھ میں پانی کی بوتلیں کیوں رکھی ہیں۔"

شانزے بس کر رہی تھی۔ تبھی شنمرین کے تاثرات ڈھیلے پڑ رہے تھے۔

"پھر آپ ان کو کیا بتاتے تھے......؟"

"پہلے تو بہانہ بنا دیتے تھے کہ کبھی پیاس لگ جاتی ہے۔ پھر آہستہ آہستہ سچ بتانے لگے۔ ایک دفعہ ایئرپورٹ پر کسٹم والے نے ہمیں پکڑ لیا۔" شانزے نے اپنے جوتے اتارے اور بیڈ پر بیٹھ گئی۔

"بہت ادب سے کسٹم آفیسر نے لوٹے کو اٹھا کر اپنے منہ کے سامنے کیا اور پوچھا کیا اب اس میں سے جن نکل کر پوچھے گا کیا حکم ہے میرے آقا؟"

"نہیں سچ؟" شنمرین کو دلچسپی ہونے لگی۔

"ڈیڈ نے بتایا کہ ہم یہ وضو کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ جی چڑی والے کو وضو پلے ہی نہ پڑا۔ وہ ابرا کا ڈبرا پڑھ پڑھ کر لوٹے پر پھونکنے لگا۔ اور

سے میری امی نے پیکنگ اتنی اچھی کی تھی۔ لوٹے میں املی، آلو بخارے کے پیکٹ بھر بھر کر ڈالے تھے۔ آج تک وہ کسٹم آفیسر لوٹے کو اچار کا مرتبان سمجھ رہا ہوگا۔"

شانزے بیڈ پر نیم دراز ہو کر بتا رہی تھی اور شمرین ہنس رہی تھی۔ اس نے غور کیا شانزے بہت توجہ سے اسے دیکھ رہی ہے۔

"آپ کی زندگی تو بڑی دلچسپ ہے۔" وہ تبصرہ کیے بغیر نہ رہ سکی۔

"اس لیے دلچسپ ہے کیوں کہ میں خود کو کم تر سمجھنے کے بجائے موقع پر ہنس لیتی ہوں۔ اب اس کسٹم والے کے سامنے میں اور میرا خاندان چھوٹے ملک کے باسی تھے۔ تو کیا ہوا؟"

شانزے نے جب تک شمرین کو پر سکون نہیں کر دیا اس سے باتیں کرتی رہی۔

"چلو اب پانی لے آؤ گھر کا سب سے چھوٹا گلاس اور ایک ٹھنڈا جگ پانی کا۔" شانزے نے مسکرا کر یاد کروایا۔

"ہاں ابھی لیں۔" شمرین اس بار مسکراتے ہوئے اعتماد سے اٹھ کر باہر گئی تھی۔

☆☆☆

الماس پارلر سے واپس آئی تھی تو اس کی کزنز ساتھ تھیں۔ مہندی والی کو انہوں نے پہلے کہہ رکھا تھا۔ بنگالی شادی میں عبداللہ دیوانہ بنی ان کزنز نے گھریلو سٹائل مہندی کی تقریب کا چھوٹا سا انتظام کر لیا تھا۔ پرات پر نیٹ کا دوپٹا پھیلا کر تین کٹوریاں رکھ دیں۔ ہمیشہ کی طرح سب آرڈر دے رہے تھے اور شمرین دوڑ رہی تھی۔ پہلی کٹوری میں تیل ڈالا۔ پھر دوسری میں مہندی گھول کر لے آئی۔ اب وہ تیسری کٹوری لیے پھر رہی تھی۔ لڑکیوں نے ڈھولکی نکال لی۔ گھر کی اتنی بڑی خوشی پر فوزیہ بیگم کو بے چینی لاحق تھی۔ شانزے ڈرائنگ روم میں مردوں کی موجودگی میں رامش کے ساتھ بیٹھی تھی۔ الماس دونوں ہاتھوں پر مہندی لگانے میں مصروف تھی۔

"جنگل میں مور ناچا کس نے دیکھا۔ تم بناؤ سنگھار کرتی رہ جانا۔ وہ پردیسی لڑکی اس کو لے اڑے گی۔" انہوں نے نام لیے بغیر کہا۔

"وہ دونوں ایک دوسرے پر کھل چکے ہیں۔ اتنا کھل جانے کے بعد دوستی ہوتی ہے یا بےزاری، کشش نہیں رہتی۔" الماس نے سمجھانا چاہا۔

"تم خوش فہمیوں میں مت رہو بلکہ ایسا کرو۔" پھر اس کے کان میں چپکے چپکے کچھ سمجھانے لگیں۔

☆☆☆

"تمہاری فیملی میں دولہا کا خوش ہونا منع ہے کیا؟ سب پارٹی کے موڈ میں ہیں سوائے دولہے کے۔" شانزے نے لان میں تنہا بیٹھے نعیم کو دیکھا۔

"وہ خاموشی پسند ہے۔" رامش نے وضاحت کرتے ہوئے ایک بار پھر نظریں گھمائیں۔ بہت دیر سے غائب شمرین ایک کٹورا تھامے لاؤنج میں آئی۔

"یہ لیں، ابٹن تو کہیں نہیں ہے اس لیے میں فیس اسکرب گھول لائی ہوں۔ سعدیہ کہہ رہی تھی ابٹن اسکرب ہی ہوتا ہے۔"

اپنی طرف سے اس نے بڑا کارنامہ کیا تھا۔ بہت فخر محسوس کرتے ہوئے اس نے اسکرب کی کٹوری مہندی کی پرات میں رکھی۔ ہر طرف سے ایک ساتھ قہقہہ بلند ہوا۔ ہنسی کی آواز اتنی تیز تھی کہ ہر شخص نے ادھر ہی دیکھنا شروع کر دیا۔ گیلی مہندی والے ہاتھ ہوا میں اٹھائے لڑکیاں پیٹ میں کہنیاں دبائے ہنس رہی تھیں۔

"سعدیہ نے کہا تھا۔" شمرین سرخ پڑ رہی تھی۔

"میں نے مذاق کیا تھا۔" شمرین اسکرب کا کٹورا اٹھا کر واپس جانے لگی تو سعدیہ نے اس کے پیروں میں ڈھولک رکھ دی۔ اسکرب کا پیالا ڈول کر نیچے گر گیا۔ شمرین کے چہرے پر بھی کئی چھینٹے آئے۔

"چلو شمرین کو اسکرب بھی لگ گیا۔ دیکھنا

سب سے زیادہ روپ اس ہی پر آئے گا۔"

سعدیہ نے تالیاں بجا کر اعلان کیا۔ پھر کسی نے ڈھولک کھینچی کسی اور نے بجائی، سب نے گانا گایا، منہ چھپائے فرش صاف کرتی شہرین کسی کو نظر نہیں آئی۔

☆☆☆

"ارے بیٹا! آپ نے مہندی نہیں لگوائی۔" فوزیہ شانزے کو لینے ڈرائنگ روم میں پہنچیں۔

"شیور۔"

شانزے اٹھ کر فوزیہ کے پیچھے ہولی۔ فوزیہ شانزے اور مہندی لگانے والی کو ڈائننگ ٹیبل کے پچھلے کونے میں لے گئیں۔ اب رامیش شانزے کی پہنچ سے دور تھا۔ پھر الماس نے مہندی لگے ہاتھوں سے اشارہ کر کے رامش اور فہیم کو بلایا۔ اسپیکر لگوائے گانے بجے اور سب نے ہی ہلکا پھلکا ڈانس شروع کر دیا۔ الماس دلفریب مسکراہٹ کے ساتھ بھی رامش کو کوئی گانا گانے کو کہتی کبھی اپنا دوپٹا بند ھوا لیتی۔ بڑے غیر محسوس طریقے سے وہ رامش کو اپنے اردگرد گھما رہی تھی۔ رامش مہمان تھا پھر ادھر رہنے کے بعد اس کی اتنی بے تکلفی تو تھی کہ وہ الماس کا کہا مان رہا تھا۔ مگر شہرین کی غیر موجودگی بھی اس کی نظروں سے اوجھل نہیں تھی۔

"ایسا ڈریس تب بنتے ہیں جب تھیم ہو اور چار پانچ لوگوں نے ٹریڈیشنل کپڑے پہنے ہوں۔" شانزے بھنگڑا ڈالتے لڑکے لڑکیوں کو چھوڑ کر اوپر آ گئی تھی۔ شہرین سوجی آنکھوں کے ساتھ اگلے دن کی تیاری کر رہی تھی۔ تب ہی شانزے کی نظر اس کے کپڑوں پر پڑی۔

"مامی نے نیا سوٹ بنوا کر دیا تھا وہ جل گیا۔ اب یہی اکلوتا ریشمی سوٹ ہے۔" شہرین ابھی سے سن سکتی تھی کہ لوگ اس پرانے سوٹ کو دیکھ کر کیا کیا باتیں بنائیں گے۔

"دکھاؤ ذرا وہ جو جل گیا ہے۔" شانزے کی ساری تھکاوٹ اتر گئی تھی۔

☆☆☆

زندگی اپنی رو میں بہتے بہتے کب نہ جانے سنجیدہ ہو جاتی ہے۔ ان کی زندگی کا بھی کھیل تماشا اس دن رخصت ہو گیا تھا۔ کیوں ان کو اپنے اندر پلتی محبت نظر آ گئی تھی۔

شہرین ہال میں آئی تو ستائشی نظروں نے اس کا گھیراؤ کر لیا۔ اس کی کزنز کی ہونق صورتیں اس سے بھی زیادہ تھیں۔ اسے آج شانزے نے تیار کیا تھا۔ الماس اور فوزیہ پارلر سے تیار ہوئی تھیں۔ الماس بہت اچھی لگ رہی تھی۔ مگر پارلر کے اکڑے ہوئے ہیئر ڈو سے اس کی لک بہت میچور آ رہی تھی۔ جبکہ شہرین کے ڈھیلے ڈھالے کرلز اور نیچرل میک اپ اس کے حسن کو چار چاند لگا رہا تھا۔ اس نے وہی براؤن اور گرین میکسی پہن رکھی تھی۔ رات جب اس نے شانزے کو یہ میکسی دکھائی تو شانزے نے کہا استری سے پچھلا حصہ بھی اتنا ہی جلا دو۔ دونوں طرف سوراخ ہوگا تو ڈیزائن لگے گا۔ پھر جب شہرین نہیں مانی تو شانزے نے اپنا ریشمی اسکارف پھاڑ کر اناڑیوں کی طرح ہاتھ سے میکسی کو پیوند لگا دیا۔ باقی جب دوپٹا موجود تھا تو پریشانی ہی کیا تھی۔ ایک ایک پٹی کو بطور بیلٹ استعمال کر کے اس نے دو پٹے کو میکسی کے اوپر کس دیا۔ بچے دوپٹے نے اس کا سارا فرنٹ چھپا دیا تھا۔ مزید احتیاط کرتے ہوئے جلے ہوئے حصے کے اردگرد پنیں لگا دیں۔ اب شہرین سے چاہے کھیے صاف کروالو۔ اس کی میکسی کا جلا حصہ نظر آنا ناممکن تھا۔

فوزیہ نے شہرین کو سامان کے ٹوکرے پکڑائے۔ شہرین کو ان کی کم تر محسوس کراتی نظروں کی عادت تھی۔ اس کے گالوں پر لالی تو ان نظروں کے باعث پھیلی تھی جو گھر سے لے کر مسلسل اس کو حصار میں لیے ہوئی تھیں۔ ہال میں اس کو جب فراغت ملی تو اس نے خود کو ڈانٹ پلائی۔ وہ بے وجہ خوش فہمی کا شکار ہو رہی تھی۔ مانا کہ وہ بہت اچھی لگ رہی تھی لیکن یہ ممکن نہیں تھا

کہ رامش جیسا لڑکا اُسے پسند کرنے لگ جائے۔ اس نے اپنی بے وقوفی ثابت کرنے کے لیے نظر اُٹھا کر رامش کو ڈھونڈا، اُسے یقین تھا وہ لڑکیوں کے جھرمٹ میں کہیں موجود ہوگا مگر رامش سامنے کھڑا اسے ہی دیکھ رہا تھا۔ بلی تھیلے سے باہر آ گئی وہ نظروں سے براہ رہا تھا اور وہ اس کی نگاہوں کے حصار سے نکلنا نہیں چاہتی تھی۔ نظروں کے تبادلے کے بعد بھی مکرنے کی گنجائش باقی تھی مگر رامش سیدھا چلتا اردگرد سے بے نیاز اس کے سامنے آ کھڑا ہوا۔

"میری امی آنا چاہتی ہیں۔ بس مجھے سمجھ میں نہیں آ رہا انہیں آپ کے گھر بلاؤں یا آپ کے ماموں کے۔" رامش نے فیصلہ کر لیا تھا۔ اُسے الماس نہیں، شمرین پسند تھی۔

"کیا مطلب؟" شمرین کو اتنا ڈائریکٹ کہنے کی توقع نہیں تھی۔

"مطلب بھی سمجھ میں آ جائے گا۔" رامش اس کے کان میں سرگوشی کرتا مسکراتا ہوا دور ہو گیا۔

☆☆☆

منگنی کی رسم ہو رہی تھی۔ شانزے رامش کے ساتھ اسٹیج کے سامنے کھڑی تھی رامش تو بھی اسٹیج کے کونے میں کھڑی شمرین کو دیکھ رہی تھی۔

"تمہیں پتا ہے، میں تمہیں دوست سے بڑھ کر کچھ نہیں سمجھتی۔" شانزے نے رامش کو باور کروایا۔ اس بے تکی بات پر وہ ہنس دیا۔

"یہ وضاحت دینے کی کیا ضرورت پڑ گئی۔" وہ ہنوز شمرین کو دیکھ رہا تھا۔

"میں تو ہمیشہ سے کلیئر تھی۔ بس تم سے ڈر تھا۔ کہیں تم دوستی میں محبت نہ ڈھونڈنے لگو مگر تھینکس گاڈ، یہ مصیبت تو ٹلی۔" شانزے نے شکر کرتے ہوئے ہاتھ اُٹھائے۔

"کیسے؟" رامش نے نظریں ہٹا کر شانزے کو دیکھا۔

"ایسے کیونکہ تمہیں کوئی اور پسند آ گئی ہے۔"

رامش کا رنگ اُڑا، کیا وہ اتنا شفاف تھا۔

"نہیں وہ تو میں" اس نے وضاحت دینی نے چاہی۔

"میری کیب آ گئی ہے میں نکلتی ہوں سی یو ان اوور ٹی۔" شانزے نے سکون سے آنکھ ماری اور الوداع کہتی باہر چلی گئی۔ سوٹ کیس وہ گاڑی میں ساتھ لائی تھی۔

اس کے جانے کے بعد رامش لڑکوں کے گروپ میں جا کھڑا ہوا۔

"یار! ساری لڑکیاں پیسٹری بنی ہوئی ہیں صرف ایک انسان کی اولاد لگتی ہے۔" عادل نے کہا۔

رامش کو جھٹکا لگا وہ اکیلا، نہیں تھا جو شمرین کے حسن سے مرعوب ہوا تھا۔

"جو بھی ہے مگر پینڈو بھی خوب ہے اور تم تو اس سے شادی کا سوچنا بھی مت! تمہاری ٹریڈمل پر تو لیے سکھائے گی۔" بلال نے قہقہہ لگا کر عادل کو مکا رسید کیا۔

"یار! ایسی لڑکیاں گھر اچھا چلاتی ہیں شوہر کی عزت کرتی ہیں۔" عادل بضد ہوا اور رامش بے حال۔

"ہاں بالکل روز تمہارے لیے کیک بیک کرے گی یا پکوڑے بنائے گی۔ پھر۔ بیسن اور انڈے منہ پر لگا لگا کر اسکن کیئر بھی کرے گی۔ یہ گنوار پارلر نہیں جاتیں۔ کھانے، پینے کا سامان منہ اور بالوں پر لگا کر کام چلا لیتی ہیں۔" اب کے کسی اور کزن نے کہا۔

"ہاں منہ بند رکھیں تو سب حسین ہے منہ کھول کر ساری اصلیت کھول دیتی ہے۔" بلال نے تاسف سے آہ بھری۔

رامش کو غصہ ان لڑکوں پر آنا چاہیے تھا مگر خود پر آ رہا تھا۔ وہ اپنا اسٹینڈرڈ کیسے بھول گیا۔ اسے معلوم ہونا چاہیے تھا کہ شمرین اس کے سرکل میں بُری طرح مس فٹ تھی۔ اس نے اپنے جلد باز فیصلے پر نظر ثانی شروع کر دی۔ اس رات ہی اس نے گھر پہنچ کر

سامان اٹھایا اور عمر کے پاس چلا گیا۔ اگلے دن وہیں سے اسلام آباد واپس چلا گیا۔ امیدوں کی نئی کونپلوں میں گھری شہزین کو سمجھ ہی میں نہیں آیا کہ ہوا کیا۔

☆☆☆

دو مہینے اور سترہ دن نعیم کی منگنی کو دو مہینے اور سترہ دن ہوئے تھے اور اتنی ہی مدت ہوئی تھی شہزین کو اپنے ذہن پر اعتبار کھوئے ہوئے۔ وہ دوپٹے پر لیس ٹانکتے ہوئے معاملات ٹٹولنے لگی۔ کیا اسے غلط فہمی ہوئی تھی؟ وہ والہانہ نظریں وہ والدین کو بھیجنے کی بات وہ نیا جوڑا دلانے کا اصرار۔ ٹانکہ لگاتے ہوئے سوئی اس کے ہاتھ پر چبھ گئی۔ اُسے آنسو بہانے کی وجہ مل گئی۔

فوزیہ ممانی کا سگا بھائی نہیں تھا ایک کزن کو وہ بھائی مانتی تھیں۔ اس توسط سے ان کی بھتیجی کی شادی تھی۔ ہاتھ سے لگنے والی لیسوں کی ذمہ داری شہزین پر تھی۔

"میرے بیٹے جتنا پڑھا لکھا شخص اُن کے پورے خاندان میں نہیں ہوگا بس یہی برداشت نہیں ہو رہا۔" فوزیہ فون پر بپھری ہوئی شیرنی کی مانند دھاڑیں۔

اب تو یہ روز کا معمول تھا۔ جب سے نعیم کی منگنی ہوئی تھی ایسے ہی گلے شکوے بھرے فون آتے تھے۔ نعیم کا مزاج صرف شرمیلا نہیں تھا۔ وہ اتنا بے ربط اور روکھا تھا کہ ایک بار مخاطب کر کے کوئی دوسری بات کرنے کی ہمت نہیں کر پاتا تھا۔ نعیم نظریں نہیں ملا پاتا تھا۔ گھبراہٹ میں انگلیاں مروڑتا رہتا تھا۔ اس کی منگیتر کی امیدیں تھیں کہ وہ اسے فون کرے۔ تنہا نہیں تو کم از کم دوستوں کے گروپ میں ملاقات کرے۔ سسرال کی دعوتوں میں حصہ لے۔ مگر نعیم ان سب سے بچنے کے بہت عذر بناتا تھا۔ وہ اجنبیوں میں غیر آرام دہ رہتا تھا۔ اس کی اس عادت نے متوقع سسرال کے ناک میں دم کر رکھا تھا۔

نازش کی امی پہلے فوزیہ بیگم کو فون کر کے گلے شکوے کرتی تھیں۔ مگر فوزیہ کے سمجھانے کے باوجود نعیم میں خاص تبدیلی نہیں آئی۔ نازش کی امی نے اب ان کے رشتہ داروں کو فون کر کے نعیم کی برائیاں شروع کر دیں اب تو پانی سر سے اوپر ہو گیا تھا۔ فوزیہ فون بند کر کے سیدھا بہزاد کے پاس گئیں۔

"یہ نازش کی امی نے اب ساری حدیں پار کر دی ہیں۔" "میرے کزن کی بیوی کو فون کر کے کہہ رہی ہیں کہ نعیم کو دماغ کے ڈاکٹر کو دکھانا چاہیے۔ میرا اتنا لائق فائق بیٹا ان کو ذہنی مریض لگتا ہے؟" فوزیہ نے فون پٹخا تھا۔

ساتھ والے کمرے میں شہزین اور شمسہ بیگم سب سن رہے۔ بہزاد صاحب بھی سوچ میں پڑ گئے۔ نعیم کا رویہ کسی طور پر نارمل نہیں تھا۔ مگر کیا اتنا ابنارمل ہو گیا تھا کہ ڈاکٹر کی ضرورت تھی؟

"کن سوچوں میں گم ہو گئے۔ اپنے بچے کا ساتھ دینے کے بجائے دوسروں کی باتوں "میں" آئیں گے؟ آپ سے تو کوئی توقع ہی نہیں کرنی چاہیے میں دوسرا رشتہ ڈھونڈنے لگی ہوں۔ نازش کی ماں کو بتاتی ہوں میرا نعیم کیسا ہیرا ہے۔" فوزیہ نے اگلا فون ڈائل کرنا شروع کر دیا۔

☆☆☆

سانپ سونگھ جانا وہ ردعمل تھا جو فوزیہ بیگم نے تب دکھایا تھا جب نازش کی طرف سے فون کر کے منگنی کے انکار میں پہل ہوئی تھی۔ صف ماتم بچھ جانا گھر کے اس ماحول کو کہتے ہیں جو متعدد رشتہ کروانے والیوں اور خاندان والیوں کی طرف سے انکار کرنے پر ہوا تھا۔ کوئی بھی نعیم سے رشتے کے لیے راضی نہیں تھا۔

فوزیہ نے سائیکاٹرسٹ سے نعیم کا علاج شروع کروا دیا تھا۔ مگر ناممتا کی عجیب بے کلی تھی۔ نعیم کی شادی کروانا ان کا اولین مقصد بن گیا تھا۔ وہ خاندان والوں کا منہ بند کرنا چاہتی تھیں۔ اس لیے کڑوا گھونٹ پینے کو بھی تیار تھیں۔

"اتنے سالوں سے آپ سرپرست ہیں اس لیے پہلا حق آپ کا بنتا ہے۔ پہلے آپ ہاں کر دیں

پھر اس کی دادی اور باپ سے بھی پوچھ لیں گے۔" بہزاد صاحب نے لاؤنج میں بیٹھی شمسہ بیگم کے گھٹنوں پر ہاتھ رکھ کر درخواست کی۔

صوفے کے قریب بیٹھی فوزیہ بیگم تلملا گئیں۔ نعیم کے لیے شہرین کا رشتہ ان کی رضامندی سے مانگا جارہا تھا۔ لیکن شہرین کو اتنی عزت دینا ان سے برداشت نہیں ہو رہا تھا۔

"اس کا باپ سر کے بل چل کر آئے گا اتنے بڑے گھر کی بہو بنانے کا اُن نے خواب میں بھی نہیں سوچا ہوگا۔" فوزیہ کے چہرے پر فرعونیت کے تمام آثار تھے۔

"آپ شہرین سے پوچھ کر تسلی کرلیں پھر میں رضوان بھائی کو فون کرتا ہوں۔" بہزاد صاحب ماں کے پہلو سے اُٹھ کر پھر بیوی کے پاس بیٹھے۔

"شمسہ بیگم نے تو عقل مانگ لیے تھے۔ ان کی دیرینہ خواہش تھی کہ شہرین کی کھاتے پیتے گھر میں جائے۔ نعیم کم گو تھا۔ مگر شریف بچہ تھا اور کمائی بھی اچھی تھی۔

"اس نے کہاں انکار کرنا ہے۔ میری عطیہ کی نشانی میری آنکھوں کے سامنے رہے گی رب تیرا شکر ہے۔" شمسہ بیگم نے احسان مندی سے کہا۔

ان کی خوشی دیکھ کر فوزیہ بیگم بھولنے لگی تھیں کہ شہرین کو بہو بنانے کا آئیڈیا ان کا اپنا تھا۔ شہرین اس ہی وقت لاؤنج میں داخل ہوئی۔ اس نے صبح پلاسٹک کے پھول دھوئے تھے اب وہ گلدانوں میں لگا رہی تھی۔ شمسہ بیگم نے نگاہوں سے ہی نظر اتاری۔ اب وہ یہ ہی سب اس گھر کی بہو کی حیثیت سے کرے گی۔ فوزیہ نے بھی شہرین کو سر سے پاؤں تک دیکھ کر دل میں شکر کیا۔ ایسی حسین اور خاندان کی لڑکی نعیم کی دلہن بنے گی تو سب کے منہ کو تالے لگ جائیں گے۔

"شہرین بیٹا! آپ سے ایک بات پوچھنی ہے آپ کی امی ہوتیں تو یہ کام وہ کرتیں۔ میں اور آپ کی مامی نعیم سے آپ کی شادی کرنا چاہتے ہیں۔" بہزاد صاحب نے ڈائریکٹ پوچھ لینا مناسب سمجھا۔

شہرین کی صورت ہاتھوں میں تھامے پھولوں جیسی ہوگئی۔ خوشبوؤں سے عاری مصنوعی دکھاوے جیسی۔

"ماموں.......لیکن......" اس کا ذہن تیزی سے حساب کرنے لگا۔ منگنی کو چھ ماہ ہو چکے تھے ہاں اس سے کچھ کم۔ کیا وقت گزر چکا تھا؟ ممکن تھا کہ رامش بھول گیا ہو۔ گھر والوں کو قائل کر رہا ہو۔ کیا اس سب کے لیے اتنا عرصہ درکار ہوتا ہے؟

"تمہاری دادی کو بھی فون لگاتی ہوں۔ رضوان کو کہتی ہوں چند ماہ تجھے واپس لے جائے۔ رخصتی باپ کے گھر سے ہو۔ یہاں تو اب عمر بھر رہنا ہے۔" شمسہ بیگم بہت خوش تھیں۔

شہرین کا ماتھا ساری عمر پر ٹھنکا۔ رامش کا خیال یکسر ذہن سے نکل گیا۔ یہ پتھر کی دیواریں اور اس سے بھی زیادہ پتھریلے رویے۔ کیا ساری عمر یہاں رہنا کسی سزا سے کم ہوگا۔

"نہیں ماموں! میں یہ شادی نہیں کروں گی۔" اس نے تڑپ کر کہا۔

فوزیہ شاک میں آگئیں، ہوش میں ہوتیں تو اس کی چٹیا مروڑ دیتیں۔

"کیا کہہ رہی ہو، یہ بچیوں کے بولنے کے معاملے نہیں۔ میں ہوں تمہارا باپ زندہ ہے ہم فیصلہ کریں گے۔"

شمسہ بیگم نے فوراً آنکھیں دکھائیں۔ اب یہ اس کا ہونے والا سسرال تھا۔ ایسی باتیں تمام عمر یاد رکھی جاتی ہیں۔

"آپ بہت اچھی ہیں نانی۔ مگر جس باپ کا آپ حوالہ دے رہی ہیں وہ خیر خبر بھی مہینے بعد پوچھتا ہے۔ یہ معاملہ میری زندگی کا ہے۔ میں دوسری عطیہ نہیں بننا چاہتی۔" یہ کہہ کر وہ ڈھیٹ بنی کھڑی رہی۔

بہزاد خاموش تھا مگر اس کی سوچ فوزیہ سے ملتی تھی۔ کیا اب نعیم اس لائق بھی نہیں رہا۔ بہت دیر تک کوئی کچھ نہ بول سکا تو شہرین بھی خاموشی سے چلی

گئی۔

☆☆☆

اس نے خود کو بہت وقت دیا تھا۔ ان چھ مہینوں میں ایک دن بھی ایسا نہیں تھا جب اُسے شہرین کا خیال نہ آیا ہو۔ وہ دور رہ کر حالات اور اپنے جذبات پرکھنا چاہتا تھا۔ کہیں کسی جلد بازی کے فیصلے میں وہ خود کو اور شہرین کو مشکل میں نہ ڈال دے۔ اس کی ساری پریشانیوں کا حل تھا تو نیلوفر کے پاس تھا۔

نیلوفر کاٹن کی پرنٹڈ ساڑھی پہن کر آئینے کے سامنے کھڑی تھیں۔

"یہ کس کی شادی کا کارڈ ہے؟" رامش نے ٹیبل سے کراچی کے ایڈریس والا کارڈ اُٹھایا۔

"میرے کزن کی بیٹی کی شادی ہے۔ اس کی بیوی شگفتہ خاندان کی سیلف امپوزڈ (خود ساختہ) صدر ہے۔ بہت چالاک عورت ہے۔ سوچ رہی ہوں چلی جاؤں ورنہ فون کر کے سنائے گی۔"

نیلوفر آئینے سے ہٹی۔

"آپ جائیں تو شگفتہ آنٹی کے بجائے فوزیہ آنٹی کے یہاں ٹھہر سکتی ہیں؟" رامش نے سنجیدگی سے کہا۔

"تم نے تو الماس کے لیے منع کر دیا تھا۔" نیلوفر نے یاد کروایا۔

"میں الماس کی نہیں شہرین کی بات کر رہا ہوں میں چاہتا ہوں آپ دیکھ لیں وہ میرے لیے سوٹ ایبل ہے کہ نہیں۔" رامش نے اب ماں سے کچھ نہیں چھپایا۔

"میں عطیہ کو جانتی تھی۔ وہ اچھی عورت تھی مگر اس کے بچے ددھیال پر گئے ہیں۔ ان کا مائنڈ سیٹ ہی فرق ہے۔" نیلوفر نے نرم مگر دوٹوک انداز میں کہا۔

"وہ مجھے اچھی لگتی ہے۔ پلیز، اُسے دیکھ تو آئیں۔" رامش نے ضد کی۔

"اوکے فائن، میں شگفتہ کے گھر ہی ٹھہروں گی۔ شادی پر شہرین سے مل لوں گی۔ مگر تم کوئی جلد بازی نہ دکھانا پرامس؟" نیلوفر نے بیٹے کو پچکارا۔

☆☆☆

فوزیہ کا تو سانس ہی قابو میں نہیں آ رہا تھا۔ ذرا جو حواس ٹھیک ہوئے وہ شہرین کا منہ نوچ لیتیں۔

"امی! حوصلہ رکھیں اور اتنی جلد بازی نہ کریں بھائی کا تھوڑا علاج ہونے دیں۔ انہیں سوشل انگزائٹی کا مسئلہ ہے۔" الماس نے پانی پلاتے ہوئے ماں کو سمجھایا۔

"ایک پلاسٹک کی چپل میں آئی تھی ہمارے گھر اور جو کوٹ شوز لائی تھی اس کے آدھے موتی اترے ہوئے تھے۔ کیا سمجھتی ہے کوئی شہزادہ بیاہنے آئے گا۔ اُسے اپنے باپ کی طرح دکان دار ملے گا جو ہر گاہک کی جی حضوری کرتا ہے۔ میرے بیٹے کو انکار کر دیا۔" فوزیہ نے غٹا غٹ پانی پیا۔

الماس نے ماں کی گردن پر مساج شروع کر دی اُسے رامش کے اچانک جانے سے زندگی کی کچھ سمجھ میں آ گئی تھی۔

"پہلے بھی نعیم کو چھوڑ دیا تھا کہ خود ہی ٹھیک ہو جائے گا۔ اب میں یہ سب نہیں کر سکتی۔ اسے ایک ساتھی کی ضرورت ہے۔ میں جو چاہے کہوں یہ جانتی ہوں شہرین شوہر کی ہو کر رہنے والی ہے۔ کوئی اور آئی تو اپنی پارٹیاں اپنے کپڑے جوتے کی فکر میں میرے بچے کو توجہ نہیں دے گی۔ شادی تو میں اس کی شہرین سے ہی کرواؤں گی تم دیکھ لینا۔" (اب فوزیہ سوچ رہی تھی۔)

"وہ انکار کر چکی ہے۔ دادی صبح سے اسے سمجھا رہی ہیں۔ وہ ایک ڈیل کے بدلے میں چار وجوہات پیش کر رہی ہے۔ اسے بھائی کی دلہن بننے سے نہیں آپ کی بہو بننے سے انکار ہے۔" الماس ہر طرف کی خبر رکھتی تھی۔

"یہ تو اچھا ہے۔ اسے نعیم سے کوئی مسئلہ نہیں۔ ایک بار شادی ہو جائے وہ نعیم کو دل و جان سے اپنا لے گی۔" فوزیہ بیگم کی باچھیں کھل گئیں۔

"مگر شادی کیسے ہوگی۔ اس کی دادی باپ کو بیچ

میں لانے کی غلطی مت کرنا۔ ہمارا وہ پھر لحاظ کرلیتی ہے۔"

"میں شگفتہ سے کہلواؤں گی۔ اس کا رعب ہی اور ہے، اس کو انکار کرنے والا کوئی پیدا نہیں ہوا۔ ایسا زندگی موت کا مسئلہ بنادے گی کہ شہرین کو ماننا پڑے گا۔" فوزیہ کا چہرہ چمک اٹھا۔

"سوچ لیں ماما۔" الماس کو خطرہ محسوس ہورہا تھا۔

"اس بار میں انکار کی کوئی گنجائش نہیں چھوڑوں گی۔ شگفتہ کی بیٹی کی مہندی ہے۔ فنکشن کے بعد میں اسے نعیم کی بات ڈسکس کرنے کے لیے اپنے گھر لے آؤں گی بلکہ شہرین کے باپ اور دادی کو بھی شرکت کے لیے بلوالیتی ہوں۔ جب ہم گھر واپس آئیں گے تو پورے گھر میں صرف شہرین اور نعیم ہوں گے۔ شگفتہ تو رائی کا پہاڑ بنانے میں ماہر ہے۔ دونوں پر الزام لگے گا تو شہرین کا باپ میرے پیروں میں گر کر بیٹی کا رشتہ دے گا۔" فوزیہ سوچ کر ہی پیر ہلانے لگیں۔

"یہ سب کیا ایسے ہی ہوجائے گا۔ جیسے آپ چاہ رہی ہیں؟" الماس کو ڈر لگ رہا تھا۔

"بالکل ہوگا۔ زیتون کو کچھ دے کر منالیتی ہوں۔ پرانی ملازمہ ہے انکار نہیں کرے گی۔ شہرین تو اماں کے کمرے میں ہی ہوگی کسی بہانے سے نعیم کو وہاں بھیج کر باہر سے کنڈی لگادے۔ ہم پہنچیں گے اور دونوں کو رنگے ہاتھ پکڑیں گے۔ چنگاری کو آلاؤ شگفتہ بنائے گی مجھے تو گھی ڈالنا بھی نہیں پڑے گا۔"

فوزیہ اتنی پر یقین کہ اس وقت نکاح کا ہال تک کروالیں مگر ابھی شادیانے بجانے کا نہیں جال پھیلانے کا وقت تھا۔ انہوں نے اُٹھ کر شہرین کی دادی کو فون ملایا اور اتنی مٹھاس سے شادی میں شرکت کی دعوت دینے لگیں کہ دادی جیسا لاوا بھی ندی بننے لگا تھا۔

☆☆☆

شہرین کو شادی میں نہ لے جانا فوزیہ بیگم کے پلان میں شامل نہیں تھا۔ اچھا ہی ہوا شہرین نے خود ہی انکار کردیا۔ دادی اور رضوان کے آنے کے بعد وہ ویسے بھی پریشان تھیں۔ ان کے نکلنے تک نعیم واپس نہیں آیا تھا۔ گھر میں زیتون اور شہرین تھیں ان کی واپسی سے پہلے نعیم آجاتا اور زیتون ان کے پہنچنے سے پہلے کسی بہانے انہیں کمرے میں بھیج دیتی۔ سب کچھ متوقع سمت میں گیا۔ ہال میں فوزیہ نے شہرین کی دادی اور باپ کی خوب تواضع کی، انہیں وی آئی پی بنائے رکھا۔ الماس انہیں پلیٹوں میں کھانا ڈال کر دیتی رہی۔ اتنی عزت تو الیکشن جیتنے والے کو نہیں ملتی۔

فنکشن پر ہی فوزیہ اور نیلوفر کی بھی ملاقات ہوئی الماس کو تو وہ بھولی بیٹھی تھیں۔ اب دوبارہ امید تازہ ہوگئی۔ نیلوفر شہرین سے تو نہیں مل سکی تھی مگر اس کی دادی نے بتایا تھا۔ شہرین کا بھائی کینیڈا میں بڑی اچھی نوکری کررہا ہے۔ گھر کا ماحول اب نئی نسل سے چلتا تھا۔ اگر شہرین میں کوئی بڑا مسئلہ نہیں تھا تو سوچا جاسکتا تھا۔

رخصتی کے بعد جب شگفتہ نے فوزیہ کے گھر جانے کی اطلاع دی تو نیلوفر بھی اپنے شوہر کو لیے فوزیہ کی طرف چل دی۔ گھر کے باہر گاڑی سے اترتے ہی اس نے زیتون کو فون کرکے پوچھ لیا تھا۔ کام ہوگیا تھا۔

"زیتون لگتا ہے اپنے کوارٹر میں چلی گئی ہے۔ میں ہی تالا کھول دیتی ہوں۔" ماحول کو مشکوک بنانے کے لیے زیتون نے کنڈی لگا کر لائٹس بھی بند کردی تھیں۔ فوزیہ نے گیٹ کھولا پھر مین دروازے کا تالا کھولتے ہوئے ہی اُسے شہرین کے دروازہ پیٹنے کی آوازیں آرہی تھیں۔ سب اندر آئے تو یہی سنا کہ شہرین دروازہ پیٹ کر زیتون کو پکار رہی تھی۔

"شہرین نے خود کو کمرے میں کیوں بند کرلیا۔" فوزیہ نے جلتی میں تیل ڈالا۔

شگفتہ نے فوراً بڑھ کر دروازہ کھول دیا اور پریشانی میں دو قدم اندر جا کر سارا منظر بھی دیکھ لیا۔

"یہ کیا بے ہودگی ہے۔ فوزیہ تم تو آنکھیں بند کر کے رہتی ہو۔ نند کی بچی کی ذمہ داری لی تھی تو پورا کرتیں یہ کیا شتر بے مہار چھوڑ دیا ہے۔"
شگفتہ چلائی۔

عام دنوں میں فوزیہ بھی ترکی بہ ترکی جواب دیتی مگر اب کے شگفتہ کا غصہ اس کے حق میں تھا۔

"کیا ہوا بھابھی؟ شمرین۔" فوزیہ پکارنے لگی۔

ڈر کے مارے دونوں کمرے سے نہیں نکلے۔

"بچیوں کو مہندی کے فنکشن کا شوق ہی بہت ہوتا ہے پھر بھی اگر وہ گھر رہنا چاہتی تھی تو پوچھنا تھا کہ کن ملاقاتوں کے غرض رہنا چاہتی ہے۔" شگفتہ نے کانوں کو ہاتھ لگایا۔

فوزیہ کا سینہ خوشی سے پھولا وہ یہی تو چاہتی تھیں الزام شمرین پر آجائے۔ اب تو ناک رگڑ کر نکاح پڑھوایا جائے گا۔

رضوان تو مٹی کا پتلا تھا۔ بہزاد سے برداشت نہیں ہوا، وہ اندر جا کر کلائی پکڑ کر روتی ڈری سہمی شمرین کو باہر لے آئے۔ وہ خود غصے سے آگ بگولا ہو رہے تھے۔ شمرین کے پیچھے ایک لڑکا تھا۔ کسی بھی کنوارے لڑکا لڑکی کا بند کمرے سے باہر نکلنا اتنی ہی بڑی بات تھی کہ کسی نے غور نہیں کیا کہ کنڈی اندر سے نہیں باہر سے لگی ہوئی تھی۔ شمرین کو دیکھ کر سب ہی سنگسار کرنے کا ارادہ رکھتے تھے۔ اصل کھلبلی تو تب مچی جب اس کے پیچھے سے کمرے سے رامش برآمد ہوا۔

"رامش! تم کراچی میں؟" نیلوفر چکرا کر گرنے کے قریب تھیں کہ ان کے شوہر نے سہارا دیا۔

شمرین کی دادی صوفے پر گریں اور شمسہ بانو کی آنکھوں کے آگے اندھیرا چھا گیا۔ مگر سب سے بُری حالت فوزیہ کی تھی۔

"ہائے اللہ! یہاں رامش کہاں سے آگیا۔" وہ تو ماتھا پیٹنے لگیں۔

"میں صرف بات کرنے آیا تھا مجھے نہیں معلوم کنڈی کس نے لگائی میرا یقین کریں۔" رامش ماں کو وضاحت دینے لگا۔

"ماں باپ کو بغیر بتائے اسلام آباد سے کراچی پہنچ گئے۔ چھپ کر ملنے آگئے اور کہتے ہو اعتبار کریں۔ ارمان سنبھلتے نہیں تو جائز طریقے سے پورا کرو۔" شگفتہ نے وہی کہا جو اُس سے اُمید تھی۔

یہاں تو فوزیہ کا دہرا نقصان ہو رہا تھا۔ اتنے میں اوپر سے نعیم سیڑھیاں اترتا نیچے آیا۔ وہ گھر پر ہی تھا۔ مگر اُس کی غلطی میں زیتون نے رامش کو کمرے میں بند کر دیا تھا۔

"دیکھیں، نعیم بھی گھر پر ہے۔ ایسا کچھ نہیں کہ بچہ بچی اکیلے تھے۔ زیتون بھی آ گئی۔ دونوں کو سزا دینا ٹھیک نہیں۔ بچے ہیں۔ رامش کہہ رہا ہے وہ صرف بات کر رہے تھے۔" فوزیہ نے شگفتہ کو تسلی دے کر ٹھنڈا کرنا چاہا۔

"بھائی صاحب! ماں مری مگر باپ زندہ تھا۔ یہ عمر نازک ہوتی ہے۔ آپ کو اپنی بچی کو غیروں میں نہیں بھیجنا چاہیے تھا۔ اب کون کرے گا اس سے شادی۔ بدنامی الگ۔" شگفتہ نے رضوان کو ہی آنکھیں دکھائیں۔

رضوان نے آگے ہو کر شمرین کے منہ پر تماچا مارنا چاہا مگر بہزاد اس کی ڈھال بن گیا۔

"آپ لوگ کیوں نہیں سمجھ رہے میں پہلے بھی اس گھر میں رہتا رہا ہوں۔ ایسی کوئی بڑی بات نہیں میری کئی لڑکیوں سے دوستیاں ہیں۔ اس میں غلط مطلب کیوں نکال رہے ہیں؟" رامش نے پھر آواز بلند کی۔

"یہ انگریزی اطوار تمہارے ہوں گے ہم تو اپنی بچیوں کو نامحرموں کے سائے سے بھی دور رکھتے ہیں۔ ان میں سے نہیں جو سالوں بے نام رشتے رکھیں۔ اگر رتی بھر شرافت بھی ہے تو نکاح کرلو۔" شگفتہ اکیلی ہر جنگ کے لیے کافی تھی۔

"نہیں ہر گز نہیں۔" فوزیہ نے تڑپ کر کہا

سب اُسے حیرت سے دیکھنے لگے۔

"میرا مطلب بچوں کے ساتھ زیادتی ہے۔ان کی مرضی بھی ہونی چاہیے۔ہم بڑوں کو ان کی نادانی نظر انداز کرنی چاہیے۔" فوزیہ نے وضاحت دی۔

رضوان نے ہاتھ جوڑ لیے۔اس کے چہرے کی بے چارگی کہہ رہی تھی وہ پاؤں پڑنے کو بھی تیار ہے۔ مگر فوزیہ کے نہیں نیلوفر کے۔

"ہم بہت سادہ لوگ ہیں۔ہم بدنام ہوجائیں گے۔آپ اسے قبول کرلیں۔" رضوان نیلوفر سے گڑگڑا رہا تھا۔

"ابا! میں نے کچھ نہیں کیا۔ وہ صرف بات کرنے آیا تھا۔ہم دو منٹ کے لیے کمرے میں گئے تھے۔کسی نے باہر سے کنڈی لگادی۔" شہزین نے باپ کے انہی ہاتھوں کو تھاما۔جن سے وہ ابھی مارنے والا تھا۔

الماس زیتون کو لے کر سائیڈ پر چلی گئی۔اس ساری گڑبڑ سے اس کا سر چکرانے لگا تھا۔زیتون نے کمرے کی کھڑکی پھنسادی تھی اور شہزین سے کہا تھا کہ نعیم سے کھلوالے۔رامش خاموشی سے ملنے آیا تھا۔یہ بات زیتون کو معلوم نہیں تھی۔اس نے کمرے میں دو افراد دیکھے تو یہی سمجھا نعیم اور شہزین ہیں۔اس نے کنڈی لگا کر اپنا فرض پورا کردیا۔ یعنی رامش چھپ کر اکیلے ملنے آیا تھا۔وہ پچاس فیصد کے گناہ گار تھے اس ہی لیے الزام سہہ رہے تھے۔

"صابر ماں کی خدمت گزار بیٹی ہے۔میری شہزین اور آپ کے بیٹے کو پسند بھی ہے ورنہ یوں چھپ کر ملنے نہ آتا۔یہ صورت حال نہ ہوتی تو بھی ان کی جوڑی کوئی ایسی بے جوڑ نہیں تھی۔ٹھنڈے دل سے سوچو!" شمسہ بانو نے نیلوفر سے کہا۔

"آپ لوگ بچوں کے پیچھے پڑ گئے ہیں۔" پندرہ منٹ ہوئے ہوں گے زیتون کو کوارٹر گئے ہوئے پندرہ منٹ میں عمر بھر کی سزا نہ سنائیں۔" فوزیہ بیگم پھر بولیں۔

"سزا کیسی کوئی لولی لنگڑی نہیں ہے میری پوتی اس کا بھائی کینیڈا میں نوکری پر لگا ہے۔وہ گھر بیٹھی تھی یہ لڑکا ملنے آیا ہے۔دونوں کو پسند ہے تو پڑھوالو نکاح۔بڑی بات کیا ہے۔" دادی مخصوص کاٹ دار آواز میں بولیں۔

سب ہی خاموش ہوکر شکل دیکھنے لگے۔بڑی بات یہ نہیں تھی کہ دونوں کی شادی ہوجائے، بڑی بات یہ سچویشن تھی جو بن گئی تھی۔نیلوفر ویسے رشتہ کریں تو کوئی حرج نہں تھا۔اب بیٹے کی کرتوت چھپانے کے لیے بہو بیاہنا سراسر توہین تھا۔

رامش جذباتی انسان تھا اُس سے رہا نہیں گیا اس نے لینڈ لائن پر کال کر کے شہزین کو اپنی ماما کی آمد کی اطلاع دی تھی۔مگر ان چھ مہینوں کی خاموشی نے شہزین کے ارمانوں کی کونپلیں بھسم کر دی تھیں۔اس نے سوچنے کا وقت مانگا۔رامش نے ان چھ مہینوں میں ایک بار بھی نہیں سوچا تھا کہ شہزین پر کیا گزر رہی ہوگی۔اسے لگا تھا اس کے فون آنے پر وہ خود کو بنا سنوار کر اس کی ماں کے سامنے پیش کردے گی۔یہ اس کی بھول تھی۔رامش کو اپنی غلطی کا احساس ہوا وہ فلائٹ پکڑ کر فوراً کراچی اپنے دوست کی طرف آ گیا۔شہزین شادی پر نہیں گئی۔اس نے مل کر بات کرنے کا ارادہ کیا۔رامش جب آیا تو نعیم کچن میں تھا۔رامش کمرے کی کھڑکی ٹھیک کرنے چلا گیا۔نعیم کے جانے کے بعد شہزین رامش کی خبر لینے گئی۔وہ لاؤنج میں بیٹھ کر بات کرنے کا ارادہ رکھتے تھے اس میں کوئی مضائقہ نہیں تھا۔ایسا پہلے بھی ہوتا رہا تھا۔ لیکن شہزین کے اندر جاتے ہی باہر سے کنڈی لگ گئی اور اب نتیجہ سامنے تھا۔اب جب نکاح کی بات چلی تو رامش کو محسوس ہورہا تھا ایسی زبردستی پر وہ جان دے دیتا مگر نکاح نہ پڑھواتا۔

"یہ میری ہی بیٹی ہے، میں اس کا ولی ہوں آپ مجھے سالوں سے جانتے ہیں۔میں آپ سے اپنی بیٹی کی شادی کی درخواست کررہا ہوں۔یہ بات چھپنے والی نہیں ہے۔خاندان میں طرح طرح کی

باتیں ہوں گی۔ میری بہن کی روح تڑپے گی۔ پھر آپ کا بیٹا بھی تو راضی ہے۔ وہ خود ملنے آیا تھا۔"

اس بار بہزاد صاحب بولے تھے۔ ان کا تدبر اور متانت کے سب ہی قائل تھے۔ سب چپ ہو کر سنجیدگی سے سوچنے لگے۔ فوزیہ کے اعتراضات سے کسی کے کان پر جوں تک نہ رینگی۔ بہزاد صاحب سب کو صوفوں پر بٹھانے میں کامیاب ہو گئے۔ روتی ہوئی شہزین کمرے میں چلی گئی اور رامش پیر پٹختا اوپر گیسٹ روم میں۔

☆☆☆

فیصلہ ہو گیا تھا۔ کل عصر کے وقت ولیمے سے پہلے ان کا نکاح طے ہوا تھا۔ باقی معاملات بعد میں طے ہو جائیں گے۔ شادی کی تمام ذمہ داری بہزاد صاحب نے لے لی تھی۔ وہ اپنے گھر سے شہزین کو رخصت کریں گے۔ نیلوفر کے لیے یہ ہی کافی تھا۔ منہ ملاحظے والا اسم حیانہ مل گیا تھا۔ مگر اس الزام نے ماحول کا ستیاناس کر دیا تھا۔ سارا معاملہ طے کر کے نیلوفر رامش کے پاس آئیں۔

"میں نے کہا تھا کہ جذباتی نہ ہونا۔" اس نے چھوٹتے ہی کہا۔

"ماما! میں بس ایک بار ملنا چاہتا تھا۔" رامش نے سر پکڑا۔

"میں مانگتی تو وہ رشتے سے کبھی انکار نہ کرتے لیکن یہ کیا شادی ہے؟ بدنامی ہے سراسر۔" نیلوفر کا سانس پھولا ہوا تھا۔

"میں یوں نکاح نہیں کروں گا۔ ہر ایک میرے کردار پر شک کر رہا ہے۔" رامش نے غصے سے کہا۔

"پھر خود پر قابو رکھنا تھا۔ میں تو سمجھی تھی معصوم سی چھوٹے شہر کی بھولی لڑکی ہو گی۔ یہ تو لڑکوں کو ملاقاتوں کے لیے بلا رہی ہے۔ اُف!" نیلوفر سمیت اس رشتے میں کسی کی خوشی باقی نہیں تھی۔ مگر سب کی مجبوری تھی سو رضامندی تھی، رامش ماں کا منہ تکتا رہ گیا۔

☆☆☆

شہزین نے کمرے میں آ کر ایک آنسو بھی نہیں بہایا۔ اس نے رامش کا نمبر معلوم کر کے اسے کال کی رامش نے نہیں اٹھائی۔ پھر اس نے میسج کیے جن کا جواب نہیں آیا۔ نکاح کا سن کر شہزین بے چین ہو گئی۔ وہ آہستگی سے پچھلے لان کی طرف نکل گئی۔ گلی میں لالٹین روشن کر کے اس نے کھڑکی کی طرف دیکھا۔ رامش وہیں کھڑا تھا۔

ایک معصومانہ محبت کی ملاقات اس قدر بدصورت انجام کو پہنچے گی، وہ نہیں جانتا تھا۔ رامش دروازے سے نکل کر راستہ صاف ہونے کا یقین کرنے لگا۔ ابھی وہ پہلی سیڑھی اترا تھا تو الماس اپنے کمرے سے نکل کر باہر آ گئی۔

"کون سی بات ادھوری رہ گئی تھی جواب کرنی ہے۔" الماس پھنکاری۔

"تم تو ماڈرن لڑکی ہو۔ آج کل سب ساتھ اُٹھتے بیٹھتے ہیں اٹ از نو بگ ڈیل۔" رامش نے شدت سے جواب دیا۔

"کمال بات ہے۔ تمہیں بگ ڈیل نظر نہیں آ رہی۔ اس نے اکیلے گھر میں بہت طریقے سے تمہیں بلوایا پھر کمرے میں بند کروا کر تماشا لگوایا، اس کے باپ نے ہاتھ جوڑ کر سیدھا نکاح فکس کروا لیا۔ تمہیں اب بھی ٹریپ سمجھ میں نہیں آ رہا؟" الماس اس کے بالکل سامنے آ گئی تھی۔

"ایسا نہیں ہے۔ اسلام آباد سے ٹکٹ میں نے کٹوائی تھی۔" رامش نے غصے سے کہا۔

"کس کے کہنے پر کٹوائی تھی؟" الماس نے دھونس سے پوچھا۔

رامش کو یاد آیا۔ شہزین نے چھ مہینے کی بے اعتنائی کا گلہ کیا تھا۔ اس لیے وہ اپنی سنجیدگی ثابت کرنے کراچی آ گیا تھا۔

"معصوم چہروں کے پیچھے بھی بہت کچھ ہوتا ہے۔ غربت سے نکلنے کا ون وے ٹکٹ کوئی مس نہیں کرتا۔ اس کے لیے محبت اور مظلومیت کے ڈرامے

کرنا کون سا مہنگا کام ہے۔" الماس اس کے کانوں میں زہر گھول کر مسکراتی ہوئی چل دی۔

رامش کمرے میں پلٹ آیا تھا۔ ایک بار پھر اسے شہزرین پر سوالیہ نشان نظر آیا تھا۔ اس نے کھڑکی میں کھڑے ہو کر باہر دیکھا۔ شہزرین اب بھی اس کی منتظر تھی۔ وہ نکاح کرے گا۔ اپنی غلطی کو گناہ نہیں بنائے گا۔ لیکن اگر شہزرین نے یہ جان کر کیا تھا تو اس کو رامش کی سردمہری بھگتنی پڑے گی۔ رامش نے ہاتھ بڑھا کر کھڑکی بند کر دی۔ اس نے موبائل پر میسج دیکھے مگر جواب نہیں دیا۔

شہزرین کو سننے کی ضرورت نہیں تھی، وہ رامش کی نگاہوں میں بے اعتباری دیکھ چکی تھی۔ وہ تو آئی تھی کہ رامش اسے حوصلہ دے گا مستقبل اچھا ہونے کا یقین دلائے گا مگر وہ پل بھر میں پھر بدل گیا تھا۔ باپ کا غصہ، خاندان میں بدنامی، عزت پر حرف، ماں کی تڑپتی روح اتنا کچھ اس نے اس ہی رات دیکھا تھا مگر سب سے دل خراش رامش کی بے اعتنائی تھی۔ وہ اندھیری گلی میں وفا کا دیپ جلائے اس کا یا اس کے فون کا انتظار کرتی رہی، وہ نہیں آیا۔

☆☆☆

"شہزرین بی بی گھر پر نہیں ہیں۔" زیتون نے اس ڈر کی تصدیق کی جو شمسہ بانو کی جان نکال رہا تھا۔ وہ صبح کمرے میں نہیں تھی۔ انہیں لگا کاموں میں مصروف ہو گی مگر کتنے ہی لوگوں نے حاضری دے دی شہزرین کا کچھ اتا پتا نہیں تھا۔

"وہ کہتی رہ گئی، وہ بے قصور ہے۔ کوئی نہیں مانا۔ کیا شادیاں ایسے طے ہوتی ہیں جیسے سزا سنا رہے ہوں؟" وہ ہانپتے چلاتے ہوئے ناشتے کی میز تک آئی تھیں۔ نیلوفر اور رامش بھی موجود تھے۔

"تم تو بچی پر ہاتھ اٹھانے لگے تھے جبکہ انگلی تم پر اٹھنی چاہیے تھی۔ نہ میری بیٹی کو سکھ دے سکے نہ اپنی اولاد کو تحفظ دے سکے۔ چلی گئی ہے شہزرین گھر چھوڑ کر۔" وہ رضوان سے مخاطب تھیں مگر سنا سب نے تھا۔

"یہ نکاح تو اس کی مرضی سے ہو رہا تھا۔" بہزاد شہزرین کو کال کرنے لگے۔

"سزا سنانے کی سب کو جلدی تھی۔ قصوروار ڈھونڈنا تھا تو وہ ڈھونڈتے جس نے باہر سے کنڈی لگائی تھی۔" شمسہ بانو روہانسی ہو کر میز پر جھک گئی تھیں۔

فوزیہ نے سکون کا سانس لیا خس کم جہاں پاک۔ سب شرمندہ تھے۔

رامش کو اعتبار آ گیا تھا کہ پچھلی رات حادثہ ہوا تھا۔ اس کا دل تڑپ کر محبت کی گواہی دینے لگا۔ اسے شہزرین سے محبت تھی۔ اتنی کہ اسے پروا نہیں تھی شہزرین کا رہن سہن اٹھنا، بیٹھنا کیا ہے۔ وہ ٹریڈمل پر تو لپے سکھائے یا پھلوں کے چھلکے منہ پر رگڑے۔ لیکن اب شاید دیر ہو چکی تھی۔

☆☆☆

تین ہفتے گزر گئے تھے۔ شہزرین سے کسی کا رابطہ نہیں تھا۔ اس کا فون بند تھا۔ سب کو لگا تھا۔ وہ خیرپور واپس چلی گئی ہے مگر وہ وہاں نہیں پہنچی تھی۔ رامش ہر جگہ اسے ڈھونڈتا پھر رہا تھا۔ کینڈل بیچنے والی دکان سے لے کر اس کی اسکول کی سہیلیوں تک کو اپنا نمبر دے آیا تھا۔ مگر کوئی بھی تو اس کا اپنا نہیں تھا۔ اس ہی لیے وہ گم ہوئی تھی۔ وہ رابطہ کرتی تو اپنے ماموں سے کرتی۔ یہ تکلیف دہ احساس رامش کو بے چین کیے ہوئے تھا۔

اسلام آباد آ کر بوجھل قدموں سے راستہ ناپتا وہ شانزے کے اپارٹمنٹ پر پہنچا تھا۔

"تم؟ یہاں؟" شانزے یوں حیران ہوئی جیسے کوئی بھوت دیکھ لیا ہو۔

"پہلی بار تو نہیں آیا یا تم سے اکیلے ملنے پر بھی کوئی الزام لگ جائے گا؟" رامش نے جل کر کہا، وہ فون پر پہلے ہی اسے سب بتا چکا تھا۔

"اندر آؤ، میں تو تمہاری واپسی پر حیران تھی......" شانزے راستہ چھوڑ کر کھڑی ہو گئی۔ کچھ دیر بعد اس نے گرم پانی کا ایک کپ رامش کے سامنے

رکھا اور خود صوفے پر بیٹھ گئی۔

"اب بتاؤ یہ مجنوں کیوں بنے پھر رہے ہو؟" شانزے نے اُسے افسردگی سے دیکھا۔

"وہ کسی مشکل میں نہ پڑ گئی ہو۔ اُسے ہم میں سے کسی پر اعتبار نہیں تھا۔ کسی سے رابطہ نہیں کیا۔" اس نے جیب سے کشمیری چائے کا پیکٹ نکال کر کپ میں ڈالا۔

"تم سے جب رابطہ کیا تھا تم نے فون نہیں اٹھایا تھا۔ اب مت پچھتاؤ۔ وہ ٹھیک ہوگی۔ اس گھٹن زدہ زندگی سے نجات ملی۔ خود اپنے طور پر دنیا دیکھے گی تو اس سے بہتر ہی زندگی گزارے گی جو وہاں گزار رہی تھی۔" شانزے کے لیے یہ سب کہنا بہت آسان تھا۔

رامش خاموشی سے چائے پینے لگا۔

"تمہیں افسوس ہو رہا ہوگا تم نے ہیرو بننے کا موقع گنوا دیا۔" شانزے جھوٹی تسلی دینے کے موڈ میں نہیں تھی۔

"میں نے اس کو سمجھنے میں دیر کر دی اور خود کو سمجھنے میں اس سے بھی زیادہ۔"

اس نے جھٹکے سے کپ پکڑا تو چائے کچھ چھلک گئی۔ کپ رکھ کر وہ ساتھ والی ٹیبل سے ٹشو لینے لگا تو جم گیا۔ ٹشو باکس کے ساتھ ویسی ہی موم بتی پڑی تھی جیسی شہرین بناتی تھی۔ اس نے موم بتی کو دیکھا پھر جب ہلنے کے قابل ہوا تو شانزے پر نظر ڈالی۔

"وہ یہیں ہے نا؟" اس نے بے اعتبار نظروں سے شانزے کو دیکھا۔

"شہرین" کسی بھی وضاحت کے انتظار کے بغیر وہ اٹھ کر پکارنے لگا۔ یونہی پکارتے ہوئے وہ شانزے کے کمرے کی طرف چلا گیا کمرا خالی تھا۔ "شہرین تم کدھر ہو۔ میری بات سنو۔" وہ دیوانہ وار باتھ روم میں گھس گیا۔ پھر پردہ ہٹا کر بالکونی دیکھنے لگا۔

"رامش! تم کیا کر رہے ہو۔ وہ ادھر نہیں ہے۔" شانزے اس کے پاگل پن کو دیکھتے اس کے پیچھے آئی۔

"وہ ادھر ہی ہے۔ اوہ گاڈ! مجھے کیسے پتا نہیں لگا، میں اس کو وہاں ڈھونڈتا رہا۔" وہ شانزے کو راستے سے ہٹا کر باہر آیا اور اگلا دروازہ کھولا یہ اسٹور تھا۔

"دو منٹ رکو، بات سنو۔ یہ سب کیا کر رہے ہو؟" شانزے کو یہ پرائیویسی پر حملہ محسوس ہو رہا تھا۔

"وہ منگنی پر تمہارے ہی کمرے میں تھی۔ تم نے اسے تیار کیا تھا۔ کسی نے خودکشی بھی کرنی ہو تو تم اپنا گھر فراہم کر دو گی کہ آرام سے گھر بند کر کے کرلو۔ اٹ آل میک سینس ناؤ۔"

وہ کچن میں گیا وہاں سے بھی ایک دروازہ نکل کر ٹیرس پر جاتا تھا۔ شہرین وہاں بھی نہیں تھی وہ بے لگام بیل کی طرح آخری کمرے کی طرف جا رہا تھا۔ جب شانزے چلا اُٹھی۔

"بس رامش! ایک قدم آگے نہ بڑھانا بہت سن لیا میں نے۔ تمہاری زندگی مرضی سے نہیں گزرتی تو تمہیں مرچیں لگ جاتی ہیں۔ مگر مجھ پر غصہ اُتارنے سے پہلے خود تو جان لو کہ تمہاری مرضی ہے کس میں۔"

رامش کا ہاتھ دروازے کے ہینڈل پر تھا وہیں جم گیا۔

"یہ تم ہی کہتے تھے کہ تم فوراً اپنے ماں باپ کو اس کا رشتہ لینے بھیج دو گے۔ پھر خود ڈبل مائنڈڈ ہو گئے۔" شانزے نے غصے سے کہا۔ رامش کی ہینڈل پر گرفت ڈھیلی پڑ گئی۔

"پھر نیلوفر آنٹی کو بھیجا کہ اس کو جانچیں جو بھی حالات ہوئے۔ تمہاری اس سے شادی ہو رہی تھی۔ اگر اتنی محبت تھی تو خوش ہوتے تم پھر وسوسوں میں پڑ گئے۔"

رامش کا ہاتھ ہینڈل سے دور ہو گیا۔

"پھر اور کیا کرتا۔ جلد بازی میں شادی کر لیتا۔ نہ وہ خوش رہتی نہ میں۔" وہ بے چین تھا۔

"پہلے اپنے دل میں دیکھو، وہاں کتنی محبت ہے پھر دوسرے کی محبت کا امتحان لینا۔" شانزے ہاتھ باندھے کھڑی تھی۔

رامش خود سے اور شہرین سے نئے سرے سے

شرمندہ ہوا تھا۔

مجھے چلنا چاہیے۔" راہ فرار ہی واحد راستہ تھا۔

"یہی بہتر ہوگا۔" شانزے نے کوئی دل جوئی نہیں کی رامش سر جھکائے چلا گیا۔

شانزے کچھ دیر سر پکڑے کھڑی رہی پھر گھنٹی بجی ۔شانزے کو لگا رامش واپس آیا ہے۔اس نے کوفت سے دروازہ کھولا۔سامنے شمرین کھڑی تھی۔اس کے ہاتھ میں دو تھیلے تھے۔

"راستہ دے دو اب تو میں یہاں رہتی ہوں۔" شمرین نے یاد کروایا۔

"اوہ سوری! میں بس کچھ سوچ رہی تھی۔"

شانزے کے لیے یہ جذباتی کہانی برداشت سے زیادہ ہو رہی تھی۔اندر آ کر شمرین نے وہ دروازہ کھولا جس کے ہینڈل پر کچھ دیر پہلے رامش کا ہاتھ تھا۔شمرین نے دونوں تھیلے کمرے میں رکھے جہاں پہلے ہی اس کے لمبے لمبے دو پٹکرے ہوئے تھے۔رامش اندر آتا تو لمحہ بھر میں پہچان لیتا۔

"ڈاکٹر ماجد کے ابو کا گھر تو بہت پیارا ہے میرے پاس پیسے ہوتے تو میں ہی خرید لیتی یہ ہوادار کمرے اونچی چھتیں اور دیواروں پر روشن دان۔یہ ہمارا کلچر ہے۔یورپ کی نقل والے گھروں میں ہم سردیوں میں جمتے ہیں اور گرمیوں میں سڑتے ہیں۔خیر، آج تین پارٹیاں آئی تھیں امید ہے بات بن جائے گی۔" روانی سے بولتی ہوئی اپنے جوتے بدل کر ایئر رنگ اتار چکی تھی۔بالوں کو باندھ کر وہ لاؤنج میں آئی تو شانزے کو گم صم کھڑے دیکھا۔پھر اس کی نظر کشمیری چائے کے کپ پر پڑی۔

"رامش آیا تھا؟" اُسے جواب کی ضرورت نہیں تھی۔

"میں نے اُسے معلوم نہیں ہونے دیا۔" شانزے نے تسلی دی۔

"میں جانتی ہوں۔" شمرین نے مسکرانے کی ناکام کوشش کی پھر کچن میں چلی گئی اس کی ضد تھی وہ کھانا واپس آ کر خود بنائی گی۔شانزے نے صوفے پر ڈھیر ہو کر میوزک لگا لیا وہ موم بتی دیکھ کر بجھ جاتا ہے۔یہ چائے کا کپ دیکھ کر پہنچ جاتی ہے۔پھر بھی ان میں اتنی دوریاں کیوں ہیں۔

☆☆☆

"باپ کا سر جھکا دیا۔" اس کا دل طنز کرتا۔

"اس لیے کیونکہ اس نے باپ بن کر سہارا نہیں دیا۔" وہ جواب دیتی۔

"دنیا کے سامنے تماشا بن گئی ہو۔" ضمیر وار کرتا۔

"وہ پہلے بھی تھی۔اب میں ٹکٹیں بانٹ آئی ہوں۔" وہ خود پر ہنسی۔

"اچھا لڑکا تھا۔شادی کر لیتیں،" مان جاتا۔" دل نے بکھسلایا۔

"وہ مان جاتا تو شادی کرتی۔مجھ سے الٹی چال نہیں چلی گئی۔" وہ دل کو یاد کرواتی۔

"اور بہزاد ماموں؟ وہ تو ہمیشہ تمہاری ڈھال بنے ہیں۔" دل کا تیر اس بار پار ہوا۔

"میں ان کی مجرم ہوں۔لیکن وہ مجھے خوش دیکھنا چاہتے تھے۔" اس نے دل کو سمجھایا۔

"پھر خوش کیوں نہیں ہو؟" دل نے لاجواب کر دیا۔

"میری زندگی ہے نغمہ
میری زندگی ترانہ
میں صدائے زندگی ہوں
مجھے ڈھونڈ لے زمانہ۔"

سوچوں سے تنگ آ کر اس نے گنگنانا شروع کر دیا۔

ابھی مریضوں کے آنے میں وقت تھا۔کلینک تین بجے شروع ہوتا تھا۔ڈاکٹر ماجد ایک ہسپتال سے سیدھا آتے تھے اور انہیں چار بج ہی جاتے تھے۔جس دن اُس نے نوکری کا ارادہ کیا اس کے دو دن بعد اُسے کلینک میں ریسپشنسٹ کی نوکری مل گئی تھی۔ڈاکٹر ماجد شانزے کے بہنوئی تھے۔وہ بہت محنتی انسان تھے۔جب انہوں نے اسپشلائز کیا۔تب وہ ملک کے دوسرے ینگ سرجن بنے تھے۔ اب ان کے دو بچے

تھے اور شہر کے مصروف ڈاکٹروں میں شمار ہوتے تھے۔

نوکری کے پہلے ہفتے ڈاکٹر ماجد کسی کانفرنس کے لیے گئے ہوئے تھے۔ شہرین اور ان کی سرسری سی ملاقات ہوئی تھی۔ کلینک بھی شام کو بند تھا اس لیے شہرین کو ایک اور ڈیوٹی ملی تھی۔ ڈاکٹر ماجد کا شہر سے دو گھنٹے دور آبائی گھر تھا وہ علاقہ اب تک ڈیولپ نہیں ہوا تھا۔ ڈاکٹر ماجد وہ بیچنا چاہتے تھے۔ اتوار کو وہ ڈرائیور کے ساتھ جاتی تھی اور پراپرٹی ڈیلر گاہک لے کر آتا تھا۔ پہلی بار شہر سے دور ویرانے میں جانے کی ڈیوٹی ملی تو وہ ڈر گئی تھی۔ شانزے نے اسے بہت حوصلہ دیا تھا کہ اعتبار کا ڈرائیور ہے۔ ابھی تک بس کا وہ تنہا سفر اس کے حواسوں پر سوار تھا۔ اس نے کراچی سے اسلام آباد کی بس پکڑ لی تھی۔ اسلام آباد پہنچنے سے پہلے اس نے شانزے کو لینے آنے کو کہا تھا۔ دن کا وقت تھا مگر اُس کی جان سولی پر اٹکی رہی تھی۔ جب وہ آبائی گھر پہنچی تو رونق کا سماں تھا۔ سب اُسے بتانا بھول گئے تھے کہ اس دور دراز بند پڑے مکان کے پیچھے سرونٹ کوارٹر میں چوکیدار، اس کی بیوی اور آدھا درجن بچے رہتے ہیں۔ پراپرٹی ڈیلر بھی خاتون نکلیں اور دیکھنے والی بھی فیملیز تھیں۔ اس کے بعد شہرین میں اعتماد آنے لگا۔

فی الحال تو وہ گنگناتے ہوئے فون اٹینڈ کر رہی تھی۔

"ہیلو، جی! آپ کا نام؟"

اپائنٹمنٹ دے کر اس نے فون رکھا اور پھر گنگنانے لگی۔

"کس نام سے پکاروں کیا نام ہے تمہارا؟"

"میں ڈاکٹر ماجد افتخار ہوں۔" ماجد اس ہی وقت ڈرائیور کی ہمراہی میں داخل ہوا تھا اور مصنوعی بھولپن سے کہنے لگا۔ ڈاکٹر ماجد چالیس سے کم ہی تھے۔

"اوہ! السلام علیکم سر۔" وہ ادب میں اُٹھ کھڑی ہوئی۔

"وعلیکم السلام۔ پہلے میں لنچ کروں گا پھر مریض بھیجئے گا اور ہسٹری Templates ہیں؟" وہ پہلی بار اتنی جلدی آئے تھے اور ہدایات دے کر اندر چلے گئے۔

شہرین کوئی نیا لفظ سن کر سمجھتی تھی کہ اس کے علاوہ سب کو اس کا مطلب آتا ہے۔ وہ فون پر ہسٹری template گوگل کرنے لگی۔ مطلب سمجھ کر اس نے سکون کا سانس لیا اور سر اُٹھا کر دیکھا پیچھے ٹی۔ اسٹیشن پر ڈرائیور مائیکروویو میں کھانا گرم کر رہا تھا۔ گرم کر کے اس نے کھانا ٹرے میں لگایا۔ ساتھ نیپکن چمچے رکھے، دہی اور چٹنی کی چھوٹی ڈھکن لگی ڈبیاں تھیں۔ ڈرائیور نے وہ بھی رکھیں اور کسی کامیاب بیرے کی طرح اندر لے گیا۔

اس نے دل ہی دل میں شانزے کی بہن کو داد دی۔ پھر ایک فون اٹینڈ کر کے وہ خود بھی اندر چلی گئی۔ وہ کمرے میں آئی تو دیکھا ڈاکٹر ماجد کرسی کے اوپر بیٹھے کھانا کھا رہے تھے۔ بائیں ٹانگ کرسی کی سیٹ پر بچھی تھی جبکہ دوسری ٹانگ کرسی پر کھڑی کر کے سینے سے لگا رکھی تھی۔ شہرین بے وقوفوں کی طرح گھورنے لگی۔ یہ وہی طریقہ تھا جو اسے اس کے ابو نے سکھایا تھا۔ ان کے گھر ہمیشہ دسترخوان بچھتا تھا۔ اور فرش پر کھانا کھایا جاتا تھا۔ ایک دفعہ اس نے شہر میں ایسے بیٹھ کر ہاتھ سے کھانا کھایا تو سب نے اس کا مذاق اڑایا۔ اس نے ایسے کھانا چھوڑ دیا۔

رضوان نے اسے سمجھایا تھا کہ یہ مسنون طریقہ ہے۔ اب تو سائنس نے بھی ثابت کر دیا ہے کہ ایسے بیٹھ کر کھانے سے اپینڈکس میں کھانا نہیں جاتا۔ اس لیے یہ طریقہ صحت کے لیے بہت اچھا ہے۔

اب ڈاکٹر ماجد کو دیکھ کر بہت کچھ یاد آ گیا تھا۔ خاص کر وہ مہربان باپ جو عرصے سے نظر نہیں آیا تھا۔

"جی ہسٹری پیپرز ریڈ فائل میں رکھے ہیں۔ جو نیا مریض آئے اس کی ہسٹری لے لیں۔" ماجد نے اُسے گھورتا دیکھ کر خود ہی بتایا۔

"جی اچھا۔" اس نے فائل اُٹھائی اور باہر جاتے ہوئے ایک بار پھر دیکھا ڈاکٹر ماجد سکون سے کھا رہے تھے۔ وہ ہوتی تو گھبرا کر چھری کانٹا پکڑ لیتی یا ٹانگ پر ٹانگ رکھ لیتی۔ لیکن وہ شخص جو امبیسیڈرز کا علاج کرتا تھا

بڑے بزنس مینوں کی سرجریاں کرتا تھا۔ اپنے رہن سہن میں کتنا پراعتماد تھا۔ شہرین کو دنیا اچانک اچھی لگنے لگی تھی۔

☆☆☆

اس دن کوئی ہڑتال ہوگئی تھی۔ دن کے وقت وہ اس ہی کلینک میں کسی اور ڈاکٹر کا کام کرتی تھی۔ ڈاکٹر ماجد کی ساری اپائمنٹس کینسل کرنا پڑی تھیں۔ ڈاکٹر ماجد کسی دوست کے گھر گئے تھے اور ڈرائیور کو فون پر کہہ دیا تھا کہ شہرین کو گھر ڈراپ کردے۔ ڈرائیور بچوں کو اسکول سے لے کر آیا تھا۔ دونوں بچے پچھلے سیٹ پر اپنے ڈیوائس میں لگے تھے۔ روشان گریڈ سیون میں تھا اور ماریہ گریڈ فائیو میں تھی۔

"میں نے کہا السلام علیکم، ہیلو جی آیاں نوں۔" شہرین نے چلا کر اعلان کیا۔

"اوہ ہیلو" ماریہ نے جواب دے دیا۔

"میرا چانس مس کروادیا۔" روشان نے ٹیب سیٹ پر زور سے پٹخا۔

"تم سارا دن ان نقلی لوگوں کو دیکھ کر اکتا نہیں جاتے۔" شہرین بچوں سے ذہنی ہم آہنگی محسوس کرتی تھی اس لیے ان کے سامنے فوراً کھل جاتی تھی۔

"باجی! نماز کا وقت ہوگیا ہے میں پڑھ لوں؟ آپ کو بعد میں چھوڑ آتا ہوں۔" ڈرائیور نے گاڑی گھر کے اندر لے جاتے ہوئے کہا۔

"ہاں کیوں نہیں۔" شہرین کو بے وقت چھٹی ملی تھی۔ اُسے کوئی جلدی نہیں تھی۔ وہ بچوں کے ساتھ اندر آگئی۔ گھر تھا کہ محل۔ وہ تو چاروں سمت دیکھنے لگی۔ فانوس، وڈورک، کرسٹل چمکیلے صوفے۔ ماریہ روشان نے بستے پھینکے جوتے اتارے اور وہیں الٹے سیدھے لیٹ کر ڈیوائس دیکھنے لگے۔

"مجھے باتھ روم جانا ہے۔" شہرین نے چاندنی اماں سے پوچھا۔ وہ ہی بچوں کی دیکھ بھال کرتی تھیں۔

"ہاں جی، اس طرف ہے۔" چاندنی اماں نے گیسٹ باتھ روم کی طرف اشارہ کیا۔ شہرین نے باتھ روم میں ایک قدم رکھا اور ڈر کر باہر نکل آئی۔

"اندر تو انڈین فلش ہے۔" اس نے کہا۔

"ہاں جی، صاحب خاص طور پر انڈین فلش لگواتے ہیں۔ ہمارے گاؤں میں بھی یہی ہوتا ہے۔ مجال ہے کسی کو گھٹنوں یا قبض کی تکلیف ہو۔ صاحب بھی کہتے ہیں اس کے بڑے جسمانی فائدے ہیں ویسے ساتھ وہ کرسی والا کموڈ بھی ہے آپ وہ استعمال کرلیں۔" چاندنی نے وضاحت دی۔

"نہیں۔ وہ مسئلہ نہیں ہے۔"

وہ سمجھا نہیں پارہی تھی مگر اُسے حیرت اس سکون پر ہو رہی تھی جو ماجد کو اپنی جڑوں سے جُڑ کر ہوتا تھا۔

وہ دوسروں کی پروا کیے بغیر وہ کرتے تھے جو انہیں ٹھیک لگتا تھا۔

شہرین باتھ روم سے فارغ ہو کر آئی۔ دونوں بچے کپڑے بدل کر ڈیوائس سامنے رکھے اب کھانے میں مصروف تھے۔ کاریڈور میں اس نے ڈاکٹر ماجد اور علیزے کی تصویر دیکھی اور دیکھتی رہ گئی۔ ماجد ینگ لگ رہا تھا مگر وہی چوڑا ماتھا، گورا رنگ، چوکور عینک اور مہربان تاثرات۔ اس کی نظر علیزے پر ٹھہری تھی وہ لال شیفون کی ساڑھی میں تھی اور مناسب زیور پہن رکھا تھا۔ بہت پیاری معصوم اور چنچل، سلیولیس بلاوز پہنے اس نے بہت استحقاق سے شوہر کے کندھے پر ہاتھ رکھا ہوا تھا۔ وہ کھانے کی میز پر آگئی۔

"ماریہ! آپ کی ماما کدھر ہیں؟" "میں کب سے آئی ہوئی ہوں۔ میں نے سلام بھی نہیں کیا۔" اس نے دونوں ہاتھ خالی کرسی پر جما کر پوچھا۔

ماریہ اور روشان دونوں نے نظر اٹھائی، یہ پہلی بار تھا کہ دونوں سو فیصد توجہ سے اُسے دیکھ رہے تھے۔

"شہرین باجی! ڈرائیور کو کھانا دے دیا ہے۔ آپ بھی کھالیں۔ کچن میں آجائیں۔" چاندنی طریقے سے اسے نکال لے گئی۔

"علیزے میڈم کو گزرے تین سال ہو چکے ہیں۔ وہ بھی ڈاکٹر تھیں۔ لیکن ایسی بیماری ہوگئی کہ کسی کے قابو میں نہیں آئی۔" چاندنی نے پلیٹیں نکال کر شہرین کو دیں۔

وہ کتنی بے وقوف تھی اتنی بڑی بات سے انجان تھی۔

☆☆☆

رات کے کھانے کے بعد گرین ٹی لے کر وہ بالکونی میں آ بیٹھی تھیں۔ شانزے کے پسند کے انگریزی میوزک کی اُسے کچھ سمجھ آنے لگی تھی۔

"تمہاری بہن کی ڈیتھ۔" میرا مطلب مجھے معلوم ہی نہیں تھا۔" اس نے جھجکتے ہوئے کہا۔

"وہ ہماری فیملی کی اسٹار تھی۔ ممی اور ڈیڈ اب تک اس کی ڈیتھ سے سنبھل نہیں پائے۔ مجھے بھی خود کو یاد کروانا پڑتا ہے کہ وہ اب نہیں ہے۔" شانزے نے گھونٹ بھرا۔

"ایک بات سمجھاؤ تمہارے بہنوئی بہت دیسی انسان ہیں اور علیزے بالکل میم جیسی۔ کتنی مختلف جوڑی ہے۔" اس نے کہا۔

شانزے مسکرادی۔

"علیزے کے جانے کے غم میں ہم بھول ہی گئے ورنہ ان کا ملنا ہمارا فیورٹ ٹی۔ٹائم ٹاپک ہوا کرتا تھا۔" شانزے کو بھولی ہوئی داستان یاد آنے لگی۔

"علیزے ہاؤس جاب کر رہی تھی۔ اس کی ڈاکٹر دوست کی شادی تھی۔ اس دوست کے والد صاحب ڈاکٹروں کے سرکل کی بہت توپ چیز تھے۔ علیزے اسلام آباد کی رہائشی تھی مگر اس کا ایڈمیشن لاہور میں ہوا تھا۔ اب ہاسٹل کی سہیلیوں کے ساتھ شادی پر آئی تھی تو دلہن کے گھر ہی ٹھہری تھی۔ رات بھر ہنگامہ کیا اور دن بھر آرام۔

شادی کے لیے تیار ہونے لگیں تو معلوم ہوا علیزے کے سوٹ پر ہیئر جیل کی بوتل لیک ہوگئی ہے۔ کسی کا بازار جانے کا موڈ نہیں تھا۔ ایک فرینڈ کے پاس فالتو جوڑا تھا جس کے ساتھ روایتی گوٹے والا دوپٹا تھا۔ چاروناچار علیزے سہیلی کا سوٹ پہننے پر راضی ہوگئی۔ جس سہیلی کا سوٹ تھا اس نے دوپٹے کو سر پر اوڑھا کر پن اپ کردیا تھا۔ شادی ہال پہنچتے تک علیزے کو اکتاہٹ ہونے لگی تھی۔ اس نے دوپٹا اتارنا چاہا مگر اس پر اتنی پنیں لگی تھیں کہ یہ اس اکیلی کے بس کا کام نہیں رہا تھا۔ ایسی ہی اکتاہٹ میں ڈاکٹر ماجد کی اس پر نظر پڑی۔ وہ دلہن کے والد کے اسٹوڈنٹ اور کولیگ تھے۔

ماجد سادہ محنت کش کسان کے بیٹے تھے۔ باپ نے جان مار کر بچوں کو پڑھایا تھا۔ باپ کی طرح ڈاکٹر ماجد کی رگوں میں بھی محنت کوٹ کوٹ کر بھری تھی۔ گاؤں کے بچے ماؤں کی آغوش میں سو رہے ہوتے تھے تو ڈاکٹر ماجد بس پکڑ کر بڑے قصبے میں اسکول جاتے تھے۔ تھک کر شام تک واپسی ہوتی تو وہی بچے گلی میں کھیل رہے ہوتے تھے، وہ کبھی ماجد پر ترس کھاتے کبھی ان پر ہنستے۔ ماجد ذہین تھے مگر کڑی محنت کر کے اپنے نام کے ساتھ ڈاکٹر اور اسپیشلسٹ لکھوایا تھا۔ مگر طبیعت سادہ تھی۔ اس زرق برق آنچلوں کی محفل میں بے چینی محسوس کر رہے تھے۔ شادی میں اسٹارٹر سرو ہوئے تو ماجد کنفیوژ ہوگئے۔ انہیں لگا یہ سلم فٹ لوگ اتنا ہی کھاتے ہیں اور یہی کل کھانا ہے انہوں نے سوپ سلاد، اسپرنگ رول کھا کر پیٹ بھر لیا تھا۔ اب اصل کھانا لگا تو ٹہل ٹہل کر معدے میں جگہ بنا رہے تھے۔

انہوں نے علیزے کو دیکھا تو وہ انہیں مشرقی حسن کی دیوی معلوم ہوئی گوٹے کناری والے دوپٹے میں لپٹی وہ ان کے ہی قبیلے کی لگتی تھی۔ ماجد نے گفتگو میں پہل کی تھوڑی تھوڑی کرتے اتنی باتیں ہوگئیں کہ اس دن دونوں نے نمبر تبدیل کر لیے۔ فون پر اکثر ڈاکٹروں والی بات ہونے لگی۔

اگلی ملاقات آٹھ ماہ بعد ہوئی تھی۔ علیزے اسلام آباد واپس آچکی تھی جس سہیلی کی شادی ہوئی وہ اب ڈاکٹر ماجد والے ہسپتال میں کام کر رہی تھی۔ علیزے اس سے ملنے آئی تھی تو ڈاکٹر ماجد سے بھی ملاقات ہوگئی۔ ماجد کے صحیح معنوں میں ہاتھ کے توتے اُڑے تھے علیزے نے بالوں کا نچلا حصہ جامنی کروایا ہوا تھا۔ جینز کے ساتھ فراک جیسی چھوٹی قمیص پہن رکھی تھی۔ جس کے کندھوں میں دو انچ کی کھڑکیاں تھیں۔ جب تک وہ بولی نہیں ماجد کو یقین نہیں ہوا کہ یہ

وہی علیزے ہے۔ لیکن وہ بولنے لگی تو دوبارہ سے دلوں کے تار جڑنے لگے۔

وہ دونوں بہت مختلف تھے۔ اس لیے علیزے نے چاہ کر بھی کوئی رشتہ قائم کرنے کے بارے میں نہیں سوچا۔ ماجد کی جو سوچ تھی اس میں شادی کے علاوہ اور کسی چیز کی گنجائش ہی نہیں تھی۔ بات یہاں ختم نہیں ہوئی۔ دونوں ملنے کے بہانے ڈھونڈنے لگے۔ علیزے بے وجہ ہسپتال آ جاتی ماجد بہانہ ڈھونڈ کر کال کر لیتے جس سے بات چل نکلتی۔ علیزے کی سہیلی کے والد نے ماجد سے ذکر کیا کہ اب شادی کر لیں اور علیزے سے ہی کیوں نہ کر لیں، اچھی لڑکی ہے۔ یوں شادی ہو گئی لیکن شادی ارینج تھی کہ لو اس کا فیصلہ نہیں ہو سکا۔ ماجد کہتے تھے ڈاکٹر صاحب نے ان کی شادی کروائی ہے اس لیے ارینج ہے۔ علیزے کہتی تھی ان کی پسندیدگی دیکھ کر لوگوں نے کہنا شروع کر دیا تھا کہ شادی کر لو۔ اس لیے لو میرج ہے۔ وہ اچھی خوش گوار شادی تھی۔ علیزے جلد ساتھ چھوڑ گئی۔ شادی انجام کو پہنچی لیکن ارینج تھی کہ لو آج تک فیصلہ نہیں ہو سکا تھا۔

☆☆☆

وہ بہت جوش سے بیٹھی موبائل پر گیم کھیل رہی تھی۔ تیز تیز چلتی انگلیوں کے ساتھ اُس کے دانت کلکچا رہے تھے۔ جیسے اس کا سارا زور لگ رہا ہو۔

"مس شہزین مجھے کل کی میٹنگس کی سلپ دے دیں۔" ڈاکٹر ماجد باہر کچھ لینے آئے تھے۔

"جی سر، اوکے سر۔" شہزین نے فوراً موبائل نیچے رکھا اور اوپر ایک فائل رکھ دی۔

"آپ کو موبائل گیمز کا شوق ہے؟" یہ آوازیں ماجد کے لیے مانوس تھیں۔

"جی وہ روشان نے چیلنج کیا ہے اس لیے میں بھی کھیل رہی ہوں۔"

"ہاں۔ وہ تو گیمز کا دیوانہ ہے۔ بچ کر رہنا۔" ڈاکٹر ماجد ہنس کر کہتے اندر چلے گئے۔

شہزین نے بتایا نہیں تھا کہ ان تینوں نے لسٹ بنائی ہے شہزین نے دس بغیر موبائل والی تفریحات لکھی ہیں اور روشان ماریہ نے موبائل سے جڑے چیلنج لکھے ہیں۔ اب وہ ایک دوسرے کی لسٹ پوری کر رہے ہیں۔ وہ پچھلی میٹنگس کا حساب لے کر اندر گئی تھی۔ باہر آتے ہوئے وہ عادتاً گنگنانے لگی۔

"دل ہو گیا ہے تیرا دیوانہ اب کوئی چچتا نہیں۔"

دروازہ بند ہونے سے پہلے ماجد نے گانا سنا تھا۔ اسے یاد آیا ابھی وہ روشان کو دیوانہ کہہ کر آیا تھا۔ یعنی وہ لفظ سن کر گانا نکال لیتی تھی۔ ماجد نے یہ اندازہ آزمانے کا سوچا۔

ایک مریضہ بچہ اُٹھائے آئی۔ بچے کا جھنجھنا باقاعدگی سے بج رہا تھا۔ ان کے جانے کے بعد شہزین بے خیالی میں چھن چھن چھن میری پائل کی دھن گاتی ہوئی پائی گئی۔ سارے مریض دیکھے گئے کلینک بند ہونے کا ٹائم ہو گیا۔ ڈرائیور نے آ کر ماجد کا سامان اُٹھایا۔

"صاحب! میں گاڑی سامنے لے آتا ہوں۔" ڈرائیور باہر نکلا۔

"بس بھئی بس زیادہ بات نہیں چیف صاحب۔" وہ فائلیں رکھتے ہوئے گا رہی تھی۔ ماجد کو ہنسی آ گئی۔

"کل ملتے ہیں۔" وہ مسکرا کر بیرونی دروازے تک پہنچ گیا۔ جب پیچھے سے آواز آئی۔

"کل شب دیکھا میں نے چاند جھروکے میں۔"

وہ وہیں سے پلٹ کر شہزین کو دیکھنے لگا۔

"جی سر! کچھ چاہیے؟" شہزین نے شرمندگی میں گانا روکا۔

"نہیں۔ آپ کی آواز اچھی ہے وہی سن رہا تھا۔" ماجد نے کہا اور دروازہ کھول کر چلا گیا۔

شہزین کو احساس ہوا تھا اُسے اپنے گمشدہ سر واپس مل گئے تھے۔ لیکن وہ انجان تھی کہ ماجد کو بھی اُس کی گمشدہ ہنسی دوبارہ مل گئی ہے۔

☆☆☆

روشان نے گیم کے دسویں لیول تک پہنچنے کا جو

چیلنج دیا تھا وہ شہرین نے کرلیا تھا۔ شہرین نے اسے اشتیاق احمد کی جمشید سیریز کا ناول پڑھنے کا چیلنج دیا تھا۔ جمعے کو کلینک کی سیکنڈ شفٹ ختم ہوگئی تھی اس لیے تقریباً ہر جمعے کو وہ ان کے گھر ہوتی تھی۔

"اب پروفائل پک کے لیے یوں پاؤٹ کریں۔" ماریہ شہرین کو سیلفی لینا سکھا رہی تھی۔ شہرین کا ایک فیس بک پیج تھا جس پر عرصے سے کوئی آمدورفت نہیں تھی۔ نیکسٹ چیلنج انسٹا اکاؤنٹ بنانے کا تھا۔ جو وہ فی الحال کر رہے تھے۔

باہر بادل گرجے اور لمحوں میں اسلام آباد پر مہربان ہوگئے۔ خیرپور میں تو سال میں شاید تین بار ہی بارش ہوتی تھی۔ شہرین مچل اٹھی۔

"چلو بارش میں نہائیں۔" اس نے ماریہ کا ہاتھ پکڑا۔

"بارش میں نہانا تو چیلنج نمبر چھ ہے۔ ابھی بہت دور ہے۔" روشان صوفے پر لیٹ گیا۔

"جب باری آئے گی تو بارش نہیں ہوگی چلو تو۔" شہرین نے اکسایا مگر وہ ٹس سے مس نہ ہوئے۔

"اچھا یہ چیلنج کرلو تو نمبر چھ سے پہلے والے سارے چیلنج معاف۔" شہرین کو عرصے بعد بے فکری ملی تھی وہ گنوانا نہیں چاہتی تھی۔ وہ کسی نہ کسی طرح انہیں قائل کرکے لے آئی۔

"آگیا ہوں اب، کیا کروں؟" روشان نے برا سامنہ بنایا۔

"ڈانس کرلیتے ہیں۔" شہرین نے آئیڈیا دیا۔

وہ ہاتھوں میں پانی بھر بھر کر روشان پر پھینکنے لگی۔ اب وہ لڑ رہے تھے، ڈانس کر رہے تھے انجوائے کر رہے تھے۔ ایسے ہی سائیڈ والے لان سے بھاگ کر وہ سامنے والے لان تک آئے تو دیکھا ڈاکٹر ماجد کی گاڑی اندر آچکی تھی اور وہ گاڑی سے اتر رہے تھے۔ بھیگے حلیے میں باس کا سامنا اس کے ہوش اڑا گیا۔ وہ وہیں کھڑی رہ گئی۔ روشان اور ماریہ دوڑ کر ماجد کے پاس گئے اور ملی جلی شکایتیں لگانے لگے۔ اس سے فارغ ہو کر ماریہ نے باپ کو کھینچنا شروع کردیا۔

"آئیں بابا! بارش میں نہاتے ہیں پلیز۔"

"میں بارش میں نہیں نہاتا نہ ڈانس کرتا ہوں، کہاں پھنسا رہے ہو۔" وہ مسکراتے ہوئے انکار کرنے لگے۔

"ہیلو شہرین۔" اس کو بہت پہلے دیکھ چکے تھے اب کچھ نہ کہنا بے ادبی تھی۔

شہرین فوراً پلٹ گئی اور عقبی لان سے ہوتے ہوئے کچن کی طرف سے اندر گئی۔ عمر میں جتنے بڑے ہوجائیں عقل تو تجربے سے آتی ہے۔ اب کچن میں ٹپ ٹپ پانی گراتی وہ سوچ رہی تھی کہ کدھر فرار ہو، اس کے پاس تو دوسرا سوٹ بھی نہیں تھا۔

ماریہ نے اسے بہت پیارا سوٹ دیا تھا نیلے رنگ کا پلین سوٹ تھا۔ جس پر کہیں کہیں سلور ڈوری لگی ہوئی تھی۔ کپڑے بدل کر بال خشک کرکے وہ سوچ رہی تھی کہ کس منہ سے باہر جائے۔ ابھی ماجد کا سامنا نہ کرتی تو سوموار کو کلینک میں ملنا ہی تھا۔ اس لیے ہمت کرکے باہر نکلی باہر ضرورت سے زیادہ خاموشی تھی۔ لاؤنج میں ماجد ٹی وی دیکھ رہے تھے۔

"سر! میں چلتی ہوں۔ سوری میں بچوں کے پاس ویسے ہی رک گئی تھی۔" اس نے ماجد کے سامنے آکر کہا۔ اس بار ماجد کا ہوش اڑا تھا۔

شہرین منتظر ہی تھی کہ چاندنی ٹرے میں دو کپ چائے لے آئی۔ اس نے ایک کپ ماجد کو دیا۔ ماجد نے شہرین سے نظریں پھیر کر کپ لے لیا۔

"بیٹھیں، چائے لے لیں۔" ماجد نے میزبانی نبھائی۔

"نہیں۔ سر، لیٹ ہو رہا ہے۔" وہ نکلنا چاہتی تھی۔

"اتنا بھیگی ہیں ٹھنڈ لگ جائے گی۔ چائے پی لیں گرم ہوجائیں۔" چاندنی نے اسی رعب سے کہا جس سے روشان اور ماریہ کو کہتی تھی۔

شہرین کپ تھام کر بیٹھ گئی۔ بچے ٹیوٹر سے پڑھ رہے تھے وہ پہلی بار کلینک کے باہر ملے تھے۔

"سر! مجھے آپ کا گھر بہت اچھا لگا ہے۔ آپ

جیسے اپنی پرورش سے جُوے ہیں مجھے دیکھ کر خوشی ہوتی ہے آپ کیسے کر لیتے ہیں؟ مجھ سے تو کسی کے سامنے انگلش بھی نہیں بولی جاتی، کہیں غلطی نہ ہو جائے۔"

"سارا کھیل اعتما کا ہے۔اپنی محنت سے آگے بڑھنے والے کو خود پر جلد یقین آ جاتا ہے۔" وہ ابھی بھی بوجھل تھے۔

دونوں پھر خاموش ہو گئے۔

"پستے کو انگلش میں پستا شو کہتے ہیں۔پہلی بار سنا تو لگا کسی بیماری کا نام ہے۔" نظریں پھیر کر وہ قصہ سنا گئے۔

شہزین بھی دلجمعی سے سنتی رہی۔ڈاکٹر ماجد کی باتیں سن کر دنیا کم خوف ناک لگتی تھی۔ایک بات سے دوسری بات نکلتی رہی، چائے کی پیالی کپ کی ختم ہو گئی۔ٹیوٹر کے جانے کے بعد جب بچے باہر نکلے تو انہیں احساس ہوا وہ بہت دیر بات کرتے رہے تھے۔

"بابا!" روشان کے ماتھے پر واضح تیوریاں تھیں۔

"اوہ!" مجھے خیال ہی نہیں رہا۔اچھا میں چلتی ہوں۔شہزین نے ماریہ کو الوداعی گلے لگایا اور چلی گئی روشان نے اس کے جانے کے بعد باپ کو دیکھا وہ ناخوش نہیں تھے۔روشان کو تسلی ہوئی۔

"تم نے شہزین کو ماما کا سوٹ دیا تھا؟" وہ ماریہ کے کمرے میں آیا تھا۔

ماریہ کا رنگ فق ہوا تھا۔

"میری الماری میں تھا۔میں نے دے دیا۔" ماریہ نے ڈرتے ڈرتے کہا۔

"بابا کا تو سوچنا تھا انہیں بُرا لگ سکتا تھا۔" روشان نے بڑوں کی طرح سمجھایا۔

"اُن کا ہی سوچا تھا بھائی۔میں یہی دیکھنا چاہتی تھی انہیں بُرا لگے گا کہ نہیں!انہیں بُرا نہیں لگا۔" ماریہ نے خوشی سے کہا۔

☆☆☆

"آج ڈاکٹر ماجد کا آبائی گھر دیکھنے ان کے ایک دوست نے آنا تھا۔اُسے پہلی تنخواہ مل گئی تھی۔گھر کا مائیکرو ویو عرصے سے گھومنا چھوڑ چکا تھا۔کتنا اچھا ہوتا۔وہ گھر ہوتی،صبا کو شاپنگ کرواتی،دادی کو آرام وہ چپل لے دیتی،وہ کیا یاد کرتیں وہ سوچ رہی تھی کہ خریدار کی گاڑی آ گئی اس نے گھر میں ایئر فریشنر چھڑک کر مڑ کر دیکھا سامنے سے رامش داخل ہو رہا تھا۔

"میں ڈاکٹر ماجد کی پی اے ہوں۔" اس نے ڈر کر بتایا۔

"میں وہ دولہا ہوں جس کو صبح اُٹھ کر معلوم ہوا کہ دلہن بھاگ گئی ہے۔" رامش نے کہہ دیا۔

"رات کو فون اُٹھا لیتے تو مجھے یہ قدم نہ اُٹھانا پڑتا۔" خفا ہونے کا حق اس کے پاس بھی تھا۔

"میں تب سے تمہیں ڈھونڈ رہا ہوں۔" اس کے دل پر چوٹ لگی تھی۔

"کچھ موقعے ایک بار ہاتھ سے نکل جائیں تو ساری عمر ڈھونڈنے سے نہیں ملتے۔" آپ گھر دیکھ لیں۔" وہ ذاتی باتیں نہیں کرنا چاہتی تھی۔

"تمہارے جانے کے بعد......" رامش کہنے لگا۔

"لائن میں چار کمرے ہیں۔باتھ روم پہلے باہر تھا اب نئے بنوائے ہیں۔"

"فوزیہ آنٹی بہت خوش تھیں۔" وہ پھر بولنے لگا۔

"کچن کے ساتھ سٹڈی ہے۔" وہ اتنا اونچا بولی کہ رامش کی آواز دب گئی۔

"ہمزاو انکل اور تمہارے ابو کو صرف تمہاری فکر تھی۔"

"مجھے کچھ نہیں سننا پلیز۔" اس نے دونوں کانوں پر ہاتھ رکھے۔

"رامش نے راستہ بدل لیا اور گھر دیکھنے لگا۔اس کی کمپنی یہاں ریزورٹ بنانے میں دلچسپی لے رہی تھی۔

"کچھ باتیں تمہارا سننا ضروری ہیں۔" رامش نے جاتے ہوئے پھر کہا۔

شہزین گھر کو تالا لگانے لگی۔

"فوزیہ آنٹی نے نعیم کی شادی کر دی ہے۔"

رامش نے کہا۔
"مبارک ہو۔ کسی کی تو ہوئی۔" وہ گاڑی کی طرف جانے لگی۔
"تمہاری بہن صبا کے ساتھ۔" رامش نے کہا۔ شمرین کا رنگ اڑ گیا۔

☆☆☆

شانزے پر چاروں طرف سے سوچوں نے اتنا تابڑ توڑ حملہ کیا تھا کہ اس کی سمجھ مفلوج ہو گئی ماریہ کا فون آیا تھا وہ تو بچی ہے شانزے کو لگا اس نے غلط فہمیوں سے خوش فہمیوں کا سفر چٹکیوں میں پار کر لیا ہوگا۔ بہت دیر اس آئیڈیے سے جھنجلا کر اُسے احساس ہوا یہ آئیڈیا اتنا بُرا بھی نہیں ہے۔ شمرین اور ماجد میں بہت مماثلت ہے۔ کچھ دیر اور سوچا تو اُسے بھی یہ خیال اچھا لگنے لگا۔ پھر ہر گزرتے لمحے کے ساتھ وہ بھی ماریہ کی طرح اچھے مستقبل کی امیدیں جوڑنے لگی۔ ماریہ کم عمر تھی اب یہ کام شانزے خود کرے گی۔ وہ بہت خوش تھی جب شمرین واپس آئی۔
"مجھے گھر جانا ہے۔" اس نے چھوٹتے ہی کہا۔

☆☆☆

وہ میتھی کا پتا پتا ڈنڈی سے اتار کر مٹھی میں بند کر رہی تھی اس سے پہلے اس نے ادرک لہسن کا پیسٹ بنا کر بوتل میں بھر کر رکھا تھا۔ بازاری پیسٹ میں خوشبو نہیں ہوتی اب وہ اپنا پیسٹ ڈالے گی تو دیکھنا گھر کے لوگ کتنا خوش ہوں گے۔ نئی دلہنیں سسرال کو خوش کرنا اپنا نصب العین بنا لیتی ہیں۔ صبا تو تنہا تھی۔ ماں بہن تھیں نہیں۔ جو آنا فانا شوہر بنا تھا وہ نظریں ملانے کا بھی روادار نہیں تھا۔
شادی کا فیصلہ ہوا تو بھائی نے پیسے بھجوائے تھے۔ جہیز وہ نہیں لائی تھی۔ مگر کپڑے زیور میک اپ اس نے بہت چاہ سے خریدا تھا۔ اب وہ گھر اور نعیم کے دل میں اپنے لیے جگہ نکلنے کا انتظار کر رہی تھی تا کہ سارے ارمان پورے کرے، وہ میتھی بنا کر دھو کر کچن سے باہر نکلی۔
"میں تو پارلر جا رہی تھی سوچا اس کو ساتھ لے جاؤں تھوڑا سا گروم ہو جائے۔ کہاں آپ نے اُسے سبزیاں کاٹنے پر لگایا ہوا ہے۔ اب پورا دن اس کے ناخنوں سے میتھی کی بو آئے گی۔" الماس ماں کو سنا رہی تھی۔
"میں نے نہیں کہا وہ خود ہی کام کرتی ہے۔" فوزیہ نے بھی سخت لہجے میں کہا۔
جب سے شمرین والا پلان فلاپ ہوا تھا الماس انہیں کم عقل ثابت کرنے کا کوئی موقع نہیں گنواتی تھی۔
"اُسے نعیم بھائی کے لیے لائے ہیں۔ وہ سارا دن کچن میں سکتی پکاتی رہتی ہے اور بھائی دوائیوں کے اثر میں سوتے رہتے ہیں۔" بھائی کی آدھی چھٹیاں گزر گئیں کوئی بدلاؤ نظر نہیں آیا۔"
صبا نے گزرتے ہوئے سنا تو بہت عجیب محسوس کیا۔ سب کا اس کے ساتھ اس رویہ اچھا تھا۔ وہ سوچتی تھی شمرین منہ پھٹ تھی اس لیے اُسے سب ناپسند کرتے تھے۔ وہ خدمت گزار ہے اس لیے سب نرمی سے پیش آتے ہیں۔ اب لگا کہ جیسے وہ تجرباتی شے ہے۔ جسے لا کر نعیم میں سدھار کی توقع ہے۔
اور اگر بہتری نہ آئی تو؟ اس کا دل بہت دُکھا۔ دل سے فریاد نکلنے لگی۔ اسی وقت گھر کی گھنٹی بجی۔ صبا کے دل پر پھوار پڑی جیسے فریاد سن لی گئی ہو۔ اس نے دروازہ کھولا تو سامنے دھوبی تھا۔ اس نے دل کو غلط گواہی پر معاف کر دیا اور صبر کا گھونٹ بھر لیا۔ وہ ہمیشہ یہی تو کرتی آئی تھی۔

☆☆☆

صبا کے جانے کے بعد دادی جیسے تیسے سالن بنا لیتی تھیں۔ تمام عمر انہوں نے فخر کیا تھا کہ میرے توے پر ہر شخص کے لیے گرم روٹی بنتی ہے۔ ایسا اس لیے ہوتا تھا کیونکہ پہلے بہو پھر پوتی بنانے کا موجود تھی۔ اب خود پر آئی تو ملازمہ کے جانے سے پہلے دوپہر کے ساتھ رات کی روٹی بھی پکوا لیا کرتی تھیں۔ ابھی ہانڈی بند کر کے چولہا جلایا ہی تھا تو دروازے پر کوئی آ گیا۔ بڑی مشکل سے دیواریں پکڑ کر وہ گیٹ پر پہنچیں سامنے شمرین تھی۔ دادی ایسے ڈریں جیسے بھوت دیکھا ہو۔ صحن

پھلانگ کر اندر گئیں اور فون ملانے لگیں۔ ٹینشن میں نمبر غلط مل رہا تھا۔ انہوں نے دو تین بار فون پٹخ کر پھر ملایا۔ اتنے میں شمرین سامان گھسیٹتی اندر آ چکی تھی۔

"زیرو تین سو تیرا۔" شمرین نے یاد کروایا۔

اس کی آواز سن کر دادی کو ہوش آیا۔

"ابا کا نمبر بتا رہی ہوں جس بیٹی کو سر سے اتارنے کی بے شمار کوشش کی وہ واپس آ گئی ہے۔ انہیں دھیرے دھیرے بتایئے گا کہیں صدمہ نہ لگ جائے۔" شمرین ٹانگ پسار کر بیٹھ گئی۔

"تم خود گھر چھوڑ کر بھاگی تھیں۔ اب کس بے غیرتی سے واپس آ گئی ہو۔" ابتدائی شاک کے بعد ان کی طبیعت بحال ہو گئی تھی۔

"یہاں کے دروازے آپ نے بند کر رکھے تھے۔ اس لیے آگے جانا پڑا۔" وہ ڈھیٹوں کی طرح بیٹھی رہی۔ اب اسے صبا کی خاطر یہ سب برداشت کرنا تھا۔

☆☆☆

وہ ایک بار دیر کر کے غلطی کر چکا تھا۔ اب نہیں کرنا چاہتا تھا۔ وہ کراچی آ گیا تھا جبکہ شمرین خیر پور تھی۔

"میں اُسے سمجھ ہی نہیں سکا۔ اس لیے اس تک پہنچ نہیں پاتا۔" وہ افسردگی سے عمر کے سامنے بیٹھا تھا۔

"تمہارا راستہ سیدھا ہے تم جان کر قلابازیاں کھا رہے ہو بنا سوچے سمجھے جہاز میں بیٹھ کر آ جاتے ہو اور ڈرامے کو دعوت دیتے ہو۔" عمر نے شاہانہ کی طرف سے آئے سوپ کی ٹرے پاس کی۔

رامش نے سوپ کے ساتھ آئے سرکے اور سویا ساس کی بوتلیں دیکھیں۔ دونوں پر چائنیز لکھی تھی۔ شاہانہ غالباً آنکھیں بند کر کے شاپنگ کرتی تھیں۔ گھر کے باہر پچھلے مکان مالک کی تختی لگی تھی وہ بھی شاہانہ نے بدلوائی نہیں تھی۔ روز اپنے گھر کے سامنے کسی دوسرے کا نام پڑھ کر بھی اسے کوفت نہیں ہوتی تھی۔

"چلو تم سوپ پیو۔" عمر سوپ نکالنے لگا۔

رامش نے سوپ نکالنا شروع کیا۔ دروازے پر دستک ہوئی۔ عمر کھول کر مالک مکان سے بات کرنے لگا۔

"رامش۔ یہ میرے مالک مکان ہیں۔ شاہانہ میڈم کے شوہر۔" عمر اسے اندر لا کر تعارف کروا رہا تھا۔ رامش نے سوپ کے گرم قطرے ہاتھ پر انڈیل لیے۔ شاہانہ کے شوہر کے پسینے چھوٹ گئے تھے۔

"فہیم بھائی، آپ؟ رامش کو یقین نہیں آیا۔

☆☆☆

میری صرف ایک بیٹی ہے اور وہ ہے صبا۔ جہاں میں نے رشتہ طے کیا ایک لفظ بولے بغیر وہاں اُس نے شادی کر لی۔" رضوان نے طیش سے کہا۔

"اور اس بیٹی کے پاس دُکھ سکھ میں ڈھارس بننے والا باپ ہے یا اس کو بھی بیاہ کر ناتا توڑ لیا؟" شمرین نے جتاتا سوال کیا۔

رضوان تڑپ اُٹھا۔

"تمہیں سر سے نہیں اتارا تھا۔ بہتر مستقبل کے لیے بھیجا تھا۔ بڑے شہر کی پڑھائی کر کے اپنے کامیاب ماموں کے پاس رہ کر میں چاہتا تھا تم بہتر زندگی گزارو۔" رضوان نے وضاحت کی۔

"دوسروں کی ذمہ داری لگانا مختلف ہوتا ہے، ان کے سپرد کر دینا بالکل الگ۔ ہفتے میں کتنی بار صبا کو فون کرتے ہیں؟ شادی کے بعد اس کی خیر خبر لی ہے؟ وہ صبا کی وکالت کرنے آئی تھی۔

"اتنے بڑے گھر میں بیاہ کر گئی ہے۔ خوش ہی ہو گی باپ بیاہی بیٹیوں پر پہرا دیں تو گھر نہیں بستے۔" رضوان نے چڑ کر کہا۔

"بیاہنے سے پہلے گھر کے ساتھ لڑکا دیکھا تھا؟ اُسے جانچا تھا؟ وہ صبا کو خوش رکھ سکتا ہے کہ نہیں؟" شمرین نے التجائیہ انداز میں کہا۔

"تمہاری کرتوتوں پر کوئی سوال نہ کرے اس لیے باپ کے گریبان کو آ رہی ہو؟" دادی کے سارے اوسان بحال ہو چکے تھے۔

"ایک سہیلی کے پاس اسلام آباد گئی تھی۔" شمرین نے لفظ چبا کر کہا۔

"بھاگی ہوئی بچی گھر آ جائے تو دنیا کو کیسے اطلاع

دی جاتی ہے؟" دادی نے پوچھا۔

"پاک دامن بیٹی زندہ سلامت آجائے تو سجدۂ شکر کیا جاتا ہے۔" شہرین نے جواباً گھورا۔ وہ اٹھ کر باپ کے پاس آئی۔

"صبا مکلاوے کے لیے آئی تھی؟" آگے سے خاموشی رہی۔

"چند دنوں کے لیے بلوالیں۔ اپنی چادر میں رہ کر ہی سہی مگر رسمیں پوری کریں۔ اُسے اور اس کے سسرال کو پتا ہونا چاہیے۔ اس کے آنسو نکلے تو حساب لینے والا کوئی ہے۔"

☆☆☆

"تمہیں نہیں معلوم میں چوروں سی زندگی گزار رہا تھا۔ خود سے زیادہ پڑھی بیوی لایا تھا۔ اسے میری قدر نہیں تھی۔ اسے کامیڈی شو ناپسند تھے میں نے دیکھنا چھوڑ دیے۔ ایک دو بار انگریزی ڈشوں کے نام غلط ہوگئے اس نے بھری محفل میں میری غلطی نکال کر میری انگریزی کا بھید کھول دیا۔" فہیم وضاحتیں دے رہا تھا۔

"چوری سے بچنے کے لیے آپ نے ڈاکا ڈال دیا۔ دوسری شادی ہی کرلی، بھابھی کا جو بھی رویہ ہو وہ آپ کی ہی دو بچیاں پال رہی ہیں۔ بے وفائی آپ کی طرف سے ہوئی ہے۔" رامش کی آنکھیں اب بھی بے یقینی کا شکار تھیں۔

"شاہانہ تھوڑے میں بہت خوش رہتی ہے۔ دن میں چار گھنٹے آتا ہوں وہ میرے لیے پکوان تیار کرتی ہے۔ مجھے سجتی ہے۔ میں اُسے نہیں چھوڑ سکتا۔" فہیم نے ضد کی۔

"یعنی ایک بیوی دنیا دکھاوے کے لیے اور دوسری خود کو بہتر محسوس کروانے کے لیے۔ آپ دونوں کے ہی مجرم ہیں۔" رامش کو اس کی خودغرضی پر غصہ آیا۔

"دیکھو رامش......"

"میں اپنی خاموشی کا کوئی سودا نہیں کروں گا۔ آپ بھابھی کو بتادیں دوسروں سے سننا زیادہ تکلیف دہ ہوگا۔"

☆☆☆

وہ کمرے سے بیزار ہو کر کچن میں گئی تھی۔ پھر وہاں سے اوبھ کر دوبارہ کمرے میں آگئی۔ اس نے فطری طور پر نعیم کو دیکھا۔ اب تک وہ جب بھی کمرے میں داخل ہوتی تھی نعیم جھرجھری لیتا تھا۔ صبا سمجھ گئی تھی نعیم لوگوں کی موجودگی میں اضطراب محسوس کرتا ہے۔ آج پہلی بار ہوا تھا نعیم اس کے کمرے میں آنے پر مسکرایا تھا۔ صبا کی سادگی معصومیت آہستہ آہستہ اس کی زندگی میں جگہ بنا رہی تھی، اُسے دنیا سے خطرہ محسوس ہوتا تھا مگر صبا سے خطرہ محسوس ہونا کم ہوگیا تھا۔

"مووی دیکھنے لگا تھا۔ آپ دیکھیں گی؟" اس ایک جملے کو بولنے کے لیے اس نے نظریں نہیں ملائی تھیں پھر بھی اسے اپنی ساری ہمت لگانی پڑی تھی۔

صبا کے جواب دینے سے پہلے فوزیہ نے کمرے کا دروازہ کھٹکھٹایا۔

"نعیم! باہر نکلو ساری چھٹیاں ختم ہوگئیں ماں کے پاس آکر نہیں بیٹھے۔" صبا نے دروازہ کھولا اور ڈر کر سائیڈ پر ہوگئی۔

"شگفتہ کا فون آیا تھا۔ رات کو کھانے پر بلا رہی ہے۔" فوزیہ اُکھڑی رہنے لگی تھیں۔

"ماما! مجھے ڈنر وغیرہ نہیں پسند۔" نعیم نے گھسی پٹی تاویلیں دینا شروع کی تھیں۔ فوزیہ نے بات کاٹ دی۔

"خود کو کمرے میں بند رکھو گے تو ایسا ہی ہوگا۔ باہر نکلو۔ آیا جایا کرو، لوگوں سے ملو یہ شرمیلا پن دور ہو۔" فوزیہ بیگم نے زور دینا شروع کردیا۔

"تم مجھے اپنے کپڑے دکھاؤ کوئی ماڈرن ڈریسنگ کرنا، میری بھابھی ایسی باتیں بہت نوٹ کرتی ہیں۔" فوزیہ کہتے ہوئے بڑھیں اور الماری کھول لی۔

"آ آچھوں۔" صبا نے زوردار چھینک ماری۔

"یہ لال والے کی فٹنگ کرواؤ اور یہ نیلا اچھا ہے۔ مگر اتنا سادہ۔" فوزیہ تبصرہ کررہی تھیں، نعیم انگلیاں مروڑنے لگا۔

"آچھوں، کھوں کھوں کھوں۔" صبا اب کھانسی۔

"وہ کل آئس کریم کھالی تھی نزلہ ہو رہا ہے۔" صبا نے سُڑ کر کے سانس اندر کیا۔

"اس حالت میں تمہیں کیسے لے کر جاؤں۔ کوئی سوال پوچھے گا تم کھانستی رہو گی۔" فوزیہ نے غصے سے الماری بند کی۔

"ڈنر ہو جاتا اچھا تھا۔ اب فون کر دیتی ہوں کسی اور دن کر لیں۔ شادی کی کوئی رونق نہیں ہوئی۔" وہ بڑبڑاتے باہر چلی گئیں۔

نعیم نے فوراً دروازہ بند کیا اور صبا کو دیکھا۔ اس بار صبا نے گھبرا کر نظر چرائی تھی۔

"وہ میرا ابھی دل نہیں کر رہا تھا۔" صبا نے بغلیں جھانکتے ہوئے کہا۔

نعیم کو پہلی بار اُس پر پیار آیا تھا۔ اس کی سوشل انگزائٹی کا مسئلہ بہت بڑا تھا۔ مگر یہ مسئلہ نازش سے منگنی کے بعد حد سے بڑھ گیا تھا۔ کیونکہ نازش اس کو سمجھنے کے بجائے اُسے باہر نکلنے، اجنبیوں سے ملنے پر اکساتی تھی۔ اس چکر میں نعیم کی نازش سے بھی دوستی نہیں ہو سکی۔ اسے صبا کا انداز نعمت لگا تھا۔ اس نے خاموشی سے مووی لگالی۔ دونوں ساتھ بیٹھ کر دیکھنے لگے۔ آدھی سے زیادہ مووی گزر چکی تھی جب زیتون نے آکر رضوان کی آمد کی اطلاع دی۔

☆☆☆

وہ بھول ہی گئی تھی۔ بے فکر شامیں کیسی ہوا کرتی تھیں۔ دھیمی روشنی، کیاریوں کے گرد نم گھاس اور رات کی مخصوص بھینی خوشبو۔ وہ اس مختصر گھر میں بھی اپنی الگ تھلگ دنیا میں بیٹھی تھی۔ کچھ دیر بعد اس کا فون گنگنانے اور جگمگانے لگا۔ اسکرین پر ڈاکٹر ماجد کا لنک لکھا آ رہا تھا۔

"ہیلو۔" اس نے مودب ہو کر کہا بس سلیوٹ کی کمی تھی۔

"آپ کیسی ہیں گھر پر سب خیریت ہے۔" ماجد نے نرمی سے پوچھا۔

وہ کیا کہتی۔ لڑکی خواہ شادی کرنے کے لیے گھر سے قدم نکالے یا شادی نہ کرنے کے لیے چوکھٹ پھلانگ جائے، باپ کی عزت پر دونوں صورتوں میں دھبا لگتا ہے۔ اب آدھا خاندان اس کے باپ کی سختی پر توبہ کر رہا تھا اور باقی خاندان اس کی ہٹ دھرمی کے قصے چسکے لے لے کر سن رہا تھا۔ ہر طرف چہ مگوئیاں تھیں اور یہ گرد بیٹھنے میں ابھی وقت لگنا تھا۔

"شمرین! آپ فون پر موجود ہیں؟" ماجد نے کہا۔

"جی میں ادھر ہی ہوں۔" وہ چونکی۔

"نہیں ادھر تو آپ نہیں ہیں اور آپ کی کمی شدت سے محسوس ہو رہی ہے۔" اس نے افسردگی سے کہا۔

"مجھے بھی ماریہ اور روشان یاد آ رہے ہیں بہت اچھا وقت گزر جاتا تھا۔" شمرین مسکرائی۔

ماجد کا بے وقت فون کرنا۔ گہری ذومعنی گفتگو شمرین کو کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ ماجد مایوس ہوا۔ سامنے کم عمر لڑکی تھی جس کے ارمان اس ہی کی طرح جوان ہوں گے۔ کہاں وہ دو بچوں کا باپ۔ اس نے شمرین کو فون کر کے غلط کیا۔

"ابھی کیاری کی گیلی مٹی کے پاس بیٹھی تھی۔ بچپن میں مٹی پر پانی چھڑک کر میں اسٹاپو کی لکیریں کھینچ لیتی تھی۔ ماریہ ہوتی تو اس کو دکھاتی۔" شمرین اپنی لے میں بولی۔

"میں بھی اکثر سوچتا ہوں بچوں کو گاؤں کی زندگی دکھاؤں۔ ہم بچپن میں سائیکل کو کھڑا کر کے وکٹ بناتے تھے۔ ہر روز بحث ہوتی تھی کہ پہیہ چل رہا ہے مطلب آؤٹ ہے۔" ماجد کا بات کرنے کا دل کر رہا تھا سو کرتا جا رہا تھا۔

"میں بھی آپ جیسا محسوس کرنے لگی ہوں۔ لگتا ہے میں حیا کی ماں ہوں۔ سارا دن سوچتی رہتی ہوں وہ تھک نہ گئی ہو۔ وہ اس شادی سے خوش ہو۔" کبھی فاصلے نزدیک لے آتے ہیں ان دونوں کے ساتھ یہی ہو رہا تھا۔

"ہمارے بیچ میں بہت فرق ہے۔ مجھے لگتا ہے میں نے بچے پال پوس کر خود مختار کر دیے ہیں۔ تھک

جائیں تو خود ہی آرام ڈھونڈ لیتے ہیں۔ بھوک بعد میں لگتی ہے، الماریوں اور فریج میں بھرا کھانا وہ پہلے کھا لیتے ہیں۔" وہ باپ تھا جو بچوں سے دور ہوتا جا رہا تھا۔

"ایسا بالکل نہیں ہے۔ ابھی ہر موقع پر ان کو آپ کی ضرورت پڑتی ہے۔ وہ پلٹ پلٹ کر آپ کے پاس آئیں گے۔" شمرین نے تسلی دی۔

"علیزے کے بعد انہیں شاید لگا کہ اپنا آپ خود سنبھالنا ہے۔ میں نے بڑھ کر سہارا جو نہیں دیا۔" ماجد اتنا کھل کر عام حالات میں بات نہیں کرتا تھا۔

"ایسا اس لیے لگ رہا ہے۔ کیونکہ آپ ساتھ میں وقت نہیں گزارتے۔ آپ اپنے ابا کا گھر بیچنے کی بجائے اس کو ٹھیک کروالیں ویک اینڈ پر بچوں کو لے جایا کریں۔ اس ویک اینڈ پر گاڑی نکالیں اور سفر پر نکل جائیں پھر فرق دیکھیے گا۔"

کتنی ہی دیر وہ ادھر ادھر کی باتیں کرتے رہے۔ جب فون بند ہوا تو پرسکون شام کی جگہ بے وقت اداسی نے لے لی۔

"کتنے بڑے ڈاکٹر ہیں۔ امیر ہیں۔ پڑھے لکھے لوگوں میں اٹھنا بیٹھنا ہے اور تم کیا سوچ رہی ہو۔" شمرین نے اپنے ہی سر پر چپت لگائی۔

☆☆☆

"دیکھیں بھائی صاحب! یوں اچانک آپ آجائیں گے اور حبا کو لے جانے کی بات کریں گے تو ایسا نہیں ہوسکتا کوئی طریقے اور اصول ہوتے ہیں۔" فوزیہ سمدھی کی آمد سے حیرت میں تھیں انہیں تو لگا تھا رضوان عید کا چاند ہوجائے گا۔

"بھابھی جی! آپ لوگ اچانک رشتہ اور رخصتی لینے آئے تھے۔ ہم نے دے دی۔ اپنوں میں اتنی گنجائش ہوتی ہے۔ ویسے میرے پاس آپ کا نمبر نہیں تھا۔ میں نعیم بیٹے سے پوچھ کر آیا ہوں۔ اس نے کہا تھا دو دن بعد حبا کو لے جایئے گا۔ بس میں چڑھ کر میں نے بہزاد بھائی کو بھی بتا دیا تھا۔" رضوان کا لہجہ ہمیشہ کی طرح ملتجیانہ تھا۔

فوزیہ نے فوراً بیٹے اور شوہر کو گھورا۔ ان کی تو پوں کا رخ دوسری سمت ہوچکا تھا۔ فوزیہ نے منہ سجالیا تھا مگر اس کے آگے وہ کچھ نہیں کرسکتی تھیں۔ حبا اس گھر کی بہو تھی۔ اس کا وہی مقام تھا جو فہیم کی بیوی دانیہ کا تھا۔ یہ بات انہیں پسند نہیں تھی مگر سمجھ میں آگئی تھی۔

☆☆☆

وہ چلائی نہیں، اس نے توڑ پھوڑ نہیں کی۔ دل کے کسی کونے میں اسے توقع تھی۔ بیوی کو میکے بٹھا کر اتنے مہینے وہی شخص سکون سے رہتا ہے جس کے ارمان کہیں اور پورے ہورہے ہوں۔

"ماما! کیا ہوا۔" اقصیٰ نے بڑھ کر ماں کے آنسو پونچھے۔ فہیم اس کے پاؤں پڑ کر معافیاں مانگ کر کچھ دیر پہلے ہی جاچکا تھا۔

"سب ٹھیک ہے، آپ کھیلو۔"

وہ ننگے پاؤں بکھرے بال ہی کمرے سے نکلی تھی۔ بچوں کے ذہن پر یہ نقش نہیں پڑنے چاہیے تھے۔ وہ ٹکراتی چکراتی حبا کے دروازے پر پہنچی۔ حبا اپنا بیگ پیک کررہی تھی۔

"بھابھی کیا ہوا؟" حبا نے سہارا دیا۔

"تم خوش ہو؟ کیسے خوش ہو؟ میں تو خوش رہ نہیں سکی۔ نہ رکھ سکی۔ لیکن میں وفادار رہی، فہیم تو وہ بھی نہیں کرسکا۔" دانیہ پھوٹ پھوٹ کر رو پڑی۔

وہ اتنی تنہا پڑچکی تھی کہ حبا کو سب کہہ سنایا۔

"فہیم بھائی کو یہ نہیں کرنا چاہیے تھا۔" حبا کا دل کانپا۔

"وہ بچیوں کی خاطر ازالہ کرنا چاہتا ہے۔ اس نے معافی مانگی ہے۔ جانتی ہو سب سے زیادہ مجھے کس بات کا دکھ ہے؟" دانیہ کی آنکھیں خوف ناک حد تک پھیل گئیں۔

"دکھ ہے کہ میں اسے معاف کردوں گی۔ کیونکہ مجھے اس سے محبت ہے۔ یہ محبت ہی عورت کو لے ڈوبتی ہے۔ تمہیں بھی نعیم جیسے کورے انسان سے محبت ہوگئی ہے نا؟" وہ دیوانگی کے عالم میں تھی۔

"میں ان کی بہت عزت کرتی ہوں۔" حبا نے سنبھل کر کہا۔

''عزت؟'' دانیہ نے جیسے پہلی بار یہ لفظ سنا تھا۔ وہ فہیم سے محبت کرتی تھی مگر عزت کرتی ہوتی تو بات بے بات پڑھائی کا طعنہ نہ دیتی۔ فہیم اس سے ڈرتا تھا عزت وہ بھی نہیں کرتا تھا۔ دانیہ کو اب سمجھ میں آیا ان کے رشتے میں تعلیم کی کمی نہیں تھی۔ کمی تھی تو عزت اور احترام کی تھی۔

☆☆☆

وہ کیفے میں بیٹھا لیپ ٹاپ پر کام کر رہا تھا۔ کام ختم کر کے وہ ویٹر کو سامان پر نظر رکھنے کا کہہ کر باتھ روم کی طرف گیا۔ جی۔ای۔این۔ٹی۔ایس یعنی جینٹس لکھا ہوا تھا۔ لیکن دروازہ کھول کر آتشی گلابی سوٹ پہنے شاہانہ باہر نکل رہی تھی۔

''یہ مردانہ واش روم ہے۔'' رامش نے اسے بتایا۔

''اوہ! اچھا میں جلدی میں چلی گئی تھی تم ادھر کیسے۔'' شاہانہ نے مہارت سے بات سنبھال لی۔

رامش واش روم سے ہو کر آیا تو شاہانہ کے سامنے جا بیٹھا۔

''میں فہیم بھائی کا کزن ہوں۔'' دوبارہ تعارف کروانا ضروری ہو گیا تھا۔

''اس نے بتایا مجھے۔ ابھی ڈرامہ پروڈیوسر ملنے آئے تھے۔ ایک رول آفر کر رہے تھے۔'' شاہانہ دوسری بیوی تھی۔ بنا مانگے کردار کی وضاحت دینے لگی۔

''آپ کو پڑھنا نہیں آتا؟'' رامش نے دوسری تصدیق چاہی۔

''میں نے ان پڑھ ہو کر بھی اپنے سارے بہن بھائی پالے ہیں۔'' شاہانہ نے فخر سے کہا۔

''فہیم بھائی آپ کو چھوڑنا نہیں چاہتے۔'' رامش نے شاہانہ کے تاثرات جانچے۔

''مجھے انڈیا سے بھی پنجابی فلموں کی آفر آ رہی ہے۔ مگر میں انکار کر دیتی ہوں۔ میں فہیم کے ساتھ خوش ہوں۔'' اس نے اپنی قربانیاں گنوائیں۔

''چار گھنٹے تی دن کا شوہر۔ آپ خوش کیوں ہیں؟ دو بچیوں کے باپ کو ان سے دور رکھ کر خوش ہونا بنتا تو نہیں۔''

''میں گھر توڑنے والی نہیں بننا چاہتی تھی۔ مجھے صرف اچھا شوہر چاہیے تھا۔'' شاہانہ نے وارفتگی سے کہا۔

''اچھا شوہر ایسا نہیں ہوتا۔''

☆☆☆

حبا یہ دو دن آئی تو جیسے سالوں کی ہمت جمع ہو گئی۔ جلد بازی میں ہوئی تھی مگر شادی ہوئی تھی۔ انتخاب بھی ان کی طرف سے ہوا تھا۔ حبا کو خود پر حوصلہ آنے لگا۔ وہ اپنے فرائض ضرورت سے زیادہ جانتی تھی اب حق بھی سمجھ رہی تھی۔ وہ گھریلو ملنسار لڑکی تھی سب صحیح رہا تو وہ جلد اس گھر کا اہم حصہ بن جائے گی۔

کھانے کی دعوت رضوان سب کو دے کر آیا تھا۔ مگر نعیم اکیلا نکلا تھا۔ شمرین صفائیاں کر رہی تھی کھانے پکا رہی تھی اور حبا کو آرڈر تھا بس اپنا آپ سنوارے۔ ہر بیل پر حبا کا دل نکل جاتا۔ بالآخر جب نعیم آیا تو گاڑی کے ہارن سے اطلاع ہوئی۔ حبا نے ہی بڑھ کر دروازہ کھولا۔ شمرین بھی باپ کو فون کر کے باہر آ گئی۔ نعیم اکیلا نہیں تھا۔ اس کے ساتھ رامیش بھی تھا۔

رامش نہیں بدلا تھا، وہ ویسا ہی تھا۔ تھوڑی جھجک کچھ اپنے آپ میں گمن اور شمرین میں بے شمار دلچسپی۔ فرشی دسترخوان پر نعیم بھی نہیں کھا سکتا تھا۔ ان دونوں کو صوفوں پر کھانا دیا گیا تھا۔

''میں تو نیچے ہی بیٹھوں گا۔'' رامش نے کہا اور آلتی پالتی مار کر نیچے بیٹھ گیا۔ وہ بہت کچھ ثابت کرنے آیا تھا۔

حبا نعیم کی سادگی پر ہنس رہی تھی۔ نعیم نے عرصے بعد تار والا فون اور ہاتھ والا پنکھا دیکھا تھا۔ حبا اس کی تمام حرکتوں سے محظوظ ہو رہی تھی اور جان جان کر وہ چیزیں دکھا رہی تھی جس پر وہ چونکے۔

شمرین سمجھ گئی تھی رامش نہیں بدلا یہ تو وہ تھی جو پہلے جیسی بالکل نہیں رہی تھی۔ رامش کی کوئی بھی کوشش اس کے دل پر اثر نہیں کر رہی تھی۔ کھانے کے بعد وہ سامنے والی کیاری میں مچھروں کا کوائل لگا رہی تھی۔ نعیم اور حبا دادی کے ساتھ پھپھو کو ملنے گئے تھے۔ رضوان گھر

پر ہی کہیں موجود تھا۔

"پہلے لالٹین کی روشنی جلاتی تھی اب مچھروں کے کوائل پر آ گئی ہو۔" رامش نے ہنس کر کہا۔

"وہ وفا کا دیپ اب بجھ چکا ہے رامش۔" شہرین اٹھ کھڑی ہوئی۔

"میں آ گیا ہوں ہم مل کر دوبارہ جلالیں گے۔ میں جان گیا ہوں مجھے کیا چاہیے۔" رامش پرجوش تھا۔

"اب میں وہ شہرین نہیں رہی جو تمہاری زندگی کا حصہ بننے کے لیے کچھ بھی کرنے کو تیار تھی۔ وہ تنہا سفر جو میں نے کیا تھا۔ اس نے ہر پچھلے رشتے کی اہمیت دھندلا دی ہے۔" شہرین نے بے بسی سے کہا۔

"یہ تمہارا غصہ ہے۔ میں ازالہ کرنے آیا ہوں۔ تم نہ بدلنا۔ تمہاری خاطر میں بدل لوں گا۔" اتنا بڑا دعویٰ اس نے اس محبت کے باعث کیا تھا۔ جس کا اب وہ کھل کر اقرار کرتا تھا۔

"تمہیں پچھلی بار دیکھ کر احساس ہو گیا تھا۔ مجھے تم پر غصہ نہیں ہے۔ مجھے افسوس ہے۔ اس دن تم نے میرا فون نہیں اٹھایا۔ لیکن افسوس ہے غصہ نہیں۔" اس نے ہر لفظ کو اہمیت دے کر کہا۔

"میں نے نکاح سے انکار نہیں کیا تھا۔ میں تمہیں اکیلا ہرگز نہیں چھوڑنے والا تھا۔" رامش نے اپنی چھوٹی سی بے وفائی کی بڑی وضاحتیں دی تھیں۔

"ساتھ رہ کر تم نے اکیلا کر دیا تھا۔ میں نے اکیلا رہنا سیکھ لیا ہے۔ بعض دفعہ وقت رہتے جو حق ادا نہ کیے جائیں ان کا تمام عمر ازالہ کرتے رہنے سے بھی بھرپائی نہیں ہوتی اور ہمارا وقت گزر چکا ہے۔"

شہرین کے لہجے روکھا نہ بھی ہوتا تو بھی رامش سمجھ لیتا کیونکہ اس کی نگاہوں میں رامش کے لیے کوئی جذبہ نہیں تھا۔ اسے یقین نہیں آیا کہ اس کے ساتھ یہ ہو گیا تھا۔ یہ وہ شہرین تھی ہی نہیں۔ لیکن وہ کیا کرتا اب والی شہرین سے اسے پہلے سے بھی زیادہ محبت محسوس ہو رہی تھی۔

"میں اس ہی وقت تمہارے ابو سے بات کر لیتا ہوں۔ میں اب غائب نہیں ہوں گا۔"

"تم نے سنجیدہ ہونے میں اتنی دیر لگا دی کہ اب ہر دعویٰ مضحکہ خیز لگتا ہے۔" شہرین نے اس بار اس کا دل ہی چیر دیا۔

"یہ ہمارے ساتھ کیا ہو گیا؟"

رامش ٹھوس کردار کی اس لڑکی کو دیکھ کر اچنبھے میں تھا۔ اس شہرین میں بے تکا پن نہیں تھا۔ وہ اعتماد سے بچی ہوئی روٹی کے ٹکڑے کر کے مٹی کے برتن میں ڈال کر دیوار پر رکھ رہی تھی۔ اسے اب اپنے اطوار پر شرمندگی نہیں ہوتی تھی۔ اس شہرین کو اپنی جڑوں پر فخر تھا۔ اب وہ اعلا ترین ماحول میں جا کر بھی اپنے جھنڈے گاڑ سکتی تھی۔ کیونکہ وہ کھری تھی۔ اور اصلی کو بناوٹی پر ہر جگہ فوقیت ملتی ہے۔

"چلتا ہوں، اب میں تمہارے قابل نہیں رہا۔" رامش بہت دکھ کے ساتھ پلٹ گیا۔

☆☆☆

شاہانہ نے فہیم کو چھوڑ دیا تھا۔ کچھ دن گزرے دانیہ کے رویے میں واضح بدلاؤ آ گیا۔ فہیم نے سبق سیکھا یا دکھ تھا۔ اس نے آوارہ گردیاں چھوڑ دیں۔ وہ دونوں اچھے انسانوں کی طرح اپنی بچیوں کا خیال رکھنے لگے۔ مستقبل میں دانیہ کے ساتھ سب ٹھیک ہو جاتا تھا۔ مگر فہیم نے جلد بازی میں آوارگی کے جو چسکے چکھے تھے اس نے ہمیشہ کے لیے اس کی زندگی میں ایک کسک چھوڑ دی تھی۔

حبا نے خیریت سے پہنچ کر فون کر دیا تھا۔ نعیم دنیا کے لیے ویسا ہی تھا اور اس میں بہت زیادہ بدلاؤ نہیں آتا تھا۔ مگر وہ حبا کے لیے ہر لحاظ سے ٹھیک تھا۔ حبا ان جانے میں اس کا وہ سہارا بن گئی تھی۔ جس کے پیچھے وہ دنیا سے چھپ سکتا تھا۔ حبا مضبوط ہوتی گئی اور نعیم اس پر مزید مہربان ہوتا گیا۔

☆☆☆

بجلی گئے ہوئے چھ گھنٹے ہو چکے تھے۔ ایمرجنسی لائٹ کی بیٹری بھی ختم ہو چکی تھی۔ اس لیے شہرین نے موم بتی جلا کر صحن میں رکھ دی۔ دروازے پر دستک ہوئی تھی۔ گو کہ رضوان کے آنے کا ٹائم تھا مگر باہر اتنی چہل

پہل تھی کہ شہزین کو یقین ہو رہا تھا۔ آنے والا رضوان نہیں ہو سکتا۔ شہزین نے دروازہ کھول دیا۔

"آپ نے بابا کو کہا تھا کہ روڈ ٹرپ پر چلیں۔" روشان سامنے کھڑا گھور رہا تھا۔ شہزین نے خوشی میں اسے گلے لگالیا۔

"کیسی ہو پارٹنر؟" روشان راستے میں جتنا بھی غیر آرام دہ رہا تھا شہزین کو دیکھ کر خوش ہو گیا تھا۔

"شہزین۔" ماریہ دوڑتی ہوئی آئی تھی۔

"ہیلو......" پیچھے ڈاکٹر ماجد کھڑے تھے۔

شہزین کا دل خوشی سے بند ہونے لگا۔

"ہٹو سارے مجھے آگے آنے دو۔ میں تو لڑکی والی ہوں۔" گاڑی کے کسی کونے سے شانزے برآمد ہوئی تھی۔ اس نے جو کہا اس پر سب ہی شرمندگی سے پسینہ پسینہ ہوئے تھے۔

شہزین بچی نہیں تھی جو یہ بات سمجھ نہ سکے۔ بچوں نے مڑ مڑ کر شانزے کو گھورا۔

"اچھا میرے منہ سے نکل گیا۔ میرے نمبر کاٹ لینا۔ ابھی اندر تو چلو۔" شانزے نے کان پکڑ کر کہا۔ سب اندر چلے گئے۔ مگر ماجد اور شہزین سے اس کے بعد ایک دوسرے سے نظریں نہ ملائی گئیں۔

☆☆☆

شہزین کے علاوہ باقی سارے ہی سیٹ تھے۔ دادی کی اجڑی ہوئی ملنساری عود آئی تھی۔ شانزے تو جیسے پکی سہیلی بن گئی تھی۔ رضوان بھی مہمانوں کی آمد پر خوش تھا۔ ان کا گیسٹ ہاؤس میں کمرا ایک تھا۔ مگر موسم اچھا تھا اس لیے بچے اور شانزے رات ادھر ہی رک گئے تھے۔

"تم اتنی چپ کیوں ہو؟" شانزے اس کے پاس لیٹی تھی۔

"تم نے یہ کیوں کہا کہ تم لڑکی والی ہو؟" شہزین بہت غیر آرام دہ تھی۔

"کیونکہ میں لڑکی والی بن کر تمہاری خوشی جانچنے آئی ہوں۔ تم مسز ماجد بننے پر خوش ہو تو ہم بات بڑھائیں گے ورنہ تم سے مل کر چلے جائیں گے۔ اور ایسے ہی بھی روڈ ٹرپ لگاتے رہیں گے۔" شانزے نے پیار سے کہا۔

بچے نیچے میٹرس پر سو رہے تھے۔

"تم نے میرا گھر دیکھا ہے۔ اور ڈاکٹر ماجد کا رہن سہن دیکھا ہے؟" شہزین اٹھ بیٹھی۔

"ایسی بات وہ تم دونوں کی عمر کے بارے میں کر رہے تھے۔" شانزے ہنسی۔

دونوں کو لگتا تھا وہ ایک دوسرے کے قابل نہیں۔

شہزین کو تسلی دینے میں اسے ساری رات لگ گئی۔ شہزین کی صبح آنکھ کھلی تو سب سو رہے تھے۔ موبائل پر ڈاکٹر ماجد کا میسج آیا ہوا تھا۔

"آج کون سا گانا گنگنا رہی ہو؟" وہ اس کی عادتوں کو بھولا نہیں تھا۔

"دل دھڑکے میں تم سے یہ کیسے کہوں؟" شہزین نے میسج کر کے جلدی سے موبائل بستر پر دور پھینک دیا۔ جیسے اب یہ موبائل اٹھ کر اسے کاٹ لے گا۔ پھر خود سے ہی مسکراتے ہوئے چادر میں دبک گئی۔

☆☆☆

روشان ماریہ جب اقرار کی خوش خبری لے کر گیسٹ ہاؤس پہنچے تو بادل چھا رہے تھے۔ ماجد پہلے ہی مسکرا رہا تھا۔

"بابا! اب اگلا روڈ ٹرپ کریں گے تو بارات لے کر آئیں گے۔" ماریہ نے خوشی سے اعلان کیا۔

"لگتا ہے بابا زیادہ خوش نہیں ہوئے۔" روشان نے باپ کی خاموشی کو دیکھ کر سوچا۔

اتنے میں بادل برسنے لگے۔ ماجد اٹھا اور ہلکی پھوار میں جا کھڑا ہوا۔

"بابا اور بارش؟" روشان کا منہ کھل گیا۔

ماجد نے خوشی سے ہاتھ اٹھائے اور ہلکا ہلکا ڈانس کرنے لگا۔

"بابا اور بارش میں ڈانس۔" ماریہ کو بھی یقین نہیں آیا۔ پھر سارے دوڑ کر بارش میں چلے گئے اور اچھلنے لگے۔ تھوڑی دور شہزین اپنے آنگن میں ویسے ہی مسرور تھی۔ اس کی وفا کے دیپ کو پروانہ مل گیا تھا۔

☆☆

قرۃ العین خرم ہاشمی

"فائزہ! کیا ہوا؟ تم کیوں رو رہی ہو؟ عاصم بھائی اور احمر تو ٹھیک ہیں نا؟"

کاشف کے لیے کپ میں چائے ڈالتی تانیہ نے چونک کر شوہر کے پریشان چہرے کی طرف دیکھا۔ اکلوتی اور تین سالہ چھوٹی بہن کا فون سنتے ہی کاشف ناشتا کرنا بھول گیا تھا تانیہ فکرمندی سے شوہر کے چہرے کے اتار چڑھاؤ دیکھنے لگی۔

"تم نے تو مجھے ڈرا ہی دیا۔ اچھا اب رونا بند کرو۔ میں تانیہ سے کہہ دوں گا دوپہر میں گاڑی بھیج دے گی۔ تم تیار رہنا۔ ہاں شام میں بات کریں گے۔" کاشف نے نرم لہجے میں کہا اور فون بند کر دیا۔

"ناشتا ٹھنڈا ہو گیا ہے۔ سب خیریت ہے؟"

تانیہ نے سنجیدگی سے سوال کیا۔ اسے اندازہ تو تھا کہ بات اتنی بڑی ہرگز نہیں ہوگی، جتنا فائزہ شور مچا رہی ہے۔ کیونکہ فائزہ کو رائی کا پہاڑ بنانا آتا تھا۔

"عاصم کو کمپنی ایک اہم پروجیکٹ کے سلسلے میں تین مہینے کے لیے کراچی بھیج رہی ہے۔ اسی وجہ سے پریشان ہو گئی ہے کہ عاصم کے بغیر اکیلے کیسے رہے گی؟" کاشف نے سر جھٹکا۔

"یہ کیا بات ہوئی بھلا؟ جیسے سب رہتے ہیں، ویسے بھی اس کی ساس بھی گاؤں سے آ جاتی ہیں۔" تانیہ نے منہ بنا کر کہا۔ کاشف نے سر ہلایا

"اچھا! میں چلتا ہوں۔ آج بہت اہم میٹنگ ہے۔" کاشف نے جلدی سے کہا۔

"مگر ناشتا...!" تانیہ نے فکرمندی سے پکارا۔

"آفس میں کچھ لے لوں گا۔" کاشف کہہ کر ڈائنگ روم سے باہر چلا گیا۔

تانیہ نے گہری سانس لے کر بھری ہوئی میز پر نگاہ دوڑائی۔ اتنے بڑے گھر میں اس وقت خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ زوہیب اور حسن کے امتحان ہو رہے تھے۔ اس لیے آج کل وہ دونوں رات دیر تک پڑھتے اور صبح دیر سے اٹھتے تھے۔ زوہیب ساتویں جماعت میں تھا جبکہ حسن نویں جماعت کا طالب علم تھا۔ تانیہ چائے پیتے ہوئے مسلسل فائزہ کے بارے میں سوچ رہی تھی کہ اب وہ بھائی سے نیا کیا مطالبہ کرے گی؟

☆☆☆

"میری زندگی سے تو مشکلات کم ہی نہیں ہوتیں۔"

حسب معمول فائزہ نے بات کا آغاز شکوے

سے کیا تھا۔ کاشف کے کہنے کے مطابق تانیہ نے شام چار بجے اندرون شہر کے چھوٹے سے محلے میں رہنے والی فائزہ کو لینے کے لیے گاڑی بھیج دی تھی۔ فائزہ اپنے بیٹے احمر کے ساتھ جب بھائی کے خوب صورت اور جدید انداز میں سجے گھر میں پہنچی تو اس کے اندر حسد اور احساس کمتری ایک ساتھ جاگے تھے۔ اسے اپنی کم مائیگی کا احساس شدت سے ہوا۔ اس لیے سلام دعا کے بعد، نم آنکھیں لیے وہ اپنی بد نصیبی کا شکوہ کرنے لگی۔

"کتنی بار کہا ہے کہ ایسی باتیں مت کیا کرو۔ مت بھولو کہ میں ہمیشہ تمہارے ساتھ ہوں۔" کاشف نے سنجیدگی سے کہا۔

تانیہ اپنی نگرانی میں ملازمہ سے چائے بنوا رہی تھی۔ اس نے چائے پر خاصا اہتمام کرلیا تھا۔

"میکے کے نام پر اب صرف آپ ہی تو نظر آتے ہیں۔ اماں تو تین سال پہلے مجھے چھوڑ گئیں۔ باپ تو ہمارے بچپن میں ہی......" فائزہ نے ہمیشہ کی طرح تلخ اور دکھی باتوں کو یاد کیا۔

احمر، زوہیب کا ہم عمر تھا دونوں ایک ہی کلاس میں تھے مگر الگ الگ اسکول میں۔ زوہیب شہر کے مشہور امریکن اسکول میں زیر تعلیم تھا جبکہ احمر محلے کے عام اسکول میں پڑھ رہا تھا مگر احمر بہت ذہین اور حساس بچہ تھا۔ فائزہ کی نسبت، بہت رکھ رکھاؤ والا اور سوبر۔ کیونکہ احمر کی تربیت میں زیادہ ہاتھ اس کے باپ اور دادی کا تھا۔ جو بہت خود دار فطرت کے مالک تھے اور یہ سبق ہی ہمیشہ احمر کو پڑھایا۔ اس لیے احمر اپنے ماموں کے گھر آ کر کبھی بھی ان کی دولت یا مہنگی چیزوں سے متاثر نہیں ہوتا تھا۔ زوہیب کے ساتھ کھیلتا، انجوائے کرتا اور پھر گھر جا کر بھول جاتا۔ اس نے کبھی ماں سے ضد نہیں کی تھی کہ زوہیب جیسے کھلونے یا گیمز اسے بھی چاہئیں۔ جبکہ فائزہ کا دل کرتا تھا کہ بھائی کے گھر سے ہر چیز اٹھا کر لے جائے۔

"آپ دونوں نے تو سارا ماحول ہی اداس کر دیا۔ فائزہ اپنا موڈ ٹھیک کرو اور عاصم کے جانے کے بعد کچھ دن ہمارے گھر آ کر رہ لینا۔ دل بہل جائے گا۔"

تانیہ نے مسکرا کر کہا تو کاشف کو بھی یہ آئیڈیا بہت پسند آیا۔ اس نے فوراً ہاں میں ہاں ملائی۔

فائزہ جو کچھ سوچ کر آئی تھی۔ تانیہ کی بات سن کر جھجک کر چپ کر گئی۔ سارا دن بھائی کے گھر گزار کر شام کو کاشف خود اسے اور احمر کو گھر چھوڑ کر آیا۔ واپسی میں فائزہ کے دونوں ہاتھوں میں ڈھیر سارے شاپرز تھے جو اس کی ان فرمائشوں سے بھرے ہوئے تھے جنہیں پورا کرنے میں کاشف نے ایک منٹ بھی نہیں لگایا تھا۔

☆☆☆

"فائزہ! جلدی سے چائے لے بھی آؤ۔ مجھے ابھی پیکنگ بھی کرنی ہے۔"

لاؤنج میں احمر کے ساتھ بیٹھے عاصم نے کچن کی طرف منہ کر کے آواز لگائی۔ کچھ دیر میں فائزہ چائے کی ٹرے اٹھائے مسکراتی ہوئی اندر داخل ہوئی۔ چائے کے ساتھ بیکری کے کئی آئٹم دیکھ کر عاصم نے گہری سانس لی تھی۔

"تم نے پھر اپنے بھائی سے فرمائش کر کے یہ سب لیا ہے؟" عاصم نے سنجیدگی سے سوال کیا تو فائزہ نے اٹھلا کر اس کی طرف دیکھا۔

"ہاں تو کیوں نہ فرمائشیں کروں؟ میرا اکلوتا بھائی ہے۔ اس کے پیسوں پر میرا بھی حق ہے۔ اچھا بحث چھوڑیں۔ یہ کیک رس مشہور بیکری کے ہیں اور یہ بسکٹ بھی۔" فائزہ نے خوشی سے کہتے ہوئے پلیٹ عاصم کی طرف بڑھائی تو اس نے نرمی سے منع کر دیا۔

"میرا میٹھا کھانے کو دل نہیں کر رہا۔ اچھا! میری بات توجہ سے سنو۔" عاصم نے اصل مدعا کی طرف آتے ہوئے کہا۔ "اس محلے میں رہتے ہوئے ہمیں کئی سال ہو گئے ہیں۔ سب بہت اچھے اور ملنسار ہیں۔ میں گاؤں سے اماں جی کو بھی بلا لیتا ہوں۔ تم سکون سے احمر کے ساتھ رہنا۔ کسی چیز کے

لیے فکر مند مت ہونا اور......!" عاصم نے کچھ کہنا چاہا مگر فائزہ نے اس کی بات کاٹ دی۔

"اماں جی تو اتنی بیمار رہتی ہیں۔ ان کی یہاں ضرورت نہیں ہے۔ میں سب دیکھ لوں گی۔ آپ فکر مت کریں۔"

فائزہ نے چائے میں بسکٹ ڈبو کر کھاتے ہوئے کہا تو عاصم نے گہری سانس لی۔ وہ جانتا تھا کہ فائزہ کا سارا زور اپنے میکے پر ہی چلے گا۔

"بابا! میں آپ کو بہت یاد کروں گا۔" احمر نے اداسی سے کہا تو عاصم نے اسے گلے لگا لیا۔

"میں بھی!" عاصم نے محبت سے کہتے ہوئے اس کی پیشانی چومی تھی۔

☆☆☆

"مما! ہم اتنا سامان لے کر کیوں جا رہے ہیں؟"

احمر جو دو دن سے ماں کی تیاریاں دیکھ رہا تھا۔ پریشانی سے پوچھنے لگا۔

"ہم مزے سے تین مہینے تمہارے کاشف ماموں کے گھر رہیں گے۔ جب تک تمہارے بابا واپس نہیں آجاتے۔" فائزہ نے چالاکی سے کہا۔

"مگر کیوں؟ یہاں سے میرا اسکول قریب ہے۔ وہاں سے روز کیسے آؤں گا؟" احمر نے فکر مندی سے کہا۔

"تمہارے ماموں کے گھر دو بڑی بڑی گاڑیاں ہیں۔ ایک پہ تم سکول چلے جانا۔"

فائزہ نے اطمینان سے کہا جیسے سب کچھ سوچے بیٹھی تھی۔

فائزہ اور احمر جب اپنے بڑے بیگ اٹھائے کاشف کے گھر پہنچے تو تانیہ اتنا سامان دیکھ کر چونک گئی مگر اس نے فوراً کوئی سوال نہیں کیا۔ شام کو کاشف گھر آیا تو فائزہ کو دیکھ کر بہت خوش ہوا۔ کھانے کے بعد فائزہ نے کاشف سے اصل بات کی۔

"بھائی! عاصم گھر پر نہیں ہیں۔ میرے لیے وہاں اکیلے رہنا بہت مشکل ہے۔ اس لیے میں احمر کو لے کر یہاں آگئی ہوں۔"

فائزہ نے پریشانی سے کہا تو کاشف حیران رہ گیا۔

"ٹھیک ہے۔ جیسا بہتر سمجھو مگر احمر کے اسکول کا کیا کرو گی؟" کاشف نے سنجیدگی سے سوال کیا۔

"آپ کا ڈرائیور اسے چھوڑ آیا کرے گا اور دوپہر میں لینے چلا جائے گا۔" فائزہ نے خوشی سے کہا۔

"فائزہ! برا مت ماننا! مگر وہ علاقہ یہاں سے بہت دور ہے۔ ایک دن کی بات ہو اور ہم کچھ کر بھی لیں مگر ہر روز پک اینڈ ڈراپ دینا ممکن نہیں ہوگا۔" تانیہ نے فوراً ٹوکا۔ کاشف نے بھی اثبات میں سر ہلایا۔ فائزہ کے چہرے کا رنگ اڑ گیا۔

"میں احمر کے لیے وین والے سے بات کر لوں گا۔ تین مہینے کی بات تو ہے۔" کاشف نے لاپروائی سے کہا اور اٹھ کر اپنے کمرے میں چلا گیا۔ تانیہ بھی شب بخیر کہہ کر چلی گئی۔ فائزہ اور احمر ایک دوسرے کی طرف دیکھتے رہ گئے۔

"مما! میں اتنی دور وین میں کیسے جاؤں گا؟ آپ گھر واپس چلیں۔ وہاں سے تو میں پیدل اسکول چلا جاتا تھا۔" احمر نے منہ بنا کر کہا۔

"کچھ نہیں ہوتا۔ اچھا ہے وین میں مزے کرتے ہوئے جانا۔" فائزہ نے لاپروائی سے کہا تو احمر جھنجلا کر رہ گیا۔

☆☆☆

"میں جانتا ہوں کہ تمہیں فائزہ کا یہاں رہنے کا فیصلہ پسند نہیں آیا ہے۔" کمرے میں آکر کاشف نے سنجیدگی سے کہا تو تانیہ نے تیکھی نگاہ شوہر پر ڈالی۔

"ایک ہی شہر میں رہتے ہوئے تین مہینے بھلا کسی اور کے گھر جا کر رہنے کی کیا ضرورت ہے؟ عجیب عورت ہے اپنے بیٹے کی تکلیف کا بھی احساس نہیں۔ اتنی گرمی میں ہر روز وین میں آنا اور جانا آسان نہیں ہوگا مگر......" تانیہ کہتے ہوئے چپ

ہوگئی۔کاشف نے اثبات میں سر ہلایا۔

"میں فائزہ کا بھائی ہوں۔اس کے مزاج کے سب رنگوں سے واقف ہوں۔ میں اس کی بہت سی باتوں کی اسی وجہ سے نظر انداز کر دیتا ہوں کیونکہ میری ماں نے مرتے وقت بہن کا خیال رکھنے کا حکم دیا تھا۔میں ان کی بات نہیں ٹال سکتا۔" کاشف نے اداسی سے کہا تو تانیہ بھی گہری سانس لے کر سر ہلانے لگی۔

"میں اپنی طرف سے پوری کوشش کروں گی کہ فائزہ کو کوئی تنگی نہ ہو مگر۔۔۔!"

تانیہ کی ادھوری بات کا پورا مطلب کاشف بہت اچھی طرح سمجھتا تھا، کیونکہ تالی ہمیشہ دونوں ہاتھوں سے بجتی ہے۔اگر تانیہ، فائزہ کا خیال رکھتی تھی تو فائزہ کو بھی چاہیے تھا کہ اپنی عزت نفس کا پرچم ہمیشہ اونچا رکھ کر، دوسروں سے ملے۔مگر تھوڑے سے لالچ کی وجہ سے فائزہ، اپنی عزت نفس کو بھول جاتی تھی۔

☆☆☆

فائزہ نے چند دن سکون سے گزارے مگر بہت جلد اپنی عادت سے مجبور ہو کر تانیہ کے معمولات پر نظر رکھنے لگی۔گھر میں کیا آرہا ہے؟ کون کس وقت پہ جاگتا ہے؟ کیا کھاتا ہے؟ غرض ہر چیز پر فائزہ کی پوری نگاہ تھی۔تانیہ کو ایسے لگتا جیسے اس کے گھر میں سی سی ٹی وی کیمرے لگ گئے ہیں۔فائزہ کے موازنہ کرنے والی عادت نے تانیہ کو زچ کر کے رکھ دیا تھا۔تانیہ جتنا فائزہ کے ساتھ اچھا رہنے کی کوشش کرتی، فائزہ کوئی بات ایسی کر دیتی ہے کہ تانیہ ضبط کے گھونٹ بھر کے رہ جاتی۔

"کاشف بھائی کب سے گندم کی بوریاں لے کر رکھنے لگے ہیں؟"

اس دن صبح سویرے ہی بڑی پک اپ پر گندم کی چار بوریاں آئیں تو فائزہ نے حیران سے سوال کیا۔تانیہ گہری سانس لے کر رہ گئی۔

"میرے بھائی نے گاؤں سے بھیجی ہیں۔وہ ہر سال ہی بھیجتے ہیں۔"

تانیہ نے سنجیدگی سے کہا تو فائزہ کا منہ بن گیا۔

شام کو کاشف گھر آیا تو فائزہ نے باتوں ہی باتوں میں اچھا آٹا نہ ملنے کا رونا شروع کر دیا۔کاشف پریشان ہوگیا۔

"آپ لوگ تو خوش نصیب ہیں جو گھر کی گندم کی روٹی کھاتے ہیں۔ہم سے پوچھیں کس طرح گزر بسر کر رہے ہیں۔ایک تو مہنگا آٹا ملتا ہے اور وہ بھی کسی نہ کام کا۔آپ کے گھر جیسی نرم روٹی تو نہیں بنتی۔ربڑ کی طرح کی روٹی ہم کھاتے ہیں اور......!"

احمر نے گردن گھما کر ماں کے چہرے کی طرف دیکھا جو فرائے سے جھوٹ بول رہی تھی۔حالانکہ عاصم کی ماں بھی گندم کی بوری گاؤں سے بھیجتی تھیں مگر فائزہ نے ان کا ذکر کرنا مناسب نہیں سمجھا۔

"تم پریشان مت ہو۔ایسا کرنا کہ ہمارے گھر سے گندم لے جایا کرو۔ہماری پاس اضافی گندم ہوتی ہے۔"

کاشف نے فراخدلی سے کہا تو فائزہ کا چہرہ کھل اٹھا مگر تانیہ کے منہ کے زاویے بگڑ گئے۔

"خیر اتنی بھی اضافی نہیں ہے۔ہمارے گھر مہمان داری بہت ہوتی ہے مگر آپ فکر مت کریں۔میں فائزہ کے حصے کی گندم نکال دوں گی۔"

"پچھلے سال کی تھوڑی گندم بچ گئی تھی جو کب سے ماسی مانگ رہی ہے مگر اب اسے نہیں دوں گی۔فائزہ کے لیے رکھ دیتی ہوں۔فائزہ جب گھر جائے گی تو ساتھ لے جائے۔"

تانیہ نے مطمئن انداز میں کہا۔فائزہ کے چہرے کا رنگ ایک لمحے کے لیے اڑا مگر پھر نارمل ہو گیا مگر احمر کو یہ سن کر بہت برا لگا۔

"جیسا مناسب سمجھو! مگر دیکھنا تمہاری ذمہ داری ہے۔" کاشف نے کندھے اچکا کر کہا تو تانیہ چالاکی سے مسکرا دی۔اس نے فائزہ کو آئینہ دکھایا تھا مگر فائزہ نے غور ہی نہیں کیا تھا۔

☆☆☆

"مما! آپ نے ماسی سے یہ پرانی گندم کیوں لی؟ انہیں ماسی کو دینے دیں۔ ہمارے گھر میں تو پہلے ہی گندم موجود ہے۔"

اگلے دن تانیہ نے بچی کھچی گندم کی بوری، ماسی کے سامنے ہی، فائزہ کو دکھاتے ہوئے لے جانے کا بتایا تو ماسی کا منہ بن گیا تھا۔ عجیب نگاہوں سے فائزہ کو دیکھنے لگی۔

"ہم اپنے گھر کب جائیں گے؟ مجھے اپنا گھر، اپنے دوست سب بہت یاد آتے ہیں۔ پلیز واپس چلیں نا!" احمر نے اکتا کر کہا۔

"بے وقوف! ماموں کے عالیشان گھر میں مزے سے رہو۔ کتنا بڑا اور پیارا گھر ہے۔ ہر کمرے میں اے سی ہے۔ تم مزے سے زوہیب کے ساتھ ویڈیو گیمز کھیلا کرو۔" فائزہ نے شاہانہ انداز میں کہا تو احمر نے نفی میں سر ہلایا۔

"مما! زوہیب کے پاس فالتو وقت نہیں ہوتا۔ مامی نے اس کے کھیلنے کا وقت مقرر کیا ہوا ہے۔ اس وقت میں اسکول سے تھکا ہارا آکر سو رہا ہوتا ہوں کیونکہ یہاں سے میرا اسکول بھی بہت دور ہے۔"

احمر نے اکتائے لہجے میں کہا۔ اس سے پہلے کہ فائزہ کچھ کہتی اس کے موبائل پر عاصم کی کال آنے لگی۔ فائزہ نے جلدی سے فون اٹھایا۔

"کاشف بھائی نے بہت اصرار کر کے ہمیں یہاں روکا ہے۔ ورنہ میں کب اپنا گھر چھوڑ کر کہیں جاتی ہوں۔ اماں بلاوجہ اعتراض کر رہی ہیں۔ میرا بھی میکا ہے۔ اب کیا یہاں رہوں بھی نہیں۔"

فائزہ نے منہ بنا کر کہا اور فون احمر کو پکڑا دیا۔ احمر خوشی سے بھرپور لہجے میں باپ سے بات کرنے لگا۔ فائزہ سر جھٹک کر بڑبڑانے لگی۔

"ہونہہ! گھر واپس چلی جاؤں۔ بھلا میں کیوں سکون چھوڑ کر پرانے محلے میں جاؤں۔" فائزہ نے ناگواری سے خود کلامی کی۔

☆☆☆

شدید گرمی میں وین میں خوار ہو کر احمر گھر واپس آیا تو پسینے میں بھیگا ہوا تھا۔ کیونکہ اسکول دور تھا وین والا سب سے آخر میں اسے گھر پہنچاتا تھا۔

"آپ کی مہربانی کی وجہ سے۔ یہاں سے اسکول بہت دور ہے۔ سب سے آخر میں میرا نمبر آتا ہے۔" احمر نے تھکے ہوئے انداز میں کہا۔

"وین والا فیس بھی مانگ رہا تھا۔ دس ہزار۔" احمر نے منہ بنا کر کہا تو فائزہ نے دل پر ہاتھ رکھ لیا۔

"دس ہزار! کیا کاشف بھائی نے فیس ادا نہیں کی؟" فائزہ نے حیرانی سے کہا تو احمر نے نفی میں سر ہلایا۔

"میرے پاس تو اتنے پیسے نہیں ہیں اور۔۔۔!"

فائزہ پریشان ہو گئی۔ وہ سمجھ رہی تھی کہ اگر وین کا بندوبست کاشف نے کیا ہے تو فیس بھی ادا کر دی ہو گی مگر ایسا نہیں ہوا تھا۔

"میرا نیا یونیفارم بھی آنا ہے۔ اس کے پیسے بھی ہفتے تک جمع کروانے ہیں۔"

احمر نے نیا خرچا بتایا اور اٹھ کر چلا گیا۔ فائزہ فکرمندی سے آگے کے بارے میں سوچنے لگی۔

شام ہوئی تو فائزہ نے چائے پیتے کاشف کے سامنے دونوں مسئلے رکھے۔ کاشف اور تانیہ نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔

"آں! عاصم کی نوکری تو اچھی ہے۔ میں سمجھا کہ اکلوتے بیٹے کے اخراجات تو آسانی سے پورے کر ہی لیتا ہو گا مگر۔۔۔!"

کاشف نے طنزیہ انداز میں کہتے ہوئے کندھے اچکائے۔ فائزہ کے چہرے کا رنگ فق ہوا۔ اس نے شرمندہ نگاہوں سے احمر کی طرف دیکھا۔

"اور یونیفارم کی فکر مت کرو۔ زوہیب کا پرانا یونیفارم رکھا ہوا ہے۔" تانیہ نے مسکرا کر کہا تو فائزہ خاموش نگاہوں سے اسے دیکھ کر رہ گئی۔ اسی وقت زوہیب وہاں چلا آیا۔

"ماما! یہ پینٹ ماسی کو دے دیجیے گا۔ میں کسی کی چیز نہیں پہنتا ہوں۔" اچانک زوہیب غصے میں بھرا

لاؤنج میں داخل ہوا۔

"یہ کس کی پینٹ ہے؟" تانیہ نے چونک کر پوچھا۔

"فائزہ پھوپھو نے دی ہے کہ ایک سائز بڑا آ گیا۔ اب وہ تبدیل نہیں کروا سکتی تھیں۔ اس لیے مجھے دے دی مگر......!"

ذوہیب نے بیزاری سے کہا۔

"جی بھابھی! یہ میں نے یہاں آنے سے کچھ دن پہلے خریدی تھی مگر احمر کو بڑی ہے۔ سوچا ذوہیب پہن لے گا۔" فائزہ نے جلدی سے کہا۔

تانیہ نے طنزیہ انداز میں پینٹ کاشف کی طرف بڑھائی جس نے بہت غور سے جینز کی کوالٹی کو چیک کیا اور پھر نفی میں سر ہلایا۔

"فائزہ برا مت ماننا! مگر میرے بچے کسی کی چیز نہیں لیتے اور ویسے بھی کاشف اور میں نے اپنے دونوں بچوں کو خودداری کا سبق پڑھایا ہے۔" تانیہ نے گردن اکڑا کر کہا۔ احمر نے نم آنکھوں کے ساتھ ماں کی طرف دیکھا اور تیزی سے اٹھ کر اندر چلا گیا۔

☆☆☆

"بابا! آپ مما سے کہیں کہ یہاں سے واپس گھر چلیں۔ مجھے اپنے گھر رہنا ہے۔"

احمر فون پر روتے ہوئے باپ سے کہہ رہا تھا۔ فائزہ شرمندہ چہرے لیے کمرے میں داخل ہوئی تو احمر نے فون ماں کو پکڑا دیا اور خود ناراض چہرے کے ساتھ کرسی پر بیٹھ گیا۔ فائزہ نے گہری سانس لے کر فون کان سے لگایا۔

"مجھے تم سے اس حماقت کی امید ہرگز نہیں تھی۔ بھلا تمہیں اپنے چھوٹے سے گھر میں کس چیز کی کمی تھی؟ جو بہانے بہانے سے اپنے بھائی سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کر رہی ہو؟" عاصم نے غصے میں کہا تو فائزہ لب کاٹ کر رہ گئی۔

"وہ میں۔۔!" فائزہ نے کچھ کہنا چاہا۔

"صبح ہوتے ہی گھر واپس جاؤ۔ کل شام تک گاؤں سے اماں بھی تمہارے پاس رہنے آ جائیں گی۔ فائزہ! اپنے گھر کی روکھی سوکھی روٹی میں خودداری بھی ہے اور عزت بھی۔"

عاصم نے سخت لہجے میں کہا اور فون بند کر دیا۔

فائزہ روتے ہوئے احمر کے پاس آئی تو اس نے سر اٹھا کر ماں کی طرف دیکھا۔

"آج آپ کی وجہ سے مجھے سب کے سامنے اپنا آپ کمتر لگا۔ آپ ہمیشہ دوسروں سے شکوے کرتی ہیں مگر کیا کبھی یہ سوچا کہ آپ سے ہمیں بھی بہت سارے شکوے ہو سکتے ہیں جن کے جواب آپ کیا دیں گی؟" احمر نے غصے سے کہا تو فائزہ پریشانی سے اسے دیکھنے لگی۔

احمر ٹھیک کہہ رہا تھا کہ آج جب اس کے شکوے کے سامنے جواب شکوہ آیا تو اس کے پاس کہنے کے لیے کچھ نہیں تھا۔ زندگی میں پانسا پلٹنا اسی کو کہتے ہیں۔ جہاں ہم اپنی سمجھ کی بساط بچھاتے ہیں مگر قسمت ہمیں ہمارے پیادے سے ہی شکست دے دیتی ہے۔ جیسے آج فائزہ کو اپنی اولاد کی آنکھوں میں آنسو دیکھ کر تکلیف ہوئی تھی۔ اگلے دن ناشتے کے بعد فائزہ نے اپنا مختصر سامان باندھا اور چوکیدار کو رکشا لانے بھیج دیا۔

"ارے اتنی جلدی واپسی؟ اچھا اپنا سامان تو لے جانا۔ تمہاری گندم کی بوری بھی رکھی ہوئی ہے۔" تانیہ نے جلدی سے کہا تو فائزہ نے نفی میں سر ہلایا۔

"آپ وہ سب ماسی کو دے دیجیے گا۔ غریب کا حق پہلا ہے۔ میرے پاس تو اللہ کا دیا بہت کچھ ہے۔ عاصم کسی چیز کی کمی نہیں آنے دیتے۔"

فائزہ نے پہلی بار خودداری کی چادر اوڑھ کر، پر وقار انداز میں کہا تو تانیہ اور کاشف حیرانی سے اسے دیکھ کر رہ گئے۔ فائزہ، احمر کا ہاتھ پکڑ کر وہاں سے باہر نکلی تو پہلے کی طرح خالی ہاتھ نہیں تھی بلکہ توکل اور خودداری کے پہلے سبق نے ہی اسے مالا مال کر دیا تھا۔

☆☆

منشا محسن علی

اگے

پچھلی قسط کا خلاصہ

فسوں

فسوں ٹوٹ جاتے ہیں۔ یوں سمجھیں تب سب کچھ سامنے آجاتا ہے۔
سکندر کی ماں کا انتقال ہو جاتا ہے۔ کنیز فاطمہ اپنے گھر جاتی ہے اور ابا کے پیر پکڑتی۔ ابا اسے معاف کر دیتا ہے۔

ناولٹ

سیرت امتیاز کا سارا سامان آیت نے باپ کی جھولی میں ڈال دیا تھا۔ امتیاز کو لگا جیسے وہ روز قیامت ان کا گریبان پکڑے گی۔ جوان بیٹی کی موت نے انہیں توڑ کر رکھ دیا تھا۔

سکندر بختاور سے کہتا ہے کہ اسے اس جیسی ایک اچھی بیوی کے ہوتے ہوئے کسی اور کو سوچنے کی ضرورت نہیں۔ اس نے نصیب کے فیصلے کو قبول کر لیا ہے۔

یاہی باجی کی شادی طے ہو جاتی ہے اور وہ بہت خوش ہیں۔

تمکین کی شادی ارسلان سے ہو جاتی ہے۔ تمکین یہ سن کر صدمے کا شکار ہو جاتی ہے کہ ارسلان بھی مسالوں کا کاروبار کرتا ہے۔ وہ کنیز فاطمہ کو فون کرتی ہے اور کہتی ہے کہ جو خواب ہم نے بنے تھے وہ دھاگے کچے تھے۔ سب ادھڑ گیا ہے۔

خلیل نے فردوس گوہر کو امل جی سے ملوا دیا ہے اور فردوس گوہر نے ماڈلنگ کیریر کا آغاز امل جی کے ساتھ ہی کرنا ہے۔

عدن جبار فردوس گوہر سے کہتی ہے کہ تم خائن ہو تم نے مجھ سے خلیل کو چھینا ہے۔ فردوس گوہر لاکھ صفائیاں دیتی ہے مگر عدن جبار یقین نہیں کرتی۔ اس کا یقین کنیز فاطمہ اور تمکین جمال بھی نہیں کرتیں۔
عدن جبار، فردوس گوہر سے کہتی ہے کہ وہ پیراسائٹ ہے وہ کیڑا جو دوسروں کی محبت پر زندہ رہتا ہے۔

آخری باب!

اک گھات میں بیٹھی ہوئی شام اجل
اور ازل کی چھاپ سے ہر فرد ہوا لا
کیا نام تیرا نقش تھا سر روح اور
پھر روح کا میں صاحب فرد ہوا لا
خود گم مدار عشق میں ہم ہوگئے
ایسے فنا کہ ہر بقا کا درد ہوا لا

یہ زندگی کی کہانی تھی۔ زندگی جس کے جانے کتنے ہی پس پردہ چہرے ہوتے ہیں۔ کامیابیاں ہوتی ہیں۔ کچھ پوری اور کچھ ادھوری۔ خواب ہوتے ہیں جو تعبیر پا بھی لیں تو کہیں کسی خانے سے کسک کا دھواں اٹھتا ہی رہتا ہے۔ یہ کہانی بھی انہی خوابوں کی تھی جو پورے رہ کر بھی کہیں ادھورے ہی رہے۔ وہی ازل کا قصہ ہے۔ حاصل اور لاحاصل۔ دور سے دیکھیں تو آنکھیں چندھیا جائیں اور جب پاس ہوں تو آنکھیں ہی رہ جاتی ہیں۔ سب فنا ہے۔ فنا کہوں تو لا۔ اور لا کہوں تو ہم۔ یعنی
کہ میں۔ یعنی کہ تم .... اور بس ......!

☆☆☆

پروفیسر کنیز فاطمہ نے اپنے کیمسٹری ڈیپارٹمنٹ کی کھڑکیوں کے پار کھڑے درختوں کے جھنڈ پر کچھ سر سبز کونپلوں کو نمودار ہوتا دیکھ لیا تھا۔
"تو پھر زندگی کی ایک اور بہار آنے کو ہے جو شاید اس برس بھی پچھلی کئی بہاروں کی طرح چپ چاپ گزر جائے گی چند بہار کے تہواروں کے بیچ۔"
وہ اب اپنی کرسی سے اٹھ کر کھڑی ہوگئی تھی۔ جہاں اس کا کمرا تھا وہ ڈیپارٹمنٹ کی پشت کی طرف تھا اور اس کمرے کی دونوں کھڑکیاں پچھلی طرف درختوں کے جھنڈ کی طرف ہی کھلتی تھیں اور وہ اکثر گلہریوں کو ٹونگتے، کودتے پھاندتے دیکھتی رہتی تھی۔ کبھی کبھی ایک ٹھنڈی طویل سی آہ نکل جاتی تھی۔
اس کمرے کا ماحول کئی سالوں سے ایسے ہی تھا بس کبھی کبھار کمرے کے دروازے سے اس کے فیورٹ اسٹوڈنٹس کے چہرے نظر آتے تھے جو اس کے شیدائی تھے وہ کیمسٹری ڈیپارٹمنٹ کی اب تک کی سب سے کم عمر پروفیسر تھی۔ سنجیدگی اور متانت کے ساتھ چہرے پر ایک نرم مسکراہٹ کا بھرم رکھے ہوئے وہ کامیاب تصور کی جاتی تھی۔
"مس کنیز! آپ ہمیشہ مسکراتی رہتی ہیں۔"
وہ بورڈ مار کر روک کر کچھ پل کو ٹھٹک سی جاتی تھی۔
"شاید کہ کسی روز کوئی یہ نقاب چاک کرے اور پھر دیکھے کہ یہ زخم تو رفو ہونے کے بھی نہیں ہیں"۔
وہ سب اس کے پرستار تھے۔ وہ بولتی تھی تو ان کو ہمہ تن گوش پاتی تھی۔ لڑکیاں بہت بولڈ اور بلنٹ تھیں ایسے موضوعات پر بھی بحث چھیڑ لیتی تھیں جس کا تعلق تعلیم سے تو قطعاً کبھی نہیں ہوتا تھا۔
مس ڈیزی نے ریٹائرمنٹ لے لی تھی آخری دنوں میں ان کے تقریباً سارے تجربات کامیاب رہے تھے۔ اپنی ریٹائرمنٹ والے دن روسٹرم پر کھڑے ہو کر انہوں نے سامنے بیٹھے حاظرین کو دیکھ کر کیا خوب صورت بات کی تھی۔
"اب جب زندگی میں کسی کامیابی، میڈل کی چنداں ضرورت نہیں رہی ہے تو زندگی سب کچھ لے کر منتظر کھڑی ہے مگر اب تو آتش بجھ چکا۔ اب تو ضرورت نہیں رہی۔"
ہجوم سے کسی شرارتی اسٹوڈنٹ نے آواز لگائی

تھی۔

"میم ڈیزی! تو کیا آپ اب میڈل لینے سے انکار کردیں گی؟"

تب وہ اپنی سلک کی ساڑھی کے پلو سے آنسو پونچھتے ہوئے ہنس دی تھیں۔

"میڈل کیسے برے لگتے ہیں۔کارنس پر سجا کر رکھوں گی کہ کم از کم میرے نواسے اپنی نانی سے کامیابی کی کچھ سچی کہانیاں تو سن لیں گے"۔

بس یہی کہہ کر وہ اتنے برس کی اپنی شخصیت کی جھلک چھوڑ گئی تھیں۔ایسے ہی تو ہوتا ہے۔سب کہتے ہیں وقت گزر جاتا ہے۔مگر سچ یہی ہے کہ انسان گزر جاتے ہیں۔

پروفیسر کنیز فاطمہ بھی گھنٹوں محلول کی بو میں بسی ہوئی لیب میں گھسی رہتی تھی۔کبھی کبھار موبائل بیپ بیپ کرتا تو سامنے بختاور کے بیٹے ہادی کی وڈیو موجود ہوتی تھی۔

جو پاؤں پاؤں چلنا شروع کر چکا تھا۔وہ لگاتار کئی گھنٹوں تک وہ ویڈیوز دیکھتی رہتی تھی۔

"ہادی تو اب بہت بڑا ہوگیا ہے۔اس بار آؤں گی تو اس کے لیے الیکٹرونک کار لے کر آؤں گی"۔

بختاور نے اس کی بات کے جواب میں جیسے ہنستے ہوئے کہا تھا۔

"رہنے دو کنیزاں۔پہلے بھی تم نے گھر بھر دیا ہے"۔

"خالہ ہوں میں اور میرا فرض بنتا ہے"۔

اکثر وہ اور بختاور باتیں کرتی رہتی تھیں۔ بختاور کی بھی اپنی مصروفیات تھیں۔اماں ابا اب بھی زمانے کی باتوں میں تھے۔وہ بھی کیا کہتے کہ بیٹیوں کی چنریوں کے پیوند زمانہ بھی رفو ہی نہیں ہونے دیتا تھا۔

صرف رشتہ ہونا یا نہ ہونا بھی انسان کی ذات کو سوالیہ نشان بنا دیتا ہے۔وہ بھی سوال کی صورت مس ڈیزی کی طرف آجاتی تھی۔

"میم! دیکھیں تو میرا ایک انکار مجھے کہاں لے آیا ہے اتنی دور کہ واپسی کے رستے بھی دھندلے ہیں"۔

"کنیز! یہ تمہارا اپنایا ہوا پل ہے،اس پر صرف تم ہی قدم رکھ سکتی ہو۔باقی سب کے لیے اس پر چلنے میں جھول ہے۔خوف ہے کہ چل پڑے تو گر پڑیں گے۔"

سیاہ لمبے بالوں کی چوٹی کمر سے ڈھلک گئی تھی۔

"اماں ابا اب بھی جیسے اس لمحے کی تلاش میں ہیں کہ کب میں گر پڑوں تو اٹھانے کو کوئی آس پاس نہ ہو اور تب وہ یہ کہہ سکیں کہ دیکھا نافرمانی کی کیا سزا ملی۔کیا کسی انسان کے رشتے کو ہاں یا ناں کہنا ہی مجھے مکمل یا نامکمل کر سکتا ہے۔وہ خود شخص اپنی زندگی میں کتنا آگے بڑھ گیا ہے یہ کوئی نہیں دیکھے گا۔مگر میرے لیے سب وہی پرانا قصہ تازہ ہوتا رہے گا"۔

وہ آہستہ آہستہ جیسے غائب دماغ ہوتی جا رہی تھی۔یونہی بیٹھے بیٹھے کھڑکیوں کے پار دیکھتی رہتی تھی۔کئی چنچل لڑکیاں سوال لے کر آجاتی تھیں۔

"آپ ہماری جگہ ہوتیں تو کیا کرتیں؟"

تب وہ جیسے کورے کاغذ پر نب چبھو دیتی تھی۔سیاہی پھیل جاتی تھی۔

"تمہارا رستہ ہوگا تو تمہاری ہی منزل ہوگی مگر اس سفر میں کوئی ساتھ نہیں دے گا۔سب تمہیں گلٹ کی موت ماریں گے۔گلٹ کے کوڑے کی سنسناہٹ بہت تکلیف دہ ہوتی ہے"۔

وہ اپنا لیدر بیگ شانوں پر ڈالے جب ٹھنڈی گیلری میں گھوم رہی ہوتی تھی تو بہت سی نظریں اس کی طرف اٹھتی تھیں۔سپید پاؤں جو دو پٹی والی چپل میں مقید ہوتے تھے۔کالے بالوں کی لمبی چوٹی کمر پر جھول رہی ہوتی تھی۔وہ سیدھ میں چلتی تھی۔

عدن بھی کبھار آجاتی تھی تو وہ دونوں سیرت کو یاد کرتی تھیں۔

"وقت نے ہم سے ہمارا ایک قیمتی دوست

ٹھگ لیا"۔

"وقت کسی کا وفادار نہیں ہوتا۔ اسے سب چھیننا آتا ہے۔ دوست، رشتے اور غرور"۔

عدن نے اس کے ہاتھ سے چائے کا کپ تھامتے ہوئے پوچھا تھا۔ "غرور بھی؟"۔

"ہاں تمہارے سامنے ہوں میں۔ جو اپنی ذات کا غرور لیے پھرا کرتی تھی کسی پرانے وقت میں اور آج دیکھو تہی دست ہوں ہاتھ خالی ہیں"۔

"پچھتا رہی ہو کیا؟"۔

"بس اماں کی یاد آتی رہتی ہے"۔

چائے میں آنسو گھل جاتے تھے۔ دروازے سے پریکٹیکل کے طلبا جھانک کر اجازت لیتے تھے۔ اور عدن اس محل وای اپسرا کو دیکھے جاتی تھی جو اپنے سامنے بیٹھے طلبا کو دھیان سے سب سمجھا رہی ہوتی تھی۔ کیا کیا فارمولے جنہیں وہ انگلیوں کی پوروں پر حل کر کے سامنے بیٹھنے والوں کو حیران کر دیا کرتی تھی۔ تو یہ تھا اس کا حاصل جو کہ لاحاصل بنا دیا گیا تھا۔

"میم! آپ کبھی بھی ہمیں چھوڑ کر مت جایئے گا"۔

"نہیں جاؤں گی۔"

عدن اسے دیکھے جاتی تھی۔ جو عدن کا لایا ہوا کیک اپنے اسٹوڈنٹس کو سرو کر رہی ہوتی تھی۔ اس کے ریسرچ آرٹیکل بہت سے مشہور جریدے چھاپ رہے تھے۔ اور بہت سے اسکالرشپ بھی آفر ہو رہے تھے۔

عدن کی طرف وہ متوجہ ہوئی تھی۔

"سوری! تمہیں اتنا انتظار کرنا پڑا۔ بس روز کی یہی روٹین ہے۔"

"کوئی بات نہیں تمہیں یوں مصروف دیکھ کر مجھے اچھا لگتا ہے کہ تم زندگی میں کچھ کر رہی ہو اور تمہارے اسٹوڈنٹس تمہیں آئیڈیل مانتے ہیں"۔

ٹشو سے کیک کا پیس منہ میں رکھتی ہوئی جیسے وہ ہنس پڑی تھی۔

"واقعی انسان بھی ضرورت کے ہر بازار میں الگ الگ بھاؤ کے عوض بکتا ہے۔ یہاں آئیڈیل ہوں اور وہاں کچھ بھی نہیں"۔

وہ دونوں پھر آفیسر کالونی کی طرف نکل آتی تھیں۔ جہاں گل مہر تھے۔ جن کے سائے تلے وہ دکھ سکھ کرتی تھیں۔

"خلیل کیسا ہے؟"

"پتا نہیں۔ میں نے رابطہ ختم کر دیا ہے" عدن نے ایک درخت کی ڈال کو توڑا تھا۔

"ہمیں لگتا ہے ہم اگلے انسان کو سزا دے رہے ہوتے ہیں۔ مگر ایسا نہیں ہوتا ہم خود جل رہے ہوتے ہیں"۔

گل مہر کے پھولوں کو ٹٹولتے پرندے اس بات پر سرگوشیوں میں گفتگو کرنے لگتے تھے۔ کیونکہ وہ جان گئے تھے۔ "اس کائنات میں انسان سے بڑھ کر کوئی تماش بین نہیں ہوتے"۔

☆☆☆

تمکین جمال جو تمام عمر بادیان کے پھول کے خوف میں جلا رہی تھی اب اسی کی باس سے ماری گئی تھی۔ وہ جیسے دل پر ہاتھ رکھے کھڑی کی کھڑی رہ گئی تھی۔ ساری زندگی مسالے پیسنے والی کے وجود میں بھی جیسے خون کی جگہ سونف، الائچی اور جائفل کی بسائند آتی تھی۔ اسے یہی کہہ کر اس رشتے میں باندھا گیا تھا کہ ارسلان مکرم کا اپنا کاروبار ہے اور وہ یہی سوچ کر ہاں کر بیٹھی تھی کہ اب زندگی میں سب ٹھیک ہو جائے گا۔ جیسے کہانیوں میں ہوتا ہے کہ سب اچھا اچھا ہونے لگتا ہے۔ وہ شادی کے پہلے دن دلہن بنی عطر کی شیشی الٹ کر آئی تھی کہ کہیں کوئی جائفل کی بو کا راز نہ پالے۔ مگر اس برآمدے میں بیٹھی بوڑھیوں نے بچوں کو لتاڑا تھا۔

"ائے ہائے، آج کل کے بیہ بچے۔ کسی نے خوشبو کی شیشی پھوڑ ڈالی ہے نتھنوں میں گھسی جاتی ہے مہک"۔

کوئی بھی اس راز کو نہ پا سکا تھا کہ عطر کا منبع

تمکین جمال تھی۔

کبھی وہ ابا سے ان کے بیوپار کی شکایت نہیں کر پائی تھی کہ ابا اب تھکن ہونے لگی ہے مسالے پیستے پیستے۔ نیند بھٹک جاتی ہے۔ مذاق اڑایا جاتا ہے۔

"تمکین گرم مسالے والی۔"

وہ یہی سن سن کر بڑی ہوئی تھی۔ ذہن میں کہیں خوف بیٹھ گیا تھا۔

لڑکیاں بھی خوابوں کو دل پر کاڑھ لیتی ہیں کہ زندگی کے اگلے سفر میں ہمراہی کیسا ہوگا۔ کیسی آن بان کا مالک ہوگا۔ وہ بھی آنکھیں بیچ کر اک سپنا کاڑھ لیتی تھی۔

"اونچے قد کاٹھ کا ہوگا اور عود کی خوشبو سے مہکتا ہوگا۔"

اصل زندگی تو یہی جہاں حاصل بھی لاحاصل سا نظر آتا تھا۔ وہ بھی دہائی دیتے کنیزاں کی طرف لپکی تھی۔

"دیکھو کنیزاں۔ کیسا تماچا پڑا ہے منہ پر۔ زناٹے دار...... میں کیا کروں؟"

لاہور میں پروفیسر کالونی کے ایک چھوٹے سے گھر میں کھولتے پانی میں پتی گھولتی ہوئی کنیز فاطمہ نے تاسف سے سر ہلایا تھا۔

"دیکھا، میں نہ کہتی تھی کہ سوچ لینے سے کچھ ہاتھ نہیں آتا۔ تم نے سوچا تو ملا نہیں جو ملا ہے اب اس پر سوچ لو۔ راستے بندمت کرو۔ بادیان کے پھولوں کو کسی جیبی بھری دوپہر میں تکیے تلے رکھ کر سو جاؤ۔"

تمکین جمال نے اس کے دماغ چل جانے کا سوچ کر کھٹاک سے فون بند کر دیا تھا۔

"جب سے پڑھانے لگی ہے اس کا تو دماغ چل ول گیا ہے۔"

جلے پیر کی بلی کی طرح کئی چکر کاٹنے کے بعد عدن کی باری آئی تھی تو وہ اس کے سامنے ہچکیوں سمیت روئی تھی۔ عدن نے پیانو روک کر اس کی سسکیاں سنیں اور مطلع صاف ہونے کے بعد فرمایا تھا۔

"تمہیں ارسلان سے محبت ہے؟" عدن کا سوال جیسے ایک الارم تھا۔ ایسا بجا کہ وہ کچھ کہہ ہی نہ پائی تھی کہ وہ شخص آہستہ آہستہ حواس قابو میں کرنے لگا تھا جادوگر کہیں کا۔

"ہاں لگتا تو کچھ ایسا ہی ہے۔"

"تمہیں اس بات کا یقین نہیں ہے کیا؟"

"یقین ہے۔"

"تو اس کا مطلب ارینج میرج اب ارینج نہیں رہی ہے۔"

عدن اس کے گرد سوچ کی دیوار کھڑی کر گئی تھی۔ وہ کھڑکی میں پھر سے جا کر کھڑی ہوگئی تھی۔ جہاں سے ارسلان ملازموں کے ساتھ مسالوں کی بوریاں اترواتا ہوا نظر آ رہا تھا۔ سفید کڑ کڑاتے ہوئے لباس میں ملبوس وہ شخص جیسے بہت جلد دل میں گھر کر گیا تھا۔

وہ اس لمبے برآمدے والے گھر میں پلروں کے ساتھ گھومتی رہی تھی۔ نند نگہت کو بات سے بات نکالنے کی عادت تھی۔

"ابا کے جانے کے بعد بھیا کو کاروبار سنبھالنا پڑ گیا تھا۔ ورنہ بھیا کو تو بالکل بھی پسند نہیں تھا کہ مسالوں کا کاروبار کرتے۔ بہت ناک بھوں چڑھایا کرتے تھے۔ پھر جب کوئی چارہ نہ رہا تو دکان پر بیٹھ گئے اور پھر ایسی برکت ہوئی کاروبار میں کہ اب کاروبار ہی بڑھا لیا ہے۔ جدید مسالے پیسنے والی مشینیں لگائی ہوئی ہیں۔ سارے پاکستان کے علاوہ باقی ملکوں میں بھی بھیجتے ہیں۔"

تمکین وہیں سیڑھیوں پر بیٹھی رہ گئی تھی۔ جب رات ہوگئی تو دودھ کا گلاس اسے تھمانے کے بعد سامنے بیٹھ گئی تھی۔

"آپ کو یہ کام اچھا لگتا ہے؟"

"مجھے حلال رزق کمانا اچھا لگتا ہے" وہ دودھ گھونٹ گھونٹ پی رہا تھا۔

وہ جیسے کسی سناٹے میں آگئی تھی۔ اتنے سالوں

میں یہ تو سوچا ہی نہیں تھا کہ اصل کیا ہوتا ہے۔۔ نقل کسے کہتے ہیں۔ اہم کسے کہتے ہیں اور غیر اہم کیا ہوتا ہے۔!

رات کو کمرے کی ساری کھڑکیاں کھول کر وہ تکیے تلے تین بادیان کے پھول رکھ کر لیٹ گئی تھی۔ چاند بادیان کے پھولوں سے مہکتے ہوئے اس کمرے کو دیکھنے ذرا کھڑکی میں جھانکنے لگا تھا۔۔۔

☆☆☆

سیکھا ہے جینا زندگی نے ہجر سے
پھر جیا ایسے کہ ہر ضبط ہوا لا
راہ فرار نہیں ہے تیرے عشق سے
جلا ہوں پیار میں کہ نفس ہوا لا
ہے جنوں افلاک میں تیرے حسن سے
اس جنوں کے دم سے لحہ ابد ہوا لا

فردوس گوہر کو جب لگا تھا کہ اب سب کچھ فنا ہو جائے گا کہ وہ جو ذات کا نقاب ہوتا ہے وہ اتر چکا ہے تو وہیں جیسے اماوس میں کوئی چاند ابھر آیا تھا۔ وہ جیسے وہاں سے جانے لگی تھی۔ سب ٹوٹ گیا تھا بھی نہ جڑنے کے لیے۔

امل نے سر اٹھا کر آسمان کو دیکھا تھا اور بجی سنوری فردوس گوہر کو جس کی آنکھوں کا آئی شیڈ دور سے چمکتا تھا۔ ان آنکھوں کے جھالر پانی پانی تھے۔

"رکو گوہر۔"

وہ کسی اسٹیچو کی طرح فریز ہوئی تھی مگر اب کی بار وہ مڑی نہیں تھی۔

نتاشا نے خود کو زمین میں زندہ دفن ہوتا ہوا محسوس کیا تھا۔ موئی نے اپنی اوقات دکھائی تھی۔ وہ جو قطب نما تھی جس کا کام رستہ دکھانا تھا وہ خود راہ سے بھٹک گئی تھی۔ موئی کے وائس میسج نے اسے زندہ در گور کر دیا تھا۔

"تمہیں کیا لگتا ہے کہ تم جیسی لڑکی میری چوائس ہوگی؟ بھول ہے تمہاری۔ جتنا تمہیں وقت دے چکا ہوں اسے میری طرف سے خیرات سمجھنا آخر تم ہو ہی کیا لاہور کے ایک تنگ و تاریک محلے کی عام سی لڑکی جو کوئی امیر شکار پھانسنے کو تیار رہتی ہے۔ میں تم جیسیوں کو اچھی طرح جانتا ہوں۔ تمہارے نزدیک آنے کی وجہ صرف فردوس گوہر تھی۔ افسوس کہ سمجھ نہیں آ رہا اسے کس نام سے بلاؤں ویسے تو کئی نام ہوتے ہیں ایسے لوگوں کے۔۔ پوری ڈکشنری ہے۔" آخر میں آگ لگاتا ہوا قہقہہ تھا۔

نتاشا ابراہیم کو لگا تھا جیسے وہ شخص اس کے اپنے کردار کو چوراہے پر بدنام کر گیا ہو۔ تکلیف نے اسے ادھ موا کر دیا تھا۔ چند سال پہلے کا لکڑی اور شیشے کے اس گھر میں ہونے والا عہد آج ٹوٹ گیا تھا۔

"وہ ایک مکمل انسان نہیں ہے۔ وہ ایک ایسی شخصیت کی مالک ہے جسے دنیا تیسری جنس کے نام سے جانتی ہے مگر وہ ہمارا خون ہے۔ اولاد ہے۔ اور خون کو تو اپنایا جاتا ہے کوڑے کے حوالے نہیں کیا جاتا۔ بس ہم چاہتے ہیں کہ وہ دنیا میں اپنی ایک پہچان بنا کر سکون سے جی سکے۔ تم اسے دنیا کا سامنا کرنا سکھا دو بس۔"

پہلی ملاقات میں ہی فردوس گوہر کے بے پناہ حسن اور آنکھوں میں ہلکورے لیتے خوف نے اسے متاثر کیا تھا۔ وہ نتاشا ابراہیم کو دیکھ کر جی تھی۔ نتاشا ابراہیم اس کی کھڑکی تھی جو دنیا کی طرف، انسانوں کی طرف کھلتی تھی۔

مگر آج وہ کھڑکی جہنم کی طرف کھل گئی تھی۔ جس نے فردوس گوہر کو برباد کر دیا تھا۔

وہ امل کی پکار پر رک گئی تھی۔ آنسو پلکوں سے ٹوٹ کر پیر کے انگوٹھے پر گر رہے تھے۔ اتنے سالوں سے سب کچھ سلیٹ کی مانند صاف ہو گیا تھا۔ سامنے بس ایک ہی ننگی اور عریاں حقیقت منہ چڑا رہی تھی۔۔

تیسری جنس۔ تیسری جنس۔۔ تالی۔۔ اشارے...... قہقہے...... زنخا...... مخنث۔

بہت سے نام تھے۔ بہت سے چہرے تھے۔۔ رپورٹرز دوڑ کر وہیں آ گئے تھے۔ کیمرا مین بھاگ رہے تھے۔ آڈیو والے آڈیو ٹیسٹ کر رہے

تھے۔روشنیوں میں وہ نہا گئی تھی۔!

ورجینیا وولف کی کتاب کی ورق گردانی کرتی پروفیسر کنیز فاطمہ کے ہاتھوں سے کتاب چھوٹ گئی تھی۔سامنے ٹی وی اسکرین پر وہ فردوس گوہر ہی تھی۔چہرے پر موت تھی۔آنکھوں میں خوف تھا۔رپورٹرز سوالوں پر سوال کر رہے تھے۔

"فردوس گوہر! آپ کی حقیقت دنیا جاننا چاہتی ہے۔کون ہیں آپ؟۔آپ کو کب پتا چلا کہ آپ ایک لڑکی نہیں ہیں؟"۔

وہ چہرے پر ہاتھ رکھ کر خود کو بچا رہی تھی۔اس کے صرف دو ہاتھ تھے۔دنیا کے سو ہاتھ تھے۔وہ تنہا کھڑی تھی۔

عدن جبار ٹریفک کے رش میں پھنسی ہوئی تھی جب اس کے فون پر کنیز کا ٹیکسٹ آیا تھا۔

"عدن! اللہ ہمیں کبھی معاف نہیں کرے گا"۔

سڑک پر گاڑیوں کے ٹائر چرچرائے۔

تمکین جمال گلدان کے سیاہ پھولوں کو بدل رہی تھی۔جب اس کی توجہ ایک چینل کی بریکنگ نیوز کی طرف مبذول ہوئی تھی۔

"پاکستان کے سب سے بڑے فیشن شو میں ایل جی برانڈ کی ماڈل ایک ٹرانس جینڈر نکلی۔ذرائع کے مطابق ایل جی کو خود بھی اس سچ کا علم نہیں تھا۔تفصیلات کے مطابق ایل جی کی کولیکشن کافی عرصے سے زیر بحث تھی اور فیشن لوور اس کلیکشن کے منتظر تھے مگر اب لگتا ہے کہ ایل جی برانڈ اب دوبارہ اپنے پیروں پر کھڑا نہیں ہو پائے گا"۔

مردہ سیاہ پھول تمکین کے پیروں میں جا پڑے۔زندگی میں آج پہلی بار تمکین جمال کو علم ہوا تھا کہ جاہلی جاو تری سے کہیں زیادہ اپنی بونا قابل برداشت ہوتی ہے۔آج وہ خود جیسے کسی غلیظ پھوڑے کی مانند بہہ نکلی تھی۔وہ زمین پر بیٹھتی گئی تھی۔

ان تینوں کے ذہن کی سلیٹ پر وہ منظر آج بھی تازہ تھا۔

برستا ہوا آسمان۔ہاتھ جوڑے سچ کی دہائی طلب کرتی ہوئی فردوس۔اور اسے جھٹکتے ہوئے وہ تینوں! کتنے نیلے لفظ تھے جنھوں نے گوہر کی روح کو ڈسا ہوگا۔

"تم دوست نہیں خائن ہو۔محبتیں چوری کرنے والی۔"

انسان ہمیشہ کسی نہ کسی سچ کے آگے ہمیشہ اندھا ہی رہتا ہے۔اپنے آپ کو عقل کل سمجھتے ہوئے۔مگر یہ سچ کا ترازو جب کام کرتا ہے تو انسان کے حصے میں کچھ بھی نہیں آتا!

☆☆☆

روشنی کے دائروں کو چیرتی ہوئی وہ آگے بڑھ رہی تھی۔کیمرا مین رپورٹرز سب اس طرف متوجہ ہوگئے تھے۔ڈری سہمی فردوس گوہر کے گرد جیسے ساون کی برکھا میں کوئی چھاتا لیے آ گیا تھا۔

وہ ریشمی تھی جو بالڑیوں کے ساتھ وہاں آئی تھی۔وہ جھرمٹ ڈالے فردوس کے گرد اکٹھی ہوگئی تھیں۔فردوس نے ان کو اپنے ہاتھ پکڑتے دیکھا تھا۔وہ اس کے کپڑوں کی شکنیں دور کر رہی تھیں۔وہ جوان سب میں سب سے بڑی تھی اس نے اپنے پیر ننگے کر کے اپنے جوتے فردوس کے پیروں میں پہنا دیے تھے۔

ریشمی نے پیلی روشنیوں کے بیچ اسے خود سے لگا لیا تھا۔وہ سسک رہی تھی۔

"ریشمی! مجھے ڈر لگ رہا ہے"۔

"پگلی۔ڈرتی کاہے کو ہے۔آنکھ اٹھا کر دیکھ۔تم نے کون سی چوری کی ہے۔"

"یہ مجھے دھکے دیں گے۔مجھے ماریں گے۔"

"کوئی کچھ نہیں کرے گا جب تک تم خود ان کو اجازت نہیں دو گی۔چل سر اٹھا کر دیکھ۔فوٹو بنوا اچھی سی۔۔ہنستی مسکراتی ہوئی اخباروں میں آئے گی ناں فوٹو"۔

فردوس گوہر نے ریشمی کو اس کا دوپٹا ٹھیک کرتے دیکھا تھا۔زندگی میں کتنے اپنے اکٹھے کیے تھے۔اور زندگی سارے اپنوں کا ننگ دھڑنگ

سامنے لاکر خود تماشا دیکھ رہی تھی۔

امل چلتی ہوئی اس کی طرف آئی تھی۔

"میرے ساتھ چلو اب میں بھی پیچھے نہیں ہٹوں گی۔ یہ میری شناخت نہیں ہے گوہر، یہ شاید تمہاری ہے کہ تم اس سے پہچانی جاؤ"۔

ریشمی نے اس کے اب دونوں ہاتھ تھام لیے تھے۔

"یاد رکھنا گوہر۔ ہمارا سچ ہمیں کبھی نہیں گراتا۔ اپنے سچ کے ساتھ چلوگی تو منہ کے بل نہیں گروگی"۔

وہ امل کے ساتھ کھنچتی چلی گئی تھی۔ سیڑھیوں کے اسٹیپس پر ریشمی بالڑیوں کے ساتھ اب بھی کھڑی تھی۔

میک اپ روم میں آرٹسٹ نے اس کے اوپر کام شروع کردیا تھا۔ وہ کسی بت کی طرح بیٹھی تھی۔ روبوٹ جیسے۔ کچھ بھی محسوس نہیں ہورہا تھا۔

جب ساری دنیا جان گئی ہے تو اور کس کا سامنا رہ جاتا ہے کہ جس سے خوف کھایا جائے۔ شیشے میں اپنا عکس نظر آرہا تھا۔ اناؤنسمنٹ ہورہی تھی۔

ہر نقش تراشا ہوا تھا۔ اناؤنسمنٹ ہورہی تھی۔

وہ امل کا ہاتھ پکڑے ریمپ پر نمودار ہوئی تھی۔ روشنیوں کے دائروں میں راج ہنس جیسی گردن تانے۔ سپاٹ تاثرات اور آنکھوں میں حزن کا سمندر چھپائے دنیا نے فردوس گوہر کی موجودگی کو شدت سے محسوس کیا تھا۔

بیک گراؤنڈ میوزک کی بیٹ پر وہ امل جی کی شو تار تھی۔ کیمرے کا ہر کلک اس کے فوٹو جینک چہرے کا کلوز اپ لے رہا تھا۔ سامنے کرسیوں پر ریشمی بالڑیوں سمیت تالیاں بجائے جاتی تھی۔

فردوس گوہر نے سلور ہیل کی نوک پر خود کو بہت اونچا پایا تھا۔ وہ اپنے سچ سمیت اکیلی کھڑی تھی۔ پورے اعتماد اور غرور کے ساتھ!

ہال میں سب کی آنکھیں چندھیا گئی تھیں۔ سیڑھیوں کی آخری قطار میں دیوار سے ٹیک لگائے ثنا ابراہیم بھرے پرے ہجوم میں تنہا کھڑی کی کھڑی رہ گئی تھی!

وہ شو تاریخ کا سب سے زیادہ ٹوئسٹ والا اور کامیاب شو تھا۔۔۔ بہت سے ادارے ہیومن رائٹس پہ جو کام کررہے تھے وہ امل اور فردوس کی مدد کو آگئے تھے۔

وہ روسٹرم پر کھڑی تھی۔ مائیک کو درست کرتی ہوئی۔ کچھ دیر بعد وہ ہال اس کی آواز سے گونج اٹھا تھا

"میں جانتی ہوں کہ آج میرا دن ہے۔ چاہے ذلت ہو یا شہرت ہو۔ ایک وقت پر ایک ہی چیز سے واسطہ پڑے تو ٹھیک رہتا ہے انسان اس فیز سے نکل آتا ہے مگر میری بدقسمتی کہ میرا واسطہ ایک ہی وقت میں دونوں سے پڑا ہے۔ اور مجھے یہ دونوں راس نہیں ہیں۔ اس وقت مجھے اس اربوں کی آبادی رکھنے والی دنیا میں کسی کی پروا نہیں ہے۔ میں سچ کہتی ہوں کسی کی بھی نہیں۔۔۔ میں صرف اپنی ماں سے ملنے کو بے تاب ہوں کہ وہ کیا سوچتی ہوگی کہیں اس کا دل تکلیف میں نہ ہو۔ یہ ریمپ، یہ روشنیاں، یہ چکاچوند ایسے ہی نہیں مل جاتی۔ یہ سب سے پہلے آپ سے آپ کا سچ اگلواتی ہے۔ اس پر تماشا لگتا ہے۔ کبھی ہوتا آیا ہے آج میرا لگا ہے کل کسی اور کا لگے گا۔ لگتا رہے گا۔ مگر مجھے معلوم ہے کہ اب مجھے کیا کرنا ہے یہ دنیا بہت بڑی ہے اتنی بڑی کہ انسان گم ہوجائے۔ کبھی نہ ملنے کے لیے۔ ہمیشہ کے لیے۔ مگر مجھے یہ سارے چہرے یاد رہیں گے۔۔۔ جن سے میں نے محبت کی۔۔۔ اور وہ جن سے میں چاہ کر نفرت بھی نہیں کرسکی۔۔۔ کیونکہ نفرت میرا سچ نہیں ہے۔۔۔ آپ سب اپنے سچ سمیت سلامت رہیں۔۔۔"

اور پھر سب نے اسے وہاں سے الٹے پاؤں گم ہوتا ہوا پایا۔ بھیڑ میں۔۔۔ روشنیوں کے بیچ سے۔ جیسے وہ کہیں نہیں تھی۔۔۔۔ جیسے وہ ہر جگہ تھی۔۔۔۔!

☆☆☆

جب پری چہروں پہ چھائی ہو فنا
تب فریب زندگی کا حسن ہوا لا

ہر شے جہاں رنگ و گل کی خاص کر
کن کی مستی گونج میں ہر سمت ہوا لا

چیت کا موسم تھا اور دور تک ریت کے ٹیلوں پر چنے کے سرسبز کھیت دور دور تک دکھائی دیتے تھے۔ ہوائیں مشکبار تھیں اور موسم گرما کی بھی آمد آمد ہی تھی۔ اماں یونہی بے خیالی میں پھسکڑے مار کر بیٹھے ہوئے ہوئی گاؤں کی عورتوں کو کوسے جاتی تھیں۔

"سنا ہے، کنیزاں شہر میں وڈی استانی بن گئی ہے"

وہ تب بھی چپ ہی رہی تھیں کہ کب سے بس وہ سنے ہی جاتی تھیں۔

"ارے بھئی، ایسی تعلیم کس کام جو ماں باپ کے فیصلوں سے ہی نافرمان کردے۔"

ابا چوپال میں بیٹھے ہوتے تھے تو کہیں سے ذکر نکل ہی آتا تھا اور وہ جانتے تھے کہ باتوں باتوں میں انہی کو ہی سنایا جارہا ہوگا۔

دنیا ایک جیسی ہے۔ لوگ بھی۔ باتیں بھی۔ باتوں کے نشتر بھالے بھی۔ درد بھی۔

بختاور سکندر کے ساتھ اکثر آجاتی تھی اور ہادی کو دیکھ کر جیسے اماں ابا جی اٹھتے تھے۔ بختاور سارے صحن کو جھاڑو لگا کر چمکا دیتی تھی۔ کھنگل اور ٹاہلی کے پتروں کو سمیٹ کر رکھتی۔ گھڑونچی پر برتن ٹانگتی۔ چولہے کی لپائی بھی کر جاتی تھی۔

"بس کردے بختاور۔ کن کاموں میں لگی رہتی ہے؟" سکندر جیسے اسے چھیڑنے کی غرض سے کہتا۔

"گھر میں بھی ہم باپ بیٹا کاموں کی نذر ہوجاتے ہیں"۔

"بس اماں! ان کی تو کبھی مجھ سے شکایتیں ہی ختم نہیں ہوں گی"۔

ابا مسکراتے ہوئے ہادی کو آسمان کی طرف اچھالتے اور ان تینوں کو بحث میں الجھا ہوا دیکھتے۔

"بس شروع ہوگئے یہ لوگ پھر سے"۔

چیت کی ہوا چلی تھی تو دھریک سے کئی جامنی پھول نیچے آگرے تھے۔ اماں نے پھولوں کا گچھا اٹھالیا تھا۔ یہی چیت کا موسم تو ہوتا تھا جب دھریک پھول دیتی تھی تو کنیزاں اس کے نیچے کھڑے ہوکر گہری سانسیں لیا کرتی تھی۔ کئی پھول بختاور اور اماں کے بالوں میں بھی ٹانک دیتی تھی۔

"میرا دل کرتا ہے دھریک کے پھولوں کی خوشبو کو کسی شیشے کی بوتل میں بند کرلو۔"

"تمہارے سارے شوق ہی نرالے ہوتے ہیں"

"بھلا پھول بھی کسی کو برے لگ سکتے ہیں"۔

"خوشبو کو قید کرنے کی بات کرتی ہو تم"۔

"محسوس کرنے اور قید کرنے میں بہت فرق ہوتا ہے۔ میں قید خود بھی پسند نہیں کرتی اور کسی کو قید میں رکھنا بھی نہیں چاہتی"۔

بختاور کو اس بار کے موسم بہار میں وہ کھٹ سے یاد آئی تھی۔ وہ جانتی تھی کہ وہ قید میں رہنا پسند نہیں کرتی تھی۔ تب ہی وہ اپنی شیشے کی بوتل توڑ کر نکل بھاگی تھی اور اپنے پیچھے خلا چھوڑ گئی تھی جو کہ بھرتا ہی نہیں تھا۔

"اماں کنیزاں کو واپس بلالیں!" بختاور نے جیسے منت کرتے ہوئے ماں کے گھٹنے پکڑے تھے۔

"کس منہ سے واپس آئے گی؟ تو اپنی چار دیواری میں رہتی ہے بختاورے۔ ہم دونوں سے پوچھ جو چاروں پاسے سے ننگے ہوکے بیٹھے ہیں۔ کوئی بھی بات کرکے چلا جاتا ہے۔ کلیجہ منہ کو آتا ہے، سانس رندھ جاتی ہے"۔

اماں منہ پر دوپٹا لے کر رونے لگی تھیں۔ ابا ہادی کو گود میں لیے بیٹھے کبھی کبھار ان دونوں کی طرف بھی دیکھ لیتے تھے۔ سکندر چارپائیوں کی ادوائن کس رہا تھا۔

یونہی ابا کی نظر بختاور کے چہرے سے ہوتی ہوئی سکندر پر رکی اور پھر گود میں بیٹھے ہادی پر۔ جو بھی تھا ہر کوئی اپنی جگہ پر درست ہوگیا تھا۔ اگر کہیں کوئی کمی رہ گئی تھی تو وہ ایک ہی مثلث میں تھی۔ ابا، اماں اور کنیزاں۔۔۔!

ایک ہوک اٹھی تھی جس نے انھیں پچھاڑ کر رکھ دیا تھا۔ آنکھیں جھرنا تھیں، بہے جاتی تھیں۔

دور جامعہ پنجاب کے کیمیا کے ڈپارٹمنٹ میں ری ایکشن کے فارمولوں پر بات کرتی ہوئی کنیزاں کو ایک دم چپ لگ گئی تھی۔ حلق خشک ہو گیا تھا۔

"ایکسکیوزمی۔ آئی ہیو ٹو گو"۔

اپنا لیدر بیگ اٹھاتی وہ باہر کوریڈور کی طرف گئی تھی۔ گزرتے ہوئے اسٹوڈنٹس کے سلام کے جواب تک دینے کا بھی وقت نہیں تھا۔ بہت سارے گلٹ اندر کہیں لوٹ رہے تھے۔

"ظلم کا ساتھ دینے والا بھی تو ظالم ہوتا ہے ناں عدن۔ مجھے اب خود سے شرم آتی ہے۔ تم سے بھی۔ ہم نے کیا کیا۔ فردوس گوہر کو ہم نے تمہاری عینک سے دیکھا، تم پہ اعتبار کیا۔ اب اسے ڈھونڈ کہ اس کے پاؤں پڑ لیں"۔

مگر وہ کہیں گم ہو گئی تھی۔ وہ ڈھونڈتی رہ گئیں۔ کہیں سے کوئی سراغ ملے کوئی تو نشانی ہو کہ وہ اس اپسرا کو کھوج لیں۔ مگر سارے رستے مسدود۔

اب کی بار خوشیاں اور سکون شیشے کی بوتل میں بند ہو گئے تھے۔

☆☆☆

"تمہارا اور تمہارے باپ کا ایک ہی مسئلہ ہے کہ بہت جلد باز ہونے کے ساتھ ساتھ درست فیصلہ لینے کی اہلیت سے بھی محروم ہو"۔

مام کسی پروفیشنل شیف کی طرح کٹنگ بورڈ پر ہاتھ چلاتے ہوئے سلاد کا ڈھیر کاٹ رہی تھیں۔ سبزیوں کا ڈھیر پڑا تھا جسے وہ نفاست سے مختلف شیپس میں کاٹ رہی تھیں۔

"مجھے خلیل پر اعتبار کرنا چاہیے تھا"۔ وہ ندامت اور پچھتاوے کے احساس تلے دبی ہوئی تھی۔ مام نے حیرت سے مڑ کر اپنی اکلوتی اولاد کو دیکھا تھا۔

"عدن۔ تم ایسی کب سے ہو گئیں اتنی خود غرض"۔

ڈھیلے ڈھالے لانگ کرتے میں ملبوس وہ کچن کرسی پر جھول رہی تھی۔

"میں کچھ نہیں"۔

"تم ابھی بھی اپنا اور خلیل کا سوچ رہی ہو۔ صرف دو انسانوں کا۔ تم نے اس تیسرے انسان کی بات ہی نہیں کی جس کے دل کو تم دکھا چکی ہو۔ مجھے تم حیرت میں ڈال چکی ہو"۔ وہ اپنا ہاتھ روک چکی تھیں۔ انھوں نے اپنی بیٹی کو آئینہ دکھایا تھا۔

"فردوس گوہر جس سے مل کر مجھے ہمیشہ اچھا لگا ہے وہ ایک پوزیٹو لڑکی تھی۔ میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ کوئی اس طرح اپنی کمی کے ساتھ زندگی جی رہا ہو۔ وہ تم لوگوں کی دوستی اور ساتھ کی محتاج تھی۔ اور تم کیا کر رہی ہو کہ اسے ہی زندہ درگور کر دیا۔ دوست دوستوں کے لیے قبر نہیں کھودتے۔ اب بھی تم خلیل اور اعتبار کا رونا رو رہی ہو تو تف ہے تم پر"۔

انہوں نے ہمیشہ اپنے شوہر کے منہ پر چپ دے مارا تھا آج انہوں نے اپنی بیٹی کے ساتھ بھی یہی کیا تھا۔

عدن جبار کو کسی نے چٹکیوں سے اٹھا کر حقیقت کے گدلے دلدل میں پھینکا تھا اور اسے اب پہلی بار وہ یاد آئی تھی۔ جس کے چہرے پر اس نے پتھر مارا تھا جو بار بار ہاتھ جوڑ کر اپنا سچ سنانے کی بھیک مانگتی رہی تھی۔

انسان کو حقیقت کبھی کبھی نوچ لیتی ہے اور سارے خدوخال بگڑ جاتے ہیں۔ کو بھی پتے صاف کرتی ہوئی مام نے اسے واپس پلٹتے ہوئے دیکھا تھا۔ عدن جبار نے اپنے اندر گلٹ زندہ ہوتا ہوا پایا تھا۔

"میں خائن نہیں ہوں عدن۔ میں پیراسائیٹ نہیں ہوں۔"

فردوس گوہر نے کتنی بار کہا تھا۔ مام سچ کہتی تھیں کہ وہ لڑکی کتنی بہادر تھی جو معاشرے میں اپنی ایسی شناخت کے ساتھ زندہ تھی۔ جو مسلسل زندگی کی جنگ لڑ رہا ہو۔

تو......!

خلیل اسی شام عدن جبار کے سامنے آیا تھا تو وہ پھوٹ پھوٹ کر رو دی تھی۔ وہ کسی بت کی مانند بیٹھا رہ گیا تھا۔

"وہ ڈیڈ کی پیشنٹ تھی، ہماری جان پہچان ہو گئی تھی۔ پھر میں اسے تمہارے توسط سے ملا اور پھر مجھے معلوم ہوا کہ فردوس کا کیچ کیا تھا۔ وہ ڈپریشن کی مریضہ تھی۔

اسے دورے پڑتے تھے۔ میں نے اس کی فائل ہسٹری پڑھ لی تھی۔ پھر ہم ملنے لگے کیونکہ اسے ایک سامع کی ضرورت تھی۔ بس یہی ہمارا تعلق تھا عدن۔ اتنا سا کہ وہ سناتی تھی اور میں سن لیتا تھا۔" خلیل نے عدن کے سامنے ساری کہانی بیان کر ڈالی تھی۔

وہ آئینوں میں اپنا شکستہ عکس دیکھنے کا دن تھا۔ اور ہر شیشے میں وہ خود ٹوٹی ہوئی نظر آئی تھی۔ وہ وہاں سے اٹھ کر کنیز فاطمہ کی طرف آئی تھی۔ جہاں اس نے سرخاب خان کو موجود پایا تھا۔ وہ بھی کبھار ادھر آنکلتا تھا۔

ہر انسان کے پاس اپنے اپنے گلٹ ہوتے ہیں۔ پھر سب گلٹی اکٹھے ہو جاتے ہیں۔ سانجھے ہو جاتے ہیں۔

سرخاب خان سرخ آنکھیں لیے ہمیشہ ایک جملہ دہرایا کرتا تھا۔

"میں نے سیرت کو بہت دکھ دیا"۔

"انسان بس سبب بن جاتے ہیں۔ بہت سی چیزوں کا۔ اگر تم اس کی موت کے لیے خود کو قصوروار سمجھتے ہو تو غلط سمجھتے ہو۔ موت کا قصور صرف موت بذات خود ہوتی ہے۔"

وہ سیرت کی ڈائری سامنے رکھ دیتا تھا۔ عدن اس کی آنکھوں میں سیرت امتیاز کو زندہ ہوتے ہوئے دیکھا کرتی تھی۔

"وہ تم سے بہت متاثر تھی اسے تمہارے چہرے کے نقوش ازبر تھے۔ وہ لڑکی جب پہلی بار ملی تھی تو اس نے ہم سب کو پہلی نظر کی محبت پر ایک لطیفہ سنایا تھا اور ہم سب خوب ہنسے تھے قہقہے مار مار کر۔ بعد میں وہ اسی لطیفے کا شکار ہو گئی"۔

عدن نے آنکھوں کے پانی کو اندر دھکیلا تھا۔ سیرت کی یاد بھی پانچواں موسم تھی۔ ادھر تنگ گلیوں کے رستوں سے ہوتا ہوا سرخاب خان قبرستان جا پہنچتا تھا۔ جہاں پوپلی بوا سفید گلابوں کے ساتھ بیٹھی ہوتی تھیں۔

"اسے سفید گلاب بہت پسند تھے۔ سارے جگ سے نرالی اور وکھری"۔

امتیاز صاحب بھی دن میں کئی چکر لگا لیتے تھے۔ جانے کتنی چٹھیاں اور سندیسے ہوا برد ہو گئے تھے۔ پتا نہیں باپ بیٹی کے درمیان کیا کیا حائل رہا تھا۔ پوپلی بوا سے گھنٹوں باتیں کرتے رہتے۔

سیرت بھی کبھی قبرستان چلی آتی تو بس کھڑے کھڑے قبر کی مٹی کو دیکھے جاتی کہ اب کوئی لڑائی جھگڑے نہیں ہونے والے تھے۔ سب کچھ پیچھے رہ گیا تھا بہت کچھ سمیت......!

وہیں اس نے سرخاب خان کو پایا تھا۔

"کون ہو تم؟" وہ ٹھٹکی تھی۔ چونک گئی تھی۔ سامنے کھڑا وہ رف حلیے والا شخص کوئی خاص لگتا تھا۔

وہ سفید گلابوں کا بکے بھربھری مٹی پر رکھ کر مڑا تھا۔ جاتے جاتے پلٹا اور اداسی سے ہنس تھا۔

"ایک دوست کچا پکا سا۔ جسے سیرت امتیاز نے لمحوں کے حوالے کر دیا"۔

سارا قبرستان رابیل کے پھولوں سے مہکتا رہا۔ وہ گھر واپس پلٹتا تھا تو در نجف اس کے وجود کی تھکن بھانپ لیتی تھی۔

"کوئی بات نہیں وقت کے ساتھ ساتھ سب ٹھیک ہو جائے گا"۔

"تم کیسے اتنا مثبت سوچ لیتی ہو؟"۔

"جب سوچنا ہی ہے تو پھر اچھا سوچنے میں کوئی مضائقہ نہیں"۔

آدھی رات کو وہ بخار سے پھنک رہا ہوتا تھا۔ وہ ٹھنڈے پانی کی پٹیاں کرتے ہوئے اپنے مجازی خدا کو دیکھے جاتی تھی۔

"درنجف...... تمہارے دیار کے کتنے پیڑ باقی ہیں؟"۔

"میں نے اب گنتی کرنے چھوڑ دیے ہیں خان"۔

"آؤ دوبارہ سے شروع کرتے ہیں"۔

وہ ہولے سے مسکرا دیتی تھی۔ درنجف پہاڑوں کی سمجھدار دوشیزہ تھی۔

"خان...... میں تم سے راضی ہوں۔ مجھے خوش رکھنے کی زبردستی کوشش مت کرو۔ اپنے دل کو اس وقت اپنے ہاتھ میں رکھو۔ کسی طمع کی ضرورت نہیں۔ یہ تمہارا دکھ ہے اس کو خود پر سے گزرنے دو۔ بس اتنا کرو کہ مجھے ساتھ رکھو"۔

☆☆☆

شہر عجائبات کی ہر شے عجب
گمشدہ ہے روح اور ہر جسم ہوا لا
اختتام زندگی کی شرط تھی
تمام ہو ہر عشق اور ہر انس ہوا لا
رب شناس لوگ دیوانے نہیں
بس جمال پردہ در سے ضبط ہوا لا
شام کی لالی میں ہے ایسا فسوں
جیسے روز حشر ہو اور بست ہوا لا

نتاشا نے اسے دیوانہ وار اس بڑھتے ہوئے ہجوم میں ڈھونڈنے کی کوشش کی تھی مگر وہ جیسے کہیں اچانک ہی گم ہو گئی تھی۔ نتاشا کو لوگوں کی بھیڑ میں کئی دھکے لگے تھے۔ یہاں تک کہ پیر تک کچلے گئے تھے مگر یہ تو کوئی تکلیف ہی نہیں تھی جو فردوس گوہر نے برداشت کی ہوگی۔ اسے دل کا روگ بھول گیا تھا۔ یہ بھی کہ موئی نے فریب جال پھینکا تھا اسے تو بس بار بار وہی یاد آتی تھی جو زندگی کی ہر مشکل میں اس کے ساتھ آ کر کھڑی ہو جاتی تھی۔

"کیوں پریشاں ہوتی ہو نتاشا، دنیا کے مسئلے ہیں دنیا میں ہی ختم ہو جائیں گے۔ وقت پر ہر کوئی سیکھتا ہے نیلم بھی سدھر جائے گی"۔

نیلم کی طرف سے ملنے والی ہر پریشانی کو وہ چن لیتی تھی اب آ کر راز کھلا تھا کہ ہم جو دنیا کے سامنے خیر بانٹتے ہوئے نظر آتے ہیں ہمارے اپنے کھوہ اندر شر کے ڈیرے ہوتے ہیں۔

وہ ملبے کی کونج جیسی گھر آئی تھی۔ اندرون لاہور کی تنگ گلیوں میں بھٹک رہی تھی۔ وہ کچی پکی تنگ گلیاں، دروازوں پر بیٹھی ہوئیں عورتیں، سبزیوں کی چھوٹی چھوٹی دکانیں، پان کی پیک سے بھری سڑکیں وہ غائب دماغی سے چل رہی تھی۔

گھر پہنچتے ہی اس کے ڈھیلے حال کو نیلم نے نوٹ کیا تھا۔

"کیا ہوا نتاشا؟"۔

"سب ختم ہو گا مجھ سے"۔

باجی کڑھی کا بیسن گھولتے ہوئے کچن سے ویسے ہی باہر آ گئی تھیں۔

"کیا ختم ہو گیا نتاشا؟"

وہ بس نیلم کی گود میں سر رکھے لیٹ گئی تھی۔ آنکھوں سے آنسو بھل بھل بہنے لگے تھے۔

"اتنے عرصے میں اس نے کبھی بھی میرے لیے کوئی بے چینی نہیں دکھائی ہمیشہ ہی میرا اعتبار کیا۔ وہ ہمیشہ مجھے اپنا قطب نما کہتی رہی۔ مگر میں نے اسے سیدھا راستہ ہی نہیں دکھایا بلکہ اس کی منزل ہی گم کر دی۔ میری وجہ سے فردوس گوہر بھٹک گئی"۔

وہ دونوں اس کی باتیں سن کر سناٹے میں آ گئیں۔ وہ صرف اتنا جاننا چاہتی تھیں کہ ہوا کیا تھا۔ ہونے کو جو ہونا تھا وہ تو ہو گیا تھا۔ سارا سوشل میڈیا فردوس گوہر کی تصویروں سے بھرا ہوا تھا۔

نتاشا ابراہیم کو وہ ٹوٹی بکھری گوہر یاد آئی تھی۔ جو اپنے دوستوں کی بے رخی کا نوحہ لے کر آئی تھی۔

"نتاشا۔ انہوں نے مجھے مارا۔۔ مجھے اتنے لوگوں میں ذلیل کیا اور میرے سر ایک ایسا الزام

منڈھا جو میرے لیے کبھی ہو ہی نہیں سکتا۔ ایسے الزام تو مکمل انسانوں کے سر جاتے ہیں۔ مجھ آدھی ادھوری میں اتنی سکت نہیں۔ میں خیانت کرنے والے کہاں سے لگتی ہوں؟ دنیا پھر سے بری لگنے لگی ہے۔ اعتبار کو پھر سے موت آنے لگی ہے"۔

بہت وقت لگا تھا اسے سنبھلنے میں۔ مام نے بتایا تھا کہ وہ راتوں کو اٹھ اٹھ کر رونے اور چیخنے لگتی تھی۔ امل کے ملنے سے وہ بہت زیادہ خوش تھی۔

"دیکھنا ننا شا، میری اپنی ایک شناخت ہوگی۔ لوگ مجھے سنیں گے۔ مجھے ویلیو دیں گے۔ اور پھر میں اس مقام پر پہنچ کر اپنے جیسوں کی مدد کرسکوں گی کہ زندگی ہر چیز سے بڑی ہوتی ہے کسی بھی صدمے اور نقصان سے۔ ہر چیز سے۔"

اب زندگی کے لیے شاید نظریہ بدل گیا تھا۔ سر سے آسمان ہی اڑ گیا تھا خلاؤں کے دبیز سناٹے تھے۔

وقت کے ہاتھ میں صرف گزرنا تھا۔ اور وقت گزر گیا تھا۔ ہر چیز پر ریت ڈالے۔ تمام گلے سمیت...... تمام خساروں سمیت۔ بس ایک تلاش تھی کہ ختم ہی نہیں ہوتی تھی۔

شہر لاہور میں وہ تینوں بس ایک انسان کو ڈھونڈتی پھرتی تھیں۔ وہ تینوں کنیز، عدن اور ننا شا۔ جسے ڈھونڈتی تھیں وہ روپوش ہوگئی تھی۔ دھند میں گم......!

☆☆☆

تمکین جمال نے عدن جبار کو کال کی تھی۔ بادل چاروں طرف سے پورے آسمان کو لپیٹ میں لے چکے تھے۔

"ہم نے اس کے ساتھ بہت برا کیا عدن"۔

"مجھے اب احساس ہو رہا ہے میں نے سب سے زیادہ تکلیف دی اسے" عدن کے کمرے کی کھڑکیوں کے پار بادلوں نے رنگ بدلا تھا۔ گھور سیاہ

"تم اور کنیز اس کے گھر گئی تھیں کیا؟"۔

"ہاں ہم دونوں گئی تھیں ملازموں نے کہا کہ وہ اب یہاں نہیں رہتی۔ اس کی فیملی کا کوئی اور فرد بھی نہیں ملا"۔

"انسان چڑیا کی طرح تنکا تنکا کر کے عزت بناتا ہے اور لمحوں میں سب ختم ہو جاتا ہے۔ شاید اس چیز کا منظر عام پر آنا اس کی فیملی کے لیے بھی بہت بڑا دھچکا تھا جانے کیسے سنبھلے ہوں گے"۔

عدن نے دونوں ہاتھوں سے سر پکڑ لیا تھا۔

تمکین ارسلان کے ساتھ جمال ابا کی طرف آگئی تھی۔ نیم کی نمکولیوں کو چڑیاں ٹونگتی تھیں۔ وہ اپنے شوہر کو ابا سے کسی دوست کی طرح گپ شپ لگاتے دیکھتی رہی تھی۔

"ہم لڑکیاں خوابوں کو ہی حقیقت کیوں سمجھ کر بیٹھ جاتی ہیں۔ حقیقتیں بھی تو ہر بار تلخ نہیں ہوتیں۔"

ایک لمحے میں وہ شخص اس کے دل کے سب سے اونچے مقام پر تھا۔

"بات یہ نہیں ہے کہ ہم کیا کرتے ہیں۔ بات یہ ہے کہ ہم کیسے کرتے ہیں۔ رشتوں اور کاروبار میں صرف حلال دیکھا جاتا ہے۔ حلال سے بڑھ کر کوئی پیمانہ نہیں ہوتا۔ کبھی نہیں ہوتا۔ رہی بات دل کی تو دنیا کے کئی رنگ چڑھ جاتے ہیں۔ بہکاوے میں آجاتا ہے"۔

وہ فصیلوں کو جھاڑ کر جالے اتارتی رہی تھی۔ وہی گھر جہاں زندگی گزری تھی۔ شادی کے بعد سب پرایا پرایا لگنے لگا تھا۔

ایک بھوری مکڑی پر تمکین کا آنسو گرا تھا اور وہ سہم کر دیوار کے کونے میں کھسک گئی تھی۔

"یہ تو میں نے کبھی سوچا ہی نہیں ابا، کہ آپ نے ہمیشہ مجھے حلال کھلایا۔ حلال کمایا۔ بھلا الائچی کے کھیت، بادیان کے پھول، اور جائفل بھی نفرت کے لائق ہوتے ہیں؟ نہیں کبھی بھی نہیں"۔

کامیابیاں، میڈل، جیت، فتح دنیا کے ہر پیمانے پر حلال بھاری ہوتا ہے......!

تمکین جمال نے وہ راز پالیا تھا......!

☆☆☆

پروفیسر کنیزاں فاطمہ نے پنجاب یونیورسٹی

کے کیمیا ڈپارٹمنٹ میں ابھرتے ہوئے شاعر علیم ارحم کی شاعری کی کتاب مکمل کر کے کنارے پر رکھی تھی۔

"سچ ہی تو کہا ہے شاعر نے کہ زندگی بے ثباتیوں کی علامت ہے۔ ایک مسلسل جنگ ہے جو لڑنا پڑتی ہے اور ہنسی اس بات پر آتی ہے کہ مال غنیمت میں ہمارے پاس صرف ہم ہی بچتے ہیں۔ ٹوٹے پھوٹے۔ پیوند زدہ۔۔ جڑ کو کل بکھنے والے۔ سب فنا ہے۔ یہ دیواریں، یہ راستے، یہ تعلق سب ختم ہو جائیں گے ہم سب سمیت۔"

علیم ارحم کی شاعری کی کتاب کے سرورق پر تتلیوں کا ایک جھنڈ دکھائی دیتا تھا جن کے پنکھ جھڑ چکے تھے۔ وہ بھی انسانوں جیسی ہو گئی تھیں۔ پیوند زدہ......!

☆☆☆

ہر طرف چیت کا موسم ہے پنجاب یونیورسٹی کی شاہراؤں پر نئے چہرے ہیں نئے خوابوں سمیت۔ کچنار کے درختوں پر پھول کھل چکے ہیں۔

وہی سرمئی سڑکیں ہیں جو قہقہوں سے گونجتی ہیں۔ کئی رنگ برنگے آنچل اٹھکیلیاں کرتے گزر جاتے ہیں۔ ہاسٹل روڈ کی رونقیں ویسے کی ویسی ہی برقرار ہیں۔

بس ایک تبدیلی ہوئی ہے کہ کردار بدل گئے ہیں

کوئی چہرہ سیرت امتیاز کا چہرہ نہیں۔

کسی شرارت کے پیچھے تمکین جمال کا ہاتھ نہیں۔

کسی خوب صورت ہنسی میں فردوس گوہر نہیں۔

ناز و انداز کے روپ میں کوئی روپ عدن جبار کا نہیں۔

بس ایک پروفیسر کنیز فاطمہ ہے جو آج ہی کی دوپہر ایک عجیب کیفیت سے دوچار ہو گئی تھی۔ یونہی لیب میں پڑے سارے محلولوں سے کھٹی سی کی مہک آنے لگی تھی۔ گاگروں میں چھلکتا ہوا چھاچھ۔۔۔ لیب کی دیواریں کھگل اور شرینہہ کی چوٹیاں بن گئی ہیں۔

وہ ٹھٹک گئی تھی۔ آس پاس تھل زندہ ہو گیا تھا۔

بس یہی انقلاب ہوتا ہے اچانک ہی زندگی کے کسی لمحے پر قابض ہو جاتا ہے۔ تھل واسی کنیزاں بھی اسی انقلاب کی زد میں آگئی تھی۔

اسٹوڈنٹس نے اپنی فیورٹ پروفیسر کو کوریڈورز سے دیوانہ وار بھاگتے دیکھا تھا۔ چہرے پر ہنسی تھی اور وہ اپنے بال کانوں کے پیچھے اڑستی جاتی تھی۔

تمکین جمال نے چاولوں میں لونگ شامل کرتے ہوئے کنیزاں کا فون سنا تھا۔

"تم نے ٹھیک پہچانا تمکین۔ سب بکھیڑے ہیں۔ سب سراب۔ زندگی میں اصل چیز تو فیصلے ہوتے ہیں۔ ذات کا مفید ہونا ہے کہ بس ایک ایسی چھتری تان لو کہ سب جمع ہو جائیں۔ تم دیکھنا تمکین میں اپنے تھل کو کیا سے کیا بنا دوں گی۔"

دور دھریک کے نیچے بیٹھے ہوئے اماں سرسوں کے تیل کو بوتلوں میں بند کرتے چونک گئی تھیں۔ دروازے کے بیچوں بیچ ہنستی مسکراتی اپنے سامان سمیت کھڑی وہ کنیزاں فاطمہ تھی۔

ابا کھل بنولے کے ڈھیر جدا کرتے پتھر ہو گئے۔ یہ چہرہ تو وہی چہرہ تھا۔ یہ رنگ بھی وہی رنگ تھا۔

کنیزاں فاطمہ کے پورے وجود سے تھل ابل رہا تھا۔

وہ آگے بڑھ کر اماں کے گلے لگ چکی تھی۔ اماں کچھ بھی نہیں کر سکی تھیں اتنا کہ بس دل سے لگا لیا۔

"بھاڑ میں جائے دنیا۔ زمانے والے۔ کنیزاں نے کون سے قتل کیے ہیں۔ دنیا تو کہتی رہتی ہے۔"

ماں تھیں اور جان گئی تھیں کہ سامنے والی بھی جنگ لڑ کر آئی ہے۔ ابا نے سر اٹھا کر آسمان کی طرف دیکھا تھا۔ اور بس مسکرا دیے تھے۔

"جہاں کا بیج ہو وہیں پھلتا پھولتا ہے۔"

☆☆☆

کیمرے روشنیوں کی چکا چوند میں فردوس گوہر نے اپنے کیمرے کو کنفرم کرنے کے بعد بولنا شروع کیا تھا۔

"ہم زندگی میں کامیاب ہونا چاہتے ہیں۔ بس صرف جیتنا چاہتے ہیں۔ چیزوں سے، رشتوں سے اور ہاں دوستوں سے بھی (آنکھ سے آنسو جھلکتی ہے) مگر انسان کسی بھی ایک فیز سے گزر کر دوسرے تک نہیں پہنچ پاتا۔ ہم گزرے وقت کو بہت کوسنے دیتے ہیں۔ ملامت کرتے ہیں۔ مگر سچ کہوں تو کچھ بھی بے سبب نہیں ہوتا۔ یوں ہی ہونا ہوتا ہے۔ آج میں ایک کامیاب فیشن ماڈل، بیوٹیشن اور سوشل ورکر کے طور پر اپنی خدمات سرانجام دے رہی ہوں۔ بہت سے تمغے۔ بہت سی فتوحات۔ دیکھنے والوں کو یہ زندگی بہت چارمنگ لگتی ہے۔ مگر ہر کسی کے پاس اپنے سچ ہوتے ہیں۔ کچھ جھوٹ بھی ہوتے ہیں۔ مجھے کسی نے کہا تھا کہ سچ بھی تکلیف میں نہیں ڈالتا۔ انہوں نے سچ کہا تھا۔ غلطی میری ہی تھی کہ میں نے اپنے سچ کو خوف کے پردے میں چھپایا۔ اس میں کسی کا قصور نہیں۔"

ٹشو باکس سے ٹشو کھینچ کر آنکھوں کے جھرنے صاف کرتی ہوئی گوہر کو کئی نظریں دیکھتی تھیں۔ ٹکٹکی باندھ کر۔ آنکھیں جوڑ کر۔

"زندگی میں سب سے زیادہ کس چیز کی کمی محسوس کرتی ہیں؟" اینکر نے وہ اہم سوال پوچھا تھا۔ انٹرویو ختم ہونے والا تھا اور یہ آخری سوال تھا پھر سیٹ تاریکی میں ڈوب جانا تھا۔

وہ ہولے سے مسکرائی تھی۔

"صرف دوستوں کی۔" وہ حزن و ملال کی شاعری جیسا لہجہ فضا کو سوگوار بنا گیا تھا۔

"کسی خاص کے لیے کوئی پیغام؟"

وہ اب اپنا دوپٹا سمیٹ کر ہیل کی نوک پر اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔ ماسٹر شاٹ میں وہ اینکر کے ساتھ کھڑی تھی۔

"میں تم سب کو معاف کرتی ہوں۔ میں تم سب کو یاد کرتی ہوں۔"

اینکر چونک گئی تھی۔ ہر دیکھنے والا ٹھٹک گیا تھا۔

"آپ کن کی بات کر رہی ہیں؟"

"کچھ راز ہمارے پاس امانت ہوتے ہیں۔ اور امانتوں میں خیانت میں نے کبھی نہیں کی۔"

یہ کہہ کر وہ خوشبوؤں میں بھیگی اپسرا اسکرین سے آؤٹ ہو گئی تھی۔

اسے ادھوری بات کر کے پورے مطالب سمجھانا آ گیا تھا۔ بس واپسی پر کوئی فردوس گوہر کی آنکھوں کے آنسو کوئی نہیں دیکھ سکا تھا۔

عدن جبار کی موبائل اسکرین تاریکی میں ڈوب گئی تھی مگر پہلی بار یہ تاریکی بری نہیں لگی تھی۔ تو یہ طے تھا کہ وہ زندگی میں بہت آگے جا چکی تھی اور یہ بھی کہ جلد وہ اسے کھوج نکالیں گی۔ اور دوستوں کے تو پیر پڑ کر بھی منایا جاتا ہے۔ گھٹنے تک ٹیک دیے جاتے ہیں۔ اور معاف بھی کر دیا جاتا ہے۔ ایک آنسو گرتا ہے آنکھ کے چھپر سے اور بس۔۔۔!

تھل کے اونچے ٹیلے پر کنیزاں فاطمہ تختہ سیاہ لگائے اپنے طالب علموں کی قطاریں ٹھیک کروا رہی تھی۔ بچے کے کھیت ٹیلوں کی گہرائی میں تھے اور اس کا کمرا جماعت ٹیلوں کی چوٹیاں تھیں۔

اس نے اپنا پہلا سبق سنانا شروع کر دیا تھا۔

اونٹوں کی ٹلیاں گونج رہی تھیں۔

کچھ بھی کچھ نہیں ہوتا۔ زندگی، مقصد اور دوست سب کچھ ہوتے ہیں۔

یہی کہانی تھی جو مجھے آپ سب کو سنانی تھی۔

سب کچھ ہوتے ہوئے بھی اندر ایک چیز ہمیشہ رہ جاتی ہے "لا" نفی کا کلمہ۔ نہیں۔

انسان سب کچھ دسترس میں لینے کو بھاگتا ہے مگر ملتا وہی ہے جو اوپر والا فیصلے کرتا ہے۔!

☆☆

اُمِّ اقصیٰ

بے غیرت

سالانہ مشاعرے کے مہمان خصوصی سر سلطان گوہر سے بھی لڑکیاں متاثر دکھائی دیتی تھیں۔ ان کی شخصیت، آواز و انداز بھی متاثر کن تھا۔ مشاعرے کے آخر میں جب فورتھ ایئر کی کنزیٰ کی فرمائش پر انہوں نے اپنی مشہور زمانہ نظم "خاموش بارش" پڑھی تو بیشتر لڑکیاں دل تھام کے رہ گئیں۔ موٹل کو ان کی بیٹی ہونے کے باعث خصوصی پروٹوکول مل رہا تھا۔ اک سادہ سی مسکراہٹ اس کے چہرے پر چسپاں تھی۔ وہ ایسی ہی تھی کم گو، چپ سی جبکہ فورتھ ایئر کی مومنہ ان کے بہن ہونے کے ناتے ملنے والے پروٹوکول سے خاصی نازاں تھی۔

"ارے مومنہ! ہم کتنے بے خبر تھے سر سلطان کی شاعری تو اکثر پڑھنے کو ملتی تھی مگر وہ اتنے عمدہ پرسنلٹی کے مالک ہیں۔ اس قدر گہری گہرائی سے زندگی کا تجزیہ کرتے ہیں۔ اوپر سے ان کی آواز..... اف..... "شہمرین آنکھیں میچے بولے جارہی تھی۔

"وہ کتنی لکی ہو ناں تم۔" فرح کے لہجے میں بھی مصنوعی حسرت تھی۔

"کوئی شک.....!" مومنہ گوہر اترا کے کھلکھلائی۔ "سب کچھ بیسٹ ہونے کے ساتھ وہ ایک بیسٹ بلکہ میں کہوں گی بہترین بھائی ہیں۔ میں پانچ سال کی تھی جب بابا کی ڈیتھ ہوئی۔ بھائی نے باپ بن کے پالا، خود ان کی شادی ہوگئی بچے ہوگئے۔ اوروں کے بھائی بدل جاتے ہیں مگر وہ تو ہر گزرتے دن کے ساتھ اور اچھے ہوتے جارہے ہیں۔ موٹل اور مجھ میں کبھی فرق نہیں کیا انہوں نے..... آئی لو ہم سو مچ۔" مومنہ جذب سے بول رہی تھی۔ لہجے میں سچائی ٹپکتی تھی۔

"موٹل سلطان تمہارے بابا از کمال است۔"

آمنہ اپنے باب کٹ میں انگلیاں چلاتی موٹل کے سامنے دوزانو بیٹھتے ہوئے بولی۔

"رئیلی یار، میں نے بھی ایک دو بار پک میں دیکھا ہے۔ مگر حقیقت میں زیادہ گریس فل ہیں۔ اور خاص طور پر سے ان کی باتیں۔ دل چاہتا وہ بولے جائیں ہم سنتے جائیں اور سے ٹھہراؤ ہے۔" اب کے صبا بولی۔

"کبھی میم کا لیکچر بھی اس دھیان سے سن لیا کرو۔" آمنہ نے اس کے دھپ لگائی۔

"بشرطیکہ میم لیکچر سر سلطان جیسا دیں۔" موٹل کے کندھے پر سر رکھتے صبا نے انگلی اٹھائے وضاحت دی۔

موٹل محض مسکرارہی تھی۔

"ویسے موٹل ایسا ہوتا ہے ناں ڈراموں، فلموں کہانیوں میں کہ سہیلی کے باپ سے محبت ہوجاتی ہے۔ سہیلی پھر سہیلی کو سوتیلی ماں کے روپ میں قبول کرلیتی ہے۔" آمنہ آلتی پالتی مارے ایک ہاتھ تھوڑی تلے رکھے بظاہر معصومیت سے پوچھ رہی تھی۔ اب کے صبا نے بک اس کے سر پر دے ماری۔

"تمہیں پتا ہے، بابا سب سے زیادہ کس سے محبت کرتے ہیں۔"

دونوں نے نفی میں سر ہلایا۔

"مجھ سے..... وہ دنیا کے سب سے گریٹ

باپ ہیں۔'' مومل کے لہجے میں محبت ہی محبت تھی۔ فخر ہی فخر تھا۔ بے حد مان تھا جبکہ آنکھوں میں نمی سی تھی۔

چھٹی ٹائم سر سلطان کے دونوں بازوؤں کے ہالے میں بہن اور بیٹی تھی۔ دیکھنے والی آنکھوں نے رشک سے دیکھا، اور کچھ نے حسرت سے بھی۔ کس قدر مکمل انسان تھے سر سلطان گوہر بھی اور اس کے گھر والے بھی۔

☆☆☆

اس نے اپنی ماں کی آنکھیں ہمیشہ نم ہی دیکھی تھیں۔ اکثر اسے لگتا جیسے اس کی ماں بے تحاشا روئی ہوں۔ شعور کی منزل سر کرتے وہ ماں کی آنکھوں سے الجھتی پائی گئی۔ ایک دو بار اس نے ماں سے پوچھا بھی تو وہ کہتے ہوئے ٹال جاتیں۔

''میں نے پیاز کاٹی ہے ناں۔''

''وہ باپ سے الجھنے لگتی وہ اتنی کڑوی پیاز کیوں لاتے ہیں آخر......''

ایک دن یونہی اس کی ماں سبزی کاٹنے بیٹھیں۔ اس نے پیاز ان کے ہاتھ سے لے لی کہ وہ کاٹے گی۔ پوری پیاز کے چھیلنے سے کاٹنے تک بمشکل دو آنسو اس کی آنکھوں سے بہے تھے۔ جبکہ اس کی ماں کی آنکھوں سے تو اک شدت اور تواتر سے بہتے۔ پرسوچ نگاہوں سے وہ ماں کی کھوج میں لگ گئی۔

وہ سادہ کپڑے پہنتی تھیں۔ سارے حلیے میں ہی سادگی کا عنصر رہتا۔ ان کے بال لمبے گھنے اور گھنگھریالے تھے مگر ہمہ وقت چوٹی میں گندے رہتے یا کیچر میں قید پائے جاتے۔ بمشکل پینتیس سال کی تھیں وہ مگر حلیہ پچاس سالہ بنائے رکھتیں۔ فنکشز میں بھی نیا سوٹ اور نیچرل کلر کی لپ اسٹک۔ ایک دو بار اس نے ٹوکا تو وہ دھیمے مسکرا کے بولتیں۔

"میں کیا کروں گی تیار ہو کر۔" اس سے بھی اسے اپنی ماں کی آنکھوں میں نمی اٹڈتی لگتی۔ فنکشز میں وہ کونے کی کرسی پر براجمان رہتیں۔ اکثر عورتوں کو دیکھتے اسے ماں کی آنکھیں ویران اور حسرت زدہ لگتیں۔

ایک دن اس کے ہاتھ ماں کے کالج کے زمانے کا البم لگا۔ ایک سے ایک شوخ رنگ انہوں نے زیب تن کیا ہوا تھا۔ خوب صورت مسکراہٹوں کے بہت سے رنگ ان کے چہرے پر بکھرے تھے۔ اسے حیرت ہوئی یہ جان کر کہ اس کی ماں ہنسا بھی کرتی تھیں۔ کھلکھلایا بھی کرتی تھیں۔ اور پھر ایک دن اس کو ماں کی خاموشی اور اداسی کا راز پتا چلا۔

☆☆☆

مومل کے بی ایس سی پیپرز ہوئے دو ماہ ہو چلے تھے۔ وہ یونیورسٹی کی تیاریوں میں تھی جب ریان کا پرپوزل آیا۔ ماما نے اسے بتایا تو وہ الجھ پڑی۔

"ماما۔ پلیز۔ میری ابھی اسٹڈی مکمل نہیں ہوئی۔ اور ویسے بھی ابھی ایک سال ہوا ہے محض مومنہ پھپھو کی شادی کو۔ دادو تو پہلے اتنا اداس رہتی ہیں اور آپ بھی کہ گھر کتنا سونا سونا لگتا ہے۔ اب آپ مجھے رخصت کرنے کر سوچ رہی ہیں۔"

"بیٹا گھر تو اک دن سونا ہوتا ہی ہے۔ آپ کے بابا کو بہت پسند ہے ریان۔" وہ ازلی شائستگی سے گویا ہوئیں۔

جواباً مومل خاموش رہی۔

رات یونہی وہ بیڈ پر نیم دراز کسی کتاب کے مطالعے میں مگن تھی۔ جب ہلکی کھنکار کے بعد بابا اندر آئے۔

"ارے بابا آپ......!" وہ بعجلت بیڈ سے اتری۔

"یونہی بیٹا۔ بس سوچا آپ سے گپ شپ لگائی جائے۔ وہ بیڈ پر آن بیٹھے۔ کچھ دھر ادھر کی باتوں کے بعد انہوں نے وہ پوچھا جس کے لیے آئے تھے۔

"آپ کی ماما نے آپ کو ریان کے بارے میں بتایا ہے؟"

"جی بابا۔" وہ دھیمے سے بولی۔

"بیٹا۔ اگر آپ کو ذرا سا بھی ایک قطرہ برابر بھی اعتراض ہے تو آپ بتا دیں۔ میں آپ کو فوقیت دوں گا۔ اگر اسٹڈی وغیرہ اس طرح کا کوئی اور بہانہ ہے تو وہ بعد میں بھی ہو جائے گی۔ ابھی صرف نکاح کرنا ہے۔ ریان کو پیپرز چاہئیں آپ کے ویزے کے سلسلے میں۔ اس دوران آپ اسٹڈی کمپلیٹ کر سکتی ہیں۔"

"بابا میں شادی نہیں کرنا چاہتی۔" سر جھکائے ہاتھ مسلتی وہ بولی۔

"آپ کو ریان کے رشتے پہ اعتراض ہے۔" باپ کے لہجے میں خدشے سے بولے۔

"نہیں بابا......"

باپ کے لبوں سے ٹھنڈی سانس خارج ہوئی۔

"پھر......؟"

آنسو بھری آنکھیں اس کے پردہ اسکرین پر ابھریں۔

"صبح کا آغاز تھا۔ مومل سحر خیز کبھی بھی نہیں رہی تھی مگر آج اس کا اہم ٹیسٹ تھا۔ رات سر درد کے باعث وہ جلد ہی سوگئی۔ صبح تین بجے سے اٹھ کے وہ پڑھ رہی تھی۔ سحر پھوٹتے اسے یاد آیا پاپا نے آج اسلام آباد جانا تھا۔ اسے کچھ چیزیں چاہیے تھیں۔ لسٹ پکڑے وہ سیڑھیاں اترتے نیچے کی جانب آئی۔

"عرشی۔" باپ کی گونج نما پکار پہ وہ ڈر سی گئی۔ "تمہیں میں نے بلیو لائننگ والی شرٹ کہا تھا۔ یہ سادہ پریس کی ہوئی ہے...... بے غیرت عورت......" شرٹ زور سے پٹخی گئی۔

"اوہ! رات اماں کو دوا دے رہی تھی۔ ان کی طبیعت شاید زیادہ خراب تھی۔ تبھی انہوں نے تھوڑی دیر روکے رکھا۔ میرے ذہن میں تھا، میں نے سوچا صبح کر دوں گی۔ مگر اب تو لائٹ۔"

"جنریٹر تیسری منزل پر تھا مگر آواز یہاں تک آ رہی تھی۔

"کبھی کوئی کام ڈھنگ سے ہوا ہے تم سے...... جاہل اجڈ عورت۔" اس کی ماں جواباً خاموش رہی تھی۔

"گاڑی نکلنے میں صرف دس منٹ باقی ہیں یہاں کئی مصیبتیں پڑی ہیں ابھی نپٹانے کو۔"

"آپ وہ مہرون والی پہن لیں۔"

"چپ...... کتی عورت......" بیگ اٹھاتے وہ یونہی بغیر کپڑے تبدیل کیے باہر نکل گئے۔

کتنے آنسو تھے جو اس کی ماں کی آنکھوں سے نکل رہے تھے، اس کے دل پر گر رہے تھے۔

اس کا باپ اچھا بیٹا تھا۔ اچھا بھائی تھا۔ بہترین باپ تھا پر ایک بہت برا شوہر تھا۔ وہ اس کی ماں کو یونہی ذرا ذرا سی بات پر بے عزت کر دیتا تھا۔ جب سے مومل بڑی ہوئی تھی۔ بے غیرتی کمرے تک محدود ہوگئی تھی۔ اس کی ماں کا قصور یہ تھا کہ وہ سادہ تھیں۔ تصنع بناوٹ سے کوسوں پرے۔ اپنے شوہر کے دل پر وہ چڑھ ہی نہ پائی تھیں۔ تو راج کیسے کرتیں۔ دل پر چڑھنے کے فن سے نا آشنا تھی۔ آشنا ہوتیں بھی کیسے۔ اس کے شوہر نے بھی اسے سراہا ہی نہ تھا۔ پذیرائی ہی نہ کی تھی۔ ساری دنیا سے لفظوں بدولت واہ واہ سمیٹتا پر بیوی کے لیے ایک لفظ تک نہ کہہ پاتا۔ آنسو ٹوٹ کے مومل کی ہتھیلیوں پر گرے۔

مومل بیٹے میں نے کچھ پوچھا ہے۔" وہ بے چین ہوئے۔

اسے لگا یہی موقع ہے اپنی ماں کے لیے بولنے کا۔ ماں کا بھرم ماں کی محبت چکانے کا ادنیٰ موقع۔

"کیونکہ پاپا مجھے بے غیرت اور کتی عورت کہلوائے جانا پسند نہیں۔"

ڈھیر سارے آنسو اک تواتر سے اس کی آنکھوں سے اترے۔ سر اٹھا کے اس نے باپ کو دیکھا۔ اسی سے انہوں نے سر جھکایا تھا۔ صدیوں کے آنسو تھے جو مومل کی آنکھوں سے جھڑی کی صورت بہہ رہے تھے۔

سلطان گوہر کا ہاتھ اس کے شانوں سے پھسلا ہتھیلیوں پر ساکت ہوا پھر وہ اٹھے اور شکستہ چال چلتے باہر نکل گئے۔

بہتی آنکھوں کے ساتھ مومل نے گہرا سانس لیا۔ خودی کا مینار تھا جو اس کے باپ نے اپنے سر چڑھا رکھا تھا جہاں سے خون کے رشتے تو نظر آجاتے تھے۔ مگر کسی اور کے خون کا رشتہ بونا لگتا۔ آج وہ مینار پاش پاش ہوا تھا۔ مومل کو یقین تھا اب وہ رشتہ بھی نظر آئے گا جو خون کا تو نہیں۔ مگر اٹوٹ ہے۔ جیون کے سفر میں اس کی ماں کو ہمسفر ہی نہیں ساتھی بھی ملنے والا تھا۔

☆☆

مہوش افتخار

دامنِ سحاب

پچھلی قسط کا خلاصہ

حاتم گردیزی کو جب یہ علم ہوتا ہے کہ سلوی بڑے سرکار کے بیٹے ملک اسفندیار کے ساتھ بھاگ گی ہے تو وہ طیش میں آکر پسٹل اٹھا لیتے ہیں۔

شاہ مخدوم چنگیزی ان کو احساس دلاتے ہیں کہ ملک اسفندیار کو یہ جرأت ان کے اپنے خون نے دی ہے اور وہ اس بے غیرت کے لیے اپنے گھر کو برباد نہیں کر سکتے اور سجان اور منیرہ تو یہ صدمہ برداشت ہی نہیں کر سکتے۔

سلوئی اپنے سسرال پہنچتی ہے تو وہاں پر اسے کسی کے چہرے پر خوشی نظر نہیں آتی۔ بڑے سرکار خاندان کی عورتوں کا تعارف کرواتے ہیں۔

زمرد کو جب علم ہوتا ہے کہ بہادر دوسری بیوی لے آیا ہے تو وہ ہال میں آتی ہے اور چیل کی طرح سلوئی پر

جھپٹ پڑتی ہے۔ سلویٰ پر انکشاف ہوتا ہے کہ حویلی میں اسفندیار کو سب بہادر کے نام سے پکارتے ہیں اور زمرد اسفندیار کی پہلی بیوی ہے۔

سلویٰ کے حواس گم ہوجاتے ہیں۔
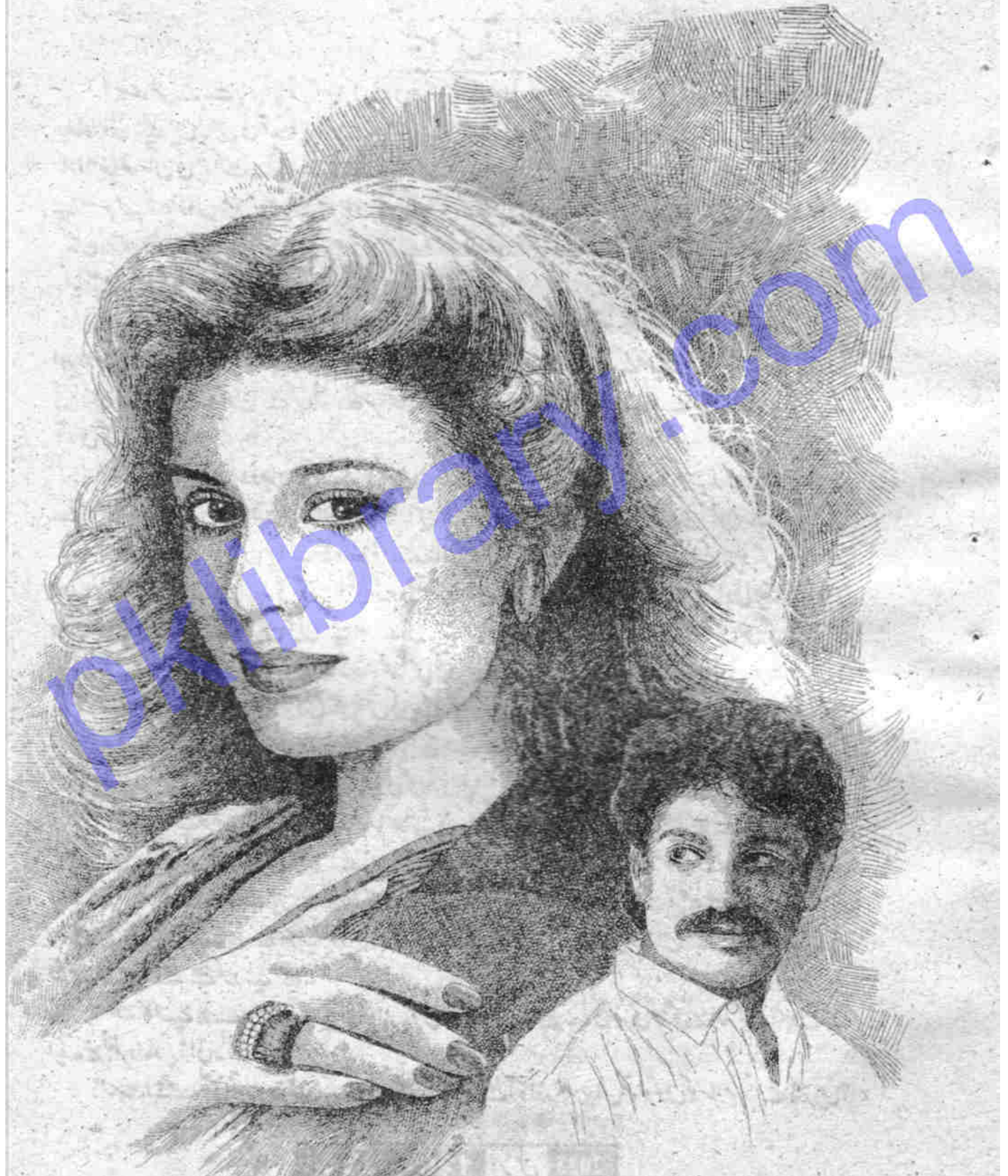
حیااور جرار کے آپس کے تعلقات خوش گوار نہیں ہیں۔
شادی کے دوسرے دن شاہ مخدوم مری والے کاٹیج کے پیپرز حیا کو تحفے میں دیتے ہیں۔
سلوئ ہوش میں آتی ہے خود کو ایک انجان کمرے میں پاتی ہے۔ اور وہاں اسفند یار عرف بہادر کو دیکھ کر سب یاد آجاتا ہے۔ اور وہ اسفند یار سے طلاق کا مطالبہ کر دیتی ہے۔

تیئسویں قسط

اسفند کمرے سے باہر آیا تو پتا چلا کہ بی بی نرگس کے بھائی اور اس کے سسرالی آل اولاد سمیت حویلی پر دھاوا بول چکے ہیں۔ ان کی آمد کا پیغام ملنے پر اس کے اعصاب نئے سرے سے تن گئے۔ وہ پہلے ہی اچھا خاصا بھرا بیٹھا تھا، ان کی جرأت نے گویا اسے آگ لگا دی۔ وہ تن فن کرتا بڑے کمرے میں چلا آیا جہاں نہ صرف اس کے سسر اپنے چاروں بیٹوں سمیت موجود تھے بلکہ اس کے باقی دو ماموں اور تینوں خالائیں بھی بیٹھے ہوئے تھیں۔ زور و شور سے ہوتی بحث نے ماحول کو خوب گرما رکھا تھا۔ اس کے اندر قدم رکھتے ہی چار سو یوں سناٹا چھا گیا جیسے کوئی ذی النفس موجود نہ ہو۔

اسفند نے ایک سرد نظر ان سب پر ڈالی اور سلام دعا کا تکلف کیے بنا مضبوط قدموں سے چلتا ہوا اپنے باپ اور دونوں بڑے بھائیوں کے برابر میں جا بیٹھا۔ اس کے تیور وہاں موجود اس کے ننھیالیوں کو سرتاپا سلگا گئے۔ بی بی نرگس نے خشمگیں نگاہوں سے کروفر سے سر اٹھائے بیٹھے بیٹے کو دیکھا جس کے چہرے پر رتی برابر پروا نظر نہیں آرہی تھی۔

"کیوں پتر اوئے، دو جاویاہ کرتے ہی سارا ادب لحاظ وچ کھایا ہے؟" اس کے سب سے بڑے ماموں نے استہزائیہ انداز میں دریافت کیا۔ ان کی چوٹ اس کے سالوں کے چہروں پر دبی دبی سی مسکراہٹ بکھیر گئی۔

اسفند نے ان چاروں پر ایک نگاہِ غلط ڈالے بنا اپنے مخاطب کی جانب دیکھا جن کے پہلو میں بیٹھی سوں سوں کرتی زمرد اسے زہر لگ رہی تھی۔ کاش کہ وہ حقیقت میں بھی اتنی ہی مظلوم اور بے قصور ہوتی جتنا کہ وہ اس وقت خود کو ان سب کے درمیان پیش کیے ہوئے تھی۔ یہ اس کی بدزبانی، جہالت اور ہٹ دھرمی ہی تھی جس نے اولین قدم پر اسفند کو اس سے دور کیا تھا۔ حالانکہ اس کی ماں (بی بی نرگس) نے اسے سمجھانے کی بہت کوشش کی تھی۔ خود اسفند نے بھی شروع شروع میں اس کی بدتمیزیوں اور بدسلیقگیوں کو بہت حد تک نظر انداز کیا تھا۔ مگر وہ سنبھلنے کے بجائے آپے سے باہر ہوتی چلی گئی اور آج جب معاملہ پوری طرح سے اس کے ہاتھ سے نکل گیا تو اسے یاد آیا کہ اسفند اس کا شوہر اور وہ اس کی بیوی تھی جس پر اپنی اجارہ داری جتانا وہ اپنا حق سمجھتی تھی۔

"نہیں۔ آپ لوگوں کا اپنے باپ کے ساتھ لب و لہجہ اور انداز دیکھ کر میں نے یہ لحاظ بیچا ہے۔" ان کی آنکھوں میں دیکھتا وہ ٹھہرے۔ ہوئے لہجے میں بولا تو جہاں اس کے ماموں کے لب سختی سے ایک دوسرے میں پیوست ہو گئے وہیں بڑے سرکار کے چہرے پر اک کاٹ دار مسکراہٹ آٹھہری۔ انہوں نے اپنی مونچھوں پر انگلی پھیرتے ہوئے طنزیہ نظروں سے اپنے مخالفین کو دیکھا جن کے دانت ان کے سپوت نے پہلے ہی قدم پہ اچھے خاصے کھٹے کر دیے تھے۔

اسفند کا اپنے بڑے ماموں کو دیا گیا جواب اس کے سسر کے چہرے کی سرخی کو بھی بڑھا گیا۔ انہوں نے ایک تیز نظر داماد پر ڈالی۔

"بہت اچھے۔ یعنی تم پیو پتر مل کے میری دھی پہ سوکن لے آؤ اور ہم یہاں تم لوگوں کو سلام کرتے پھریں؟

ارے یہ لحاظ ہی تھا جو ہم نے آج تک نہ آپا اور نہ ہی بھاجی سے تیرے کرتوتوں کے بارے میں کوئی سوال کیا۔ تو میری بچی کو یہاں پھینک کر خود شہر جا بسا، ہم چپ رہے۔ تو وہاں دن رات عیاشیوں میں پڑا رہا، ہم نے اف نہ کی۔ تو اس پہ ہاتھ تک اٹھانے لگا مگر ہم نے دخل اندازی نہ کی کہ یہ میاں بیوی کا معاملہ ہے۔ مگر اب بس۔ زیادتی کرنے کی بھی کوئی حد ہوتی ہے۔ تو نے کیا اسے بالکل ہی لاوارث سمجھ رکھا ہے جو منہ اٹھا کے دوجی رن (دوسری بیوی) کر لایا؟"

وہ اسے کھا جانے والی نظروں سے گھورتے ہوئے بلند آواز میں گرجے تو اسفند کی انگلیاں سختی سے اس کی ہتھیلیوں میں پیوست ہو گئیں۔ ان کا طرزِ تخاطب اس کا خون کھولا گیا۔ وہ ان کی آنکھوں میں دیکھتا بے اختیار آگے کو جھک آیا۔

"آپ چپ اس لیے نہیں رہے کہ آپ کے آڑے میرے ماں باپ کا لحاظ تھا بلکہ آپ چپ اس لیے رہے کہ آپ اپنی بیٹی کے کرتوتوں سے اچھی طرح واقف تھے۔ بلکہ آپ کیا سارا خاندان جانتا ہے کہ یہ کتنی بدزبان، تیز مزاج اور ہٹ دھرم عورت ہے۔ آپ جانتے تھے کہ اگر آپ نے ہم سے سوال کیا تو بدلے میں آپ کو بہت کچھ سننے کو مل جائے گا۔ اس لیے آپ نے خاموشی میں ہی عافیت جانی۔ آپ سے بی بی نے ہزاروں بار اس کے غلط رویے اور بگڑی ہوئی عادتوں کی شکایت کی مگر آپ نے بھی اسے سمجھانے کی کوشش نہیں کی۔ الٹا اسے چھوٹی عمر کا کہہ کر مزید شہ دیتے رہے۔ اس نے اس گھر کی روایات کی، میرے ذہنی سکون کی اینٹ سے اینٹ بجا دی مگر آپ نے اسے کبھی نہیں ٹوکا۔ یہ نہ اچھی بیوی بن سکی، نہ فرماں بردار بہو بن پائی اور نہ ہی محبت کرنے والی بھابھی۔ اس نے نہ ہی چھوٹے بڑے کی شرم کھائی نہ ہی ملازموں کا خیال کیا۔ الٹا جب دل کیا اور جہاں دل کیا کھڑے کھڑے تماشا شروع کر دیا۔ میں شہر پڑھنے گیا تو یہ پیچھے سے مزید شیر ہو گئی۔ تنگ آ کر میں نے وہاں رہنا شروع کر دیا مگر یہ سدھر کر نہ دی۔ میں جب بھی واپس آتا یہ مجھ سے لڑائی کے بہانے ڈھونڈنے لگتی۔ میری تکلیف، میری اذیت کو بڑھانے کے نت نئے طریقے سوچنے لگتی اور آپ کہہ رہے ہیں کہ آپ لوگوں نے اف نہ کی؟"

وہ ایک ایک کر کے ان کے چہروں اور ان کی حقیقت پہ پڑے تمام پردے اٹھاتا چلا گیا تو وہاں موجود سب ہی افراد کو سانپ سونگھ گیا۔ وہ سب جانتے تھے کہ بہادر کا کہا ایک ایک لفظ درست اور اس کا کیا ہر گلہ بالکل جائز تھا۔ جب ہی کسی میں نہ تو اسے ٹوکنے اور نہ ہی اسے جھٹلانے کی ہمت رہی تھی۔

زمرد رونا بھول بھال کر فق رنگت لیے نظریں جھکا گئی۔ سب کے سامنے آئینہ دکھائے جانے پر وہ نہ صرف بوکھلا گئی تھی بلکہ اچھی خاصی نادم بھی ہو گئی تھی۔ بڑے سرکار نے ایک تیز نظر ان سب کے شرمندہ چہروں پر ڈالی۔

"اور سب سے بڑی بات ملک طارق۔ کیا تمہاری بیٹی ان پانچ سالوں میں میرے بیٹے کو اولاد دے پائی ہے؟" اپنے سالے کو دیکھتے ہوئے انہوں نے سرد لہجے میں سوال کیا تو ماحول پہ چھائی خاموشی میں یکایک کئی گنا اضافہ ہو گیا۔

بھری محفل میں بے اولادی کا طعنہ زمرد کا دل چھلنی کر گیا۔ وہ اپنی ہر غلطی ماننے کو تیار تھی لیکن اس معاملے میں وہ بالکل بے قصور اور حقیقتاً بے بس تھی۔ اس کی ٹھوڑی سینے سے جا لگی اور آنکھوں سے آنسو قطروں کی صورت بہہ نکلے۔

"یہ بات نہ کہیں پھوپھا جی۔ ضروری نہیں کہ آپ کے بیٹے کے نصیب میں لازماً دوسری بیوی سے اولاد لکھی ہو۔" زمرد کے بڑے بھائی سے برداشت نہ ہو سکا تو وہ بے اختیار انہیں ٹوک گیا۔ اس کا ٹوکنا اسفند کے چہرے پر ناگواری پھیلا گیا۔

"اولاد میرا مقصد ہے بھی نہیں۔ میں نے سلویٰ سے شادی اپنی دل کی خوشی اور اپنی زندگی کی آبادی کے لیے کی ہے۔ اس لیے تم میں سے جس کسی کو میرے اس عمل پہ اعتراض ہے وہ باخوشی مجھ سے ناتا توڑ سکتا ہے۔ رہی زمرد تو اگر اسے بھی یہاں نہیں رہنا تو بے شک نہ رہے۔ میری زندگی میں اس کا ہونا نہ ہونا ویسے بھی برابر ہے۔ سو اگر یہ تم لوگوں کے ساتھ جانا چاہتی ہے تو ضرور جائے۔ میں اس کا نان نفقہ ادا کرتا رہوں گا۔" اس کا لہجہ ہر تاثر سے عاری اور ایک دم دوٹوک تھا۔

زمرد کی سانس سینے میں اٹک گئی۔ اس نے پھٹی پھٹی بے یقین نظروں سے سامنے بیٹھے بہادر کی طرف دیکھا جس کے چہرے اور آنکھوں میں آج اس کے لیے اتنی بے گانگی اور بیزاری تھی کہ وہ اپنی جگہ پر ساکت رہ گئی۔ وہ مانتی تھی کہ ان کے درمیان تعلقات کبھی بھی اچھے نہیں رہے تھے لیکن حالات اس نہج پر جا پہنچے تھے کہ بہادر کو اسے خود سے الگ کرنے اور اپنی زندگی سے نکال پھینکنے کے لیے ایک لمحے کو بھی سوچنے کی ضرورت نہ پڑی تھی، اسے اس کڑوی حقیقت کا اندازہ نہ تھا۔

"زمرد کہیں نہیں جائے گی۔" یک لخت بی بی نرگس کی سرد آواز کمرے کی جامد فضا میں ابھری تو سب کی نگاہیں بے اختیار ان پہ آ ٹھہریں۔

اسفند کے لب سختی سے ایک دوسرے میں پیوست ہو گئے۔ اس نے سپاٹ نظروں سے ماں کی جانب دیکھا۔

"یہ اب آپ کے کرنے کا نہیں، زمرد کے کرنے کا فیصلہ ہے۔"

"زمرد میری نو (بہو) ہے۔ اسے اس حویلی میں، میں ویاہ (بیاہ) کر لائی تھی۔ وہ یہاں رہے گی یا نہیں یہ صرف میرا فیصلہ ہوگا۔" خشمگیں نگاہوں سے اسے گھورتے ہوئے وہ قطعی لہجے میں بولیں تو اسفند کی پیشانی کے بل گہرے ہو گئے۔

"بیاہ کر لانا اور رشتہ نبھانا دو الگ الگ باتیں ہیں بی بی۔ آپ اسے اس حویلی میں لائی ضرور تھیں مگر یہاں زندگی گزارنے کا فیصلہ صرف زمرد کا اپنا ہوگا۔ اسے یہ سمجھنا ہوگا کہ سلویٰ اب کہیں نہیں جانے والی۔ میں نے اس سے نکاح کیا ہے اور وہ میری ذات کا ایک اہم ترین حصہ بن چکی ہے۔ جتنا حق اس کا اس گھر پہ ہے اتنا ہی حق اسے بھی حاصل ہے۔ اگر تو اسے یہ سچائی قبول ہے تو مجھے کوئی اعتراض نہیں۔ لیکن اگر اس نے وہی تماشا کیا جو یہ آج پہلے کر چکی ہے تو مجھ سے برا کوئی نہیں ہوگا۔" اس کا لہجہ بے حد سختی لیے ہوئے تھا۔

بی بی نرگس کی آنکھوں میں واضح طور پہ ناگواری پھیل گئی۔ اس کا یوں بنا کسی ڈر اور جھجک کے سارے خاندان کے سامنے اپنی دوسری بیوی کے حق میں بولنا انہیں بہت کچھ باور کروا گیا تھا۔ لیکن فی الحال سمجھداری کا تقاضا یہ تھا کہ صورت حال کو اپنے قابو میں کیا جاتا اور انہوں نے وہی کرنے کا فیصلہ کیا۔

"ٹھیک ہے۔" وہ سنبھل کر بولیں۔ "لیکن اب تجھ پر بھی اپنی دونوں بیویوں کے درمیان مکمل انصاف سے کام لینے کی ذمہ داری عائد ہوتی ہے۔ دو ویاہ (دو شادیاں) کیے ہیں تو شریعت کے تقاضے بھی نباہنے پڑیں گے۔" وہ بنا کسی پس و پیش کے سب کے سامنے بولیں۔ اسفند لب بھینچے نگاہیں چرا گیا۔

"کوشش کروں گا۔"

"اور طارق......" بیٹے کو نپٹا کے وہ اپنے چھوٹے بھائی کی طرف پلٹیں۔ "اس بدبخت کے بھوسے بھرے دماغ میں یہ بات اچھی طرح بٹھا کر جا کہ اگر اب کی بار یہ انسان کی بچی نہ بنی تو میں نے اس کا وہ حال کرنا ہے کہ اس کی بوتھی (شکل) نہیں پہچانی جانی۔"

زمرد کی طرف اشارہ کرتے انہوں نے دانت پیسے تو ملک طارق کی گردن اپنے آپ اثبات میں ہل گئی۔

داماد سے ہونے والے سامنے کے بعد ان کا سارا غصہ، سارا طنطنہ صابن کے جھاگ کی طرح بیٹھ گیا تھا۔ جب ہی ان کی صورت خاصی مرجھائی ہوئی اور شانے جھکے ہوئے تھے۔ معاملے کو بہتری کی طرف جاتا دیکھ کر بی بی کے بڑے بھائی کے چہرے پر بھی اطمینان اتر آیا۔

"چلو اب جب خیر ہوگئی ہے تو ہمیں بھی چلنا چاہیے۔" وہ صلح جو انداز میں بولے۔

ان کی تقلید میں سب اپنی اپنی جگہ سے اٹھ کھڑے ہوئے۔ لیکن اس سے پہلے کہ ایک دوسرے سے رسمی معافی تلافی کا سلسلہ شروع ہوتا اسفند صوفے سے اٹھا اور لمبے لمبے ڈگ بھرتا کمرے سے باہر نکل گیا۔ جو دلوں میں تھا وہ کھل کر باہر آ چکا تھا۔ سوا سے اب یہاں ہونے والے کسی بھی ڈھونگ میں کوئی دلچسپی نہ تھی۔

اس کے جاتے ہی پیچھے ایک بار پھر گہری خاموشی چھا گئی۔ سب ایک دوسرے سے نظریں چراتے بہادر کی اس حرکت کو نظر انداز کرنے کی کوشش کرنے لگے۔ بی بی نرگس کے لب تختی سے ایک دوسرے میں پیوست ہو گئے۔ حالات بالکل بھی ان کے حق میں نہ تھے۔ لیکن وہ بھی اتنی جلدی ہار ماننے والوں میں سے نہ تھیں۔ ہاں مگر یہ ضرور تھا کہ انہیں جو کچھ بھی کرنا تھا بہت سوچ سمجھ کر کرنا تھا۔

☆☆☆

ایلیا نے چائے تیار کی اور کچن سے نکل کر ایک نظر میمونہ کے کمرے میں جھانکا۔ وہ اپنے بیڈ پر سکون سے سو رہی تھیں۔ اس کے لبوں سے بے اختیار اک اطمینان بھری سانس برآمد ہوئی۔ آج کہیں جا کر ان کی طبیعت میں خاطر خواہ افاقہ ہوا تھا ورنہ جب سے انہیں حیا کے نکاح اور پھر اچانک ہونے والی رخصتی کے بارے میں پتا چلا تھا وہ اچھی خاصی بیمار پڑ گئی تھیں۔

ماں کی طرف سے مطمئن ہو کر اس نے ٹرے اٹھائی اور اوپر ٹیرس کی جانب چل پڑی جہاں کچھ دیر پہلے اس نے بسیط کو جاتے دیکھا تھا۔ بھائی کا خیال آتے ہی اس کے اندر سے اک ہوک سی اٹھی۔ وہ اب تک جیسے صدمے کی حالت میں تھا۔ ایک عجیب سی خاموشی تھی جس نے اسے سرتاپا اپنی لپیٹ میں لے رکھا تھا۔ بظاہر وہ ان سب کے درمیان تھا مگر درحقیقت وہ شاید خود میں بھی کہیں نہ رہا تھا۔ سکوپی کی حرکت نے بسیط کو شدید ذہنی اور جذباتی دھچکا پہنچایا تھا۔ اس کا پورا وجود لفظ غم کی عملی تفسیر بن گیا تھا۔ اس کی آنکھوں کا حزن اور چہرہ پہ بجھا بے جان و بے رنگ زندگی کا احساس ایلیا کو دکھ کے ساتھ ساتھ اب پریشانی میں مبتلا کرنے لگا تھا۔ وہ اپنے بھائی کا درد بانٹنے کے لیے بے چین ہوگئی تھی مگر مجبوری نے اس کے ہاتھ پاؤں باندھ رکھے تھے۔ اسے ڈر تھا کہ کہیں بسیط یہ جان کر کہ حیا نے اس کے راز میں ایلیا کو بھی شریک کر لیا تھا، ان دونوں سے خفا نہ ہو جائے۔

اپنی بے بسی کا احساس نئے سرے سے اسے مضطرب کرنے لگا تو اس نے بامشکل تمام اپنے ذہن کو جھٹکتے ہوئے حاضر کیا اور آخری سیڑھی چڑھ کر اوپر آ گئی۔ سامنے ہی بسیط کرسی کی پشت پر سر ڈالے آنکھیں بند کیے ہوئے بیٹھا تھا۔ موبائل پر دھیمے سروں میں فیض صاحب کی شہرہ آفاق غزل بڑی دل سوز اور دل گداز آواز میں بج رہی تھی۔

دشتِ تنہائی میں اے جانِ جہاں لرزاں ہیں
تیری آواز کے سائے تیرے ہونٹوں کے سراب
دشتِ تنہائی میں دوری کے خس و خاک تلے
کھل رہے ہیں تیرے پہلو کے سمن اور گلاب

ایلیا اپنی جگہ پر ساکت ہوگئی۔ یوں لگا جیسے کسی نے اس کا دل مٹھی میں لے کر نچوڑ دیا ہو۔ ہر لفظ آج اپنے اندر ایک نیا معنی، ایک نیا درد سمیٹے ہوئے تھا۔ بے اختیار اس کی نظریں اپنے بھائی کے چہرے پر جا ٹھہریں جہاں

اتنا کرب، اتنی وحشت تھی کہ ایلیا کو اس کی تمام تر اذیت اپنی روح میں اترتی محسوس ہوئی۔ وہ بے کل سی آگے بڑھی۔ تب ہی کسی کی موجودگی کے احساس نے بسیط کو چونکا دیا۔ اس نے سرعت سے آنکھیں کھولیں اور ایلیا کو اپنے پاس کھڑا دیکھ کر بے اختیار سیدھا ہو بیٹھا۔

"اچھا ہوا جو تم چائے لے آئیں۔ سر میں شدید درد ہو رہا تھا۔" ہاتھ بڑھا کر غزل بند کرتے ہوئے اس نے چپکے سے آنکھوں میں اتری نمی پوروں پر سمیٹی۔ ایلیا کے لیے مزید خود پہ قابو پانا ممکن نہ رہا۔ اس نے ٹرے ٹیبل پر رکھی اور بسیط کے برابر میں بیٹھتے ہوئے محبت سے اس کا ہاتھ تھام لیا۔

"آپ اسے بھول نہیں سکتے؟"

بسیط جو پوری طرح سے بہن کی جانب متوجہ تھا ایک پل کو ساکت ہو گیا۔ مگر صرف ایک پل کو۔ اگلے ہی لمحے وہ اپنی حیرت اور اپنے جذبات دونوں پر مکمل طور پہ حاوی ہو گیا۔

"کسے؟"

اس کا یوں انجان بننا ایلیا کی آنکھوں میں افسردگی اور مایوسی پھیلا گیا۔ اسے کم از کم آج اپنے بھائی سے اس جواب کی امید نہ تھی۔ وہ چند ثانیے رک کر اسے خاموش نظروں سے تکتی رہی اور پھر جیسے ایک نتیجے پر پہنچ کر میدان میں اتر آئی۔

"سلویٰ کو۔"

وہ بنا کسی ہچکچاہٹ کے بولی تو اب کی بار بسیط کے لیے اپنے تاثرات پر پردہ ڈالے رکھنا ممکن نہ رہا۔ وہ پتھرائی نظروں سے اسے دیکھتا لب بھینچ گیا۔ ایلیا کے ہونٹوں پر اک دل شکن سی مسکراہٹ آٹھہری۔

"آپ نے مجھے کوئی بچہ سمجھ رکھا ہے بھائی جو میں سامنے کی چیزوں کو سمجھ نہیں پاؤں گی؟ یا پھر آپ کے نزدیک میری ذات اس قابل نہیں کہ آپ مجھ پر بھروسا کر کے اپنا حالِ دل اور اپنے جذبوں کی سچائی بیان کر سکیں؟" اس کے لہجے میں شکایت کے ساتھ ساتھ ایک عجیب طرح کا دکھ بھی تھا۔ بسیط بے اختیار نگاہیں چرا گیا۔

"ایسی کوئی بات نہیں۔" اس نے اپنا ہاتھ چھڑانا چاہا لیکن ایلیا نے اپنی گرفت کچھ اور مضبوط کر دی۔

"کیوں نہیں؟ اپنی صورت دیکھی ہے آپ نے آئینے میں؟ پچھلے دو دنوں میں کیا سے کیا ہو کر رہ گئے ہیں آپ۔ نہ دن کا پتا ہے نہ رات کی خبر ہے۔ ایسے میں آپ کی یہ حالت حیلز کی جدائی میں تو ہونے سے رہی۔ پھر باقی بچے کون بچا؟ کچھ بتانا پسند کریں گے آپ؟" ناراضی سے اسے دیکھتی وہ خفگی سے بولی تو اک بے بس سی سانس ڈاکٹر بسیط غوری کے لبوں سے ٹوٹ کر فضا میں بکھر گئی۔

"اگر ایسا ہے بھی تو اس بحث کا اب کیا فائدہ؟" اسے دیکھتا وہ شکستہ خوردہ سا بولا تو ایلیا بے تابی سے بولی۔

"یہ بحث فائدے اور نقصان کی تو ہے ہی نہیں۔ یہ تو آپ کے ذہنی سکون اور دل کے اطمینان کا معاملہ ہے۔ سلویٰ نے جو کرنا تھا سو کیا۔ لیکن کیا آپ نے ایک بار بھی یہ سوچا ہے کہ اللہ نے آپ کو کتنی بڑی مشکل اور آزمائش سے بچایا ہے؟ آپ جسے انمول ہیرا سمجھتے رہے بھائی وہ تو ایک معمولی پتھر سے بھی زیادہ کمتر اور حقیر نکلی۔ اس کی سنگ دلی اور خود غرضی نے نا صرف ایک عزت دار گھرانے کی عصمت اور نیک نامی کو داؤ پر لگا دیا بلکہ ایک شریف اور خاندانی لڑکے کی ذات کو بھی پوری دنیا کے سامنے تماشا بنا کر رکھ دیا۔ اس روز اس ذلت، اس جگ ہنسائی کے مرکزی کردار آپ بھی ہو سکتے تھے بھائی، مگر اللہ نے ایسا نہیں کیا۔ اس نے آپ کے دل کو وقتی تکلیف دے کر اسے ساری زندگی کی جلن، تڑپ اور اذیت سے بچا لیا۔ اس نے آپ کی غیرت اور آپ کی ناموس کو سب کے سامنے روندے جانے سے بچا لیا۔ اس لیے اپنے رب کا شکر ادا کریں اور اس بے حس اور بے حیا لڑکی کی محبت کو اپنے اندر سے ہمیشہ کے لیے نکال پھینکیں۔ یقین جانیں وہ ہرگز اس قابل نہیں کہ آپ جیسا سلجھا ہوا مرد

مزید ایک لمحہ بھی اس کے بارے میں سوچ کر اپنا وقت ضائع کرے۔"

اس کی آنکھوں میں دیکھتی وہ آخر میں تلخ ہوگئی تو بغور اس کی بات سنتا بسیط ایک پل کو بالکل خاموش ہوگیا۔ وہ جانتا تھا کہ سلوئی نے جو حرکت کی تھی وہ کسی صورت قابلِ قبول اور قابلِ دفاع نہیں تھی۔ تب ہی تو اسے گہرا صدمہ اور دکھ پہنچا تھا۔ شاید اونچے سنگھاسنوں پر سجائے گئے پتھر کے صنم جب زمین بوس ہوتے ہیں تو اپنے پجاریوں کو یونہی حیران اور ساکت کر جاتے ہیں۔ وہ بھی کچھ اور سوچنے اور سمجھنے کی حالت میں نہیں رہا تھا۔ لیکن اب جورخ ایلیا نے اس کے سامنے رکھا تھا، اسے جان کر بسیط کو احساس ہوا تھا کہ اس سارے قصے میں اگر وہ کسی کو فراموش کر گیا تھا، کسی کے بارے میں سوچنا بھول گیا تھا تو وہ اس کی اپنی ذات تھی۔

اس میں کوئی شک نہ تھا کہ جو کچھ جرار پر بیتی تھی کڑی بیتی تھی۔ ایک مرد ہونے کے ناتے وہ باخوبی جانتا تھا کہ آپ سے منسوب عورت کی کھلی بے وفائی، اس کا سرِعام بغاوت اور نفرت کا اعلان ایک مرد کی غیرت پر کتنا بڑا تازیانہ تھا۔ اس وار کو دنیا کے کسی بھی گوشے میں رہنے والا کوئی بھی انسان نہ تو جائز قرار دے سکتا تھا اور نہ ہی اس سے جڑی اذیت اور حزیمت کو کسی طور کم گردان سکتا تھا۔ یہ برداشت کے کڑے ترین امتحانوں میں سے ایک تھا۔ اور بسیط غوری کو اس پل یہ جاننے میں ذرا بھی عار محسوس نہیں ہورہی تھی کہ اگر سلوئی گردیزی نے یہ سب اس کے ساتھ کیا ہوتا تو شاید وہ اسے بھی مر کر بھی معاف نہ کرپاتا۔ پھر چاہے اس کی محبت سسک سسک کر اس کے اندر ہی کیوں نہ دم توڑ جاتی۔

"تم ٹھیک کہہ رہی ہو۔ اس آدھی ادھوری اور یک طرفہ داستان کا اب ختم ہوجانا ہی بہتر ہے۔" اک ٹھنڈی سانس بھرتا وہ بوجھل لہجے میں بولا تو پاس بیٹھی ایلیا کے لیے اپنی سماعتوں پر یقین کرنا مشکل ہوگیا۔ اس نے حیرت بھری خوش گوار نظروں سے اپنے بھائی کو دیکھا۔

"آپ سوچ بھی نہیں سکتے کہ آپ کی بات سن کر مجھے کتنی خوشی ہوئی ہے۔ دیکھیے گا اللہ تعالیٰ آپ کو اس صبر اور حوصلے کا کیسا اعلیٰ اجر دے گا۔ وہ آپ کو ان شاء اللہ بہتر نہیں بلکہ بہترین سے نوازے گا۔" فرطِ جذبات سے اس کی آنکھیں جھلملا گئی تھیں۔ بسیط کے لبوں پر اک زخم خوردہ مسکراہٹ ابھری۔

"تم کہتی ہو تو مان لیتے ہیں۔" اس کی آواز میں برسوں کی تھکاوٹ اور چہرے پر صدیوں کا سونا پن تھا۔ ایلیا کا دل دکھ سے بھر گیا۔ سچ ہے، ناتمام حسرتوں کے زخم بھلا اتنی جلدی کہاں بھرتے ہیں؟ مگر یہ بھی غنیمت تھا کہ اس نے ان بے نشاں منزلوں سے واپسی کا ارادہ تو باندھا تھا۔ اور ایلیا کے لیے فی الوقت یہی بہت تھا۔

☆☆☆

گردیزی ہاؤس پر بیتے سانحے کو آج تیسرا دن تھا۔ مہمان سارے رخصت ہوچکے تھے۔ منیرہ کی حالت کے پیشِ نظر ان کے گھر والے انہیں کچھ عرصے کے لیے اپنے ساتھ لے جانا چاہتے تھے مگر ان کے انکار کے آگے ان کے میکے والوں کا اصرار بھی بالآخر دم توڑ گیا تھا۔ انہیں اس وقت صرف اپنے شریکِ حیات اور اپنے غم گسار کا محبت بھرا مہربان ساتھ درکار تھا۔ یہ ان دونوں کا سانجھا دکھ تھا سو اس کے کرب کی شدت کا اندازہ بھی صرف وہی لگا سکتے تھے جنہوں نے اپنی اکلوتی اولاد کے ساتھ ساتھ اپنی خوشیاں، اپنی عزت اور اپنا سکون بھی ہمیشہ کے لیے گنوا دیا تھا۔ یوں لگ رہا تھا جیسے وہ دونوں اچانک ہی کسی ویران جزیرے پر آگئے ہوں جہاں ان کے پاس سوائے ایک دوسرے کی ذات اور ساتھ کے باقی کچھ نہ بچا تھا۔ ہر رشتہ اجنبی اور ہر اپنا بیگانہ لگنے لگا تھا۔ شاید جب پیٹھ پہ وار کرنے والی، زمانے کے سامنے شرمندہ اور رسوا کرنے والی اپنی ہی پیدا کردہ اولاد ہو تو ماں باپ یونہی کمزور، تنہا اور اکیلے پڑ جاتے ہیں۔

سجان گردیزی تو چلو مرد تھے۔ ہمت سے کام لینا نہ صرف ان کی مجبوری بلکہ خدا کی طرف سے عطا کردہ فطرت کا بھی ایک لازمی جز تھا۔ مگر منیرہ کے لیے اس صدمے سے ابھرنا ناممکن ہو گیا تھا۔ یوں لگ رہا تھا جیسے ان کی گود ہی اجڑ گئی ہو۔ وہ فقط ان تین دنوں میں برسوں کی بیمار لگنے لگی تھیں۔ اعصاب کے ساتھ ساتھ حواس بھی بکھرے بکھرے سے رہنے لگے تھے۔ سجان صاحب جیسے دہری مشکل میں آ گئے تھے۔ بیٹی کے ساتھ ساتھ بیوی کا غم انہیں اندر ہی اندر مارے دے رہا تھا۔

حیا کی وحشت جب بھی سوا ہونے لگتی وہ منیرہ کے پاس چلی آتی۔ ان دونوں کو دکھ دینے والی ہستی ایک ہی تھی مگر منیرہ کے درد کے آگے اسے اپنی تکلیف سچ میں ہیچ نظر آتی تھی۔ ان کا ایک ایک پل، ایک ایک لمحہ جیسے سولی پر گزر رہا تھا۔ انہیں اس درجہ اذیت میں دیکھ کر حیا کا دل کرتا کہ وہ ان کی زندگی کے ان تلخ ترین ایام کو مٹھی میں قید کر کے اس بے حس اور ظالم لڑکی کے سامنے جا کھڑی ہو جس نے صحیح معنوں میں اپنی خواہش پہ اپنے ماں باپ کے سکھ چین اور ان کی مسکراہٹ کو قربان کر کے انہیں ہمیشہ کے لیے بنجر اور ویران کر دیا تھا۔

ابھی بھی اس کی مسلسل کوشش اور اصرار کے نتیجے میں منیرہ نے آج غسل لیا تھا جس کے بعد وہ کافی حد تک بہتر محسوس کر رہی تھیں۔ ان کی طبیعت کی اس بہتری نے سجان صاحب کے مزاج پر بھی خوش گوار اثر ڈالا تھا۔ وہ حیا کے بے حد مشکور تھے جس کی محبت اور توجہ منیرہ پر اپنا اثر دکھا رہی تھی۔ وہ ہلکے پھلکے سے ہو کر اپنے بھائی کے ساتھ آفس کے لیے روانہ ہو گئے تھے۔ شادی کے بعد آج پہلا موقع تھا جب زندگی اپنی ڈگر کی جانب رواں دواں ہوتی محسوس ہوئی تھی۔

حیا اور جرار تا حال ندی کے دو کناروں کی طرح ایک ہی چھت تلے رہنے پر مجبور تھے۔ فرق صرف اتنا تھا کہ اولین رات کے برعکس جرار اب نہ صرف بڑے مزے سے اپنے کمرے کا مکین بنا ہوا تھا بلکہ رات کو بھی وہ، حیا کی پروا کیے بنا، نہایت آرام سے پورے بیڈ پر قبضہ جمائے ہوئے تھا۔ اس کی موجودگی کے احساس نے حیا کی راتوں کی نیند برباد کر دی تھی۔ وہ جب بھی خود کو مضبوط کرنے کی کوشش کرتی نگاہوں کے سامنے اس اندھیری رات کا وہ منظر روشن ہو جاتا جب اسے بے بس کرنے میں جرار گردیزی کو محض ایک لمحہ لگا تھا۔ اپنی کمزوری اور اس کی طاقت کا احساس نئے سرے سے اس پہ دہشت اور وحشت طاری کرنے لگتا تو وہ پہروں جاگتی رہتی۔ اس پہ مستزاد بے آرام قسم کا صوفہ۔ تھک کر وہ زمین پر بستر بچھانے لگی۔

جرار اسے جب بھی اپنے قدموں میں سوتا دیکھتا اس کے اندر تسکین کی ایک لہر دوڑ جاتی۔ نجانے حیا کو پہنچنے والی ہر تکلیف اس کے لیے اتنے سکون کا باعث کیوں بننے لگی تھی؟ یا پھر یہ موجودہ حالات کی تلخی کا نتیجہ تھا جس نے اس کے اندر اتنی کڑواہٹ بھر دی تھی کہ وہ اپنے اور حیا کے درمیان قائم ہو جانے والے اس رشتے کی خوب صورتی کو سرے سے محسوس کرنے سے ہی قاصر ہو گیا تھا۔ گو کہ وہ کوئی بہت رومانوی مزاج بندہ نہ تھا مگر یہ بھی سچ تھا کہ اس نے اپنی شریکِ حیات کے ساتھ ایسے روکھے پھیکے تعلق کے بارے میں سوچا بھی نہ تھا۔ بظاہر وہ جتنا سرد اور بے نیاز نظر آتا تھا در حقیقت اتنا تھا نہیں۔ بلکہ وہ تو اس رشتے کو لے کے ہمیشہ سے بہت حساس رہا تھا۔ اس نے تہیہ کر رکھا تھا کہ وہ کبھی اپنے باپ جیسا نہیں بنے گا۔ وہ بھی اپنی بیوی کے ساتھ بے وفائی نہیں کرے گا۔ اس کا مان، اس کا بھروسا نہیں توڑے گا۔ مگر قسمت کی ستم ظریفی دیکھیے کہ جو باتیں اس کے لیے بچپن سے تکلیف اور ذہنی اذیت کا باعث رہی تھیں۔ جو اس کی دکھتی رگ تھیں۔ دبانے والی نے ان ہی پہ اپنا ہاتھ رکھا تھا اور اس بے رحمی سے دبایا تھا کہ وہ اندر تک گھائل ہو گیا تھا۔

سلویٰ کی طرف سے ملنے والے اچانک دھوکے اور بے وفائی نے اسے توڑ کر رکھ دیا تھا۔ اس نے جرار گردیزی کی برداشت کو وہاں سے آزمایا تھا جہاں وہ برسوں پہلے اپنی حد کو جا پہنچا تھا۔ نتیجتاً اس کے اندر کا زخمی شیر

عود کر باہر آیا تھا اور چونکہ اسے اپنا مطلوب کہیں نہیں مل سکا تھا اس لیے وہ اپنی راہ میں آنے والی ہر چیز کو نیست و نابود کرنے پہ تل گیا تھا۔ اور شومئی قسمت کہ حیا سکندر اس کی راہ میں آنے والی وہ پہلی رکاوٹ تھی جسے وقت اور حالات نے جرار گردیزی کے اتنے قریب لا کھڑا کیا تھا کہ وہ چاہ کر بھی اسے اپنے اعتاب سے محفوظ نہیں رکھ پایا تھا۔

سلوی کے حصے کا سارا غصہ، ساری نفرت اور ساری بے زاری حیا کی جانب منتقل ہونے میں لمحہ بھی نہیں لگا تھا۔ مزید اس آگ پر تیل کا کام اس خار نے کیا تھا جو بچپن سے اسے حیا کی ذات سے تھی۔ نتیجتاً وہ اس رشتے کی تمام تر کوملتا اور مٹھاس کو بھول گیا تھا جو اس کے لیے بے حد سکون اور آسودگی کا باعث بن سکتا تھا اگر جو وہ ذرا اپنے ظرف اور دل کو وسیع کرتا۔

"لیجیے اب دیکھیے۔ کتنی اچھی لگ رہی ہیں آپ۔" منیرہ کے بال برش کر کے حیا نے ان کی پسند کی ہلکی پنک لپ اسٹک ان کے لبوں پر لگائی اور اپنی کاوش کو سراہتی نظروں سے دیکھتے ہوئے آئینے کے سامنے سے ہٹ گئی۔

منیرہ کی نگاہیں اپنے عکس پر آٹھہریں۔ زندگی کے احساس سے خالی آنکھیں اور اولاد کے غم میں ڈوبی اک شکستہ حال ماں کا چہرہ ان کے سامنے تھا۔ ان کے اندر سے اک ہوک سی اٹھی جو ان کی روح سے ہوتی ان کے پورے وجود میں پھیل کر اک حشر برپا کرنے لگی۔ لیکن اس سے پہلے کہ وہ اس قیامت خیز درد کی لہروں میں ڈوبتیں اک نرم ہاتھ ان کے شانے پر آٹھہرا۔

"کیا سوچ رہی ہیں آپ؟" حیا مسکراتے ہوئے ایک بار پھر ان کے سامنے جا بیٹھی تو منیرہ کی نگاہیں اس کے معصوم و پرخلوص چہرے پر آٹھہریں۔

"یہی کہ اگر میں سلوی کی بات مان لیتی تو شاید آج میری بچی میرے پاس ہوتی۔" وہ کھوئی کھوئی سی بولیں۔ ان کی بات نے حیا کو بے اختیار چونکا ڈالا۔

"کون سی بات؟"

"وہ۔۔۔" منیرہ نے اپنا لب دبایا۔ یوں جیسے تذبذب کی کیفیت میں ہوں۔ "وہ جرار کے بجائے کسی اور سے شادی کرنا چاہتی تھی۔" وہ دھیرے سے بولیں تو حیا کو ایک جھٹکا سا لگا۔

"کیا؟ مگر آپ نے یہ بات کسی کو بتائی کیوں نہیں؟" اس نے حیرت سے انہیں دیکھا۔

"اس لیے کیونکہ میں نہیں چاہتی تھی کہ ہمارے گھر پر کوئی آنچ آئے۔ تمہارے انکل سے ان کے رشتے چھوٹتے یا ان کی عزت اور میری تربیت پر کوئی حرف آتا یہ مجھے منظور نہ تھا۔" وہ بے بس سی بولیں۔ حیا نے بے اختیار اپنا سر تھام لیا۔

"اف آنٹی! یہ آپ نے کیا، کیا؟ کاش آپ نے سلوی پر زور زبردستی نہ کی ہوتی تو آج حالات کچھ اور ہوتے۔"

ان کی طرف دیکھتی وہ دکھ سے بولی۔ اپنی بربادی کا احساس نئے سرے سے اس کے اندر سر پٹخنے لگا تو ملال اس کے چہرے سے ہی نہیں روم روم سے ٹپکنے لگا۔ وہ اپنی دھن میں بھول ہی گئی کہ اس کے الفاظ اور اس کے جذبات منیرہ کے گھائل وجود اور ان کے پچھتاووں میں ڈوبے دل کے لیے کیسا کڑا کچوکا ثابت ہوئے تھے۔ آناً فاناً ان کی آنکھیں آنسوؤں سے بھر گئیں اور چہرہ اضطراب میں ڈوب گیا۔ انہوں نے تڑپ کر اس کا ہاتھ دونوں ہاتھوں میں تھام لیا۔

"تو۔ تو یہ میرا قصور ہے ناں جو آج میری بچی ہمیں چھوڑ کر چلی گئی؟ ہاں، ہاں یہ سب میری غلطی ہے۔

ہائے! ہائے یہ میں نے کیا کر دیا؟ یہ میں نے کیا کر دیا؟" اس کے ہاتھوں پر پیشانی ٹکائے وہ دھاڑیں مار مار کر رو پڑیں تو حیا کے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔

"ایسا کچھ نہیں ہے آنٹی۔ اس میں آپ کی کوئی غلطی، کوئی قصور نہیں۔" انہیں خود سے لگاتے اس نے بیاختیار ان کا سر سہلایا۔ مگر منیرہ کے آنسوؤں میں مزید شدت در آئی۔

"ن۔ نہیں۔ یہ سب میری غلطی ہے۔ کاش میں اس کے ک۔ کہنے پر ایک۔ ایک بار اسفند سے مل لیتی۔ اس۔ اسے پرکھ لیتی تو شاید میری سلوئی کو ی۔ یہ قدم نہ اٹھانا پڑتا۔"

وہ سسکتے ہوئے بولیں تو حیا جس کا پورا دھیان ان کی جانب تھا "اسفند" کے نام پہ اپنی جگہ پر سن ہو گئی۔ اس نے بامشکل تمام منیرہ کو خود سے الگ کرتے ہوئے انہیں پانی پلایا اور دھیرے دھیرے ان کی تسلی کرواتے ہوئے ان کا حوصلہ بڑھانے لگی یہاں تک کہ ان کے آنسو تھمنے لگے۔ وہ نڈھال سی بیڈ پر لیٹ کر پلکیں موند گئیں۔

حیا کی بے چینی اپنے عروج کو جا پہنچی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیسے اور کن الفاظ میں مزید ان سے اس موضوع پر کوئی سوال کرے۔ تھک کر وہ ان پر کمبل برابر کرتی کمرے سے باہر نکل آئی۔ سلوی، اسفندیار کے ساتھ بھاگ گئی تھی؟ اس انکشاف نے اسے گویا ہلا کر رکھ دیا تھا۔ وہ دھچکے کی سی کیفیت میں کم سیڑھیاں چڑھ کر اوپر چلی آئی۔ اپنے دھیان میں راہداری کا موڑ مڑا ہی تھا کہ سامنے موجود دیوار سے بری طرح ٹکرا گئی۔ اور اس سے پہلے کہ لڑکھڑا کر زمین بوس ہوتی دیوار نے اسے بازو سے تھام لیا۔

"آنکھیں کہاں ہیں تمہاری؟ نظر نہیں آتا کیا؟" درشتی سے اسے ڈپٹا گیا تو حیا نے بامشکل تمام اپنا چکراتا سر اٹھایا اور جرار گردیزی کو اپنے مقابل کھڑا دیکھ کر اس کی صبیح پیشانی شکن آلود ہو گئی۔

"ایتنیں کھاتے ہیں کیا آپ؟ دماغ گھما کر رکھ دیا ہے میرا۔" گھور کر اسے دیکھتی وہ غصے سے بولی تو ناچاہتے ہوئے بھی ہلکی سی اک مسکراہٹ جرار کے لبوں پہ اپنی جھلک دکھلا کر غائب ہو گئی۔ اس نے بے اختیار اک گہری نظر سامنے کھڑی حیا پر ڈالی جو گلابی رنگ کے سوٹ میں ملبوس غصے کے مارے خود بھی گلابی سی ہو رہی تھی۔ وہ قصداً پھیل کر کھڑا ہو گیا۔

"شکر کرو کہ ابھی صرف دماغ گھوما ہے۔ دوبارہ بھی میری توجہ حاصل کرنے کے ایسے سستے نسخے آزمائے ناں تو پورا گھما کر رکھ دوں گا۔" اس کا بازو جھٹکتے ہوئے وہ استہزائیہ انداز میں بولا تو حیا کی جان جل گئی۔

"ایکسکیوزمی مسٹر! آپ خود کو سمجھتے کیا ہیں؟" اس نے تنک کر کمر پہ ہاتھ رکھا۔ "میں آپ پر بھی اپنا کوئی مہنگا نسخہ ضائع نہ کروں کجا کہ سستا نسخہ؟"

اس کی بات پر جرار نے طنزیہ انداز میں بھنویں اچکائیں۔

"یعنی نسخے ہیں تمہارے پاس۔" اسے جانچتی نظروں سے دیکھتا وہ یوں بولا جیسے کسی چور کو پکڑ لیا ہو۔ حیا تپ اٹھی۔

"ایک نہیں ایک سو ایک نسخے ہیں۔ مگر کیا ہے ناں وہ سب انسانوں کے لیے ہیں۔ جنات کو قابو کرنے میں مجھے کوئی انٹرسٹ نہیں۔" اسے سرتاپا دیکھتے ہوئے اس نے استہزائیہ انداز میں سر جھٹکا تو جرار کے لیے اپنی امڈتی مسکراہٹ کو چھپانا ناممکن ہو گیا۔ وہ بے اختیار ہنس پڑا۔

اس کی ہنسی حیا کو ایک پل کے لیے مبہوت کر گئی۔ یہ منظر شاذ و نادر ہی کبھی اس کی نظر سے گزرا تھا۔ اور اپنے ارد گرد تو یہ معجزہ وہ پہلی بار وقوع پذیر ہوتے دیکھ رہی تھی۔ جرار نے اسے محظوظ نظروں سے دیکھا۔

"یعنی میں جن ہوں۔ تو پھر تم کیا ہوئیں؟" اس کا لہجہ خاصی دلچسپی لیے ہوئے تھا۔ حیا کے اندر چھن سے کچھ ٹوٹ گیا۔

"اس کی قید میں آئی شہزادی۔" وہ ملول اور دل گرفتہ سی بولی تو جرار کی مسکراہٹ سمٹ گئی۔ وہ چند لمحے اس کی آنکھوں اور چہرے پر اتر آنے والی اداسی کو دیکھتا رہا اور پھر بے رحمی سے مسکرا دیا۔

"اور افسوس کہ اس شہزادی کی قسمت میں کوئی شہزادہ نہیں۔ اسے تا عمر اسی جن کی قید میں رہنا پڑے گا۔" اس کی جانب جھکتے ہوئے اس نے دھیرے سے اپنی شہادت کی انگلی اس کے چہرے پر پھیری تو حیا نے مارے کرب کے اپنی آنکھیں سختی سے میچ لیں۔

جرار اپنی جگہ پر ساکت ہو گیا۔ جھکتے چہرے پر سایہ فگن گھنیری پلکیں دھیرے دھیرے لرز رہی تھیں۔ جبکہ نرم گلابی لب دانتوں تلے دبے اس کے ضبط کی گواہی دے رہے تھے۔ بے اختیار اس کے سینے میں ہلچل سی ہوئی۔

حیا نے دھیرے سے آنکھیں کھولیں۔ ساحر کے سیاہ فسوں سی کالی آنکھیں روبرو تھیں۔ وہ گھبرا کر پیچھے ہٹی۔ یوں ڈری سہمی سی وہ جرار کو حقیقتاً کوئی کھوئی ہوئی شہزادی لگی جو اپنی راہ بھٹک کر اس کی قید میں آ گئی تھی۔ دونوں اک دوجے کو دیکھے چلے گئے۔ کچھ تھا ان لمحوں میں جو لفظوں کی گرفت سے باہر مگر احساسات کی پکڑ میں تھا۔ جرار نے بے اختیاری کی سی کیفیت میں اس کی جانب قدم بڑھایا۔ حیا الٹے پیروں پیچھے ہٹی۔ اس کی سنہری آنکھوں میں تیزی سے آنسو جمع ہونے لگے۔ اگلے ہی لمحے وہ پلٹی اور بھاگتی ہوئی سیڑھیاں پار کر گئی۔

جرار لب بھینچے اپنی جگہ پر ساکت کھڑا رہ گیا۔ یہ ابھی ابھی کیا ہوا تھا؟ حیرت سے سوچتے اس نے خود سے سوال کیا۔ لیکن جب کوئی جواب نہ ملا تو وہ بگڑے موڈ کے ساتھ آفس کے لیے نکل کھڑا ہوا۔

☆☆☆

سلوئی کو اس کمرے کی تنہائی میں آج پورا ایک دن ہو گیا تھا۔ کل کی بحث کے بعد اسفند پھر دوبارہ کمرے میں نہیں آیا تھا۔ جس پر سلوئی نے سکھ کا سانس لیا تھا۔ اس کی ذہنی اور جذباتی حالت فی الحال ایسی نہ تھی کہ وہ مزید کوئی دباؤ برداشت کر سکتی۔ اسفند کے جھوٹ اور خود غرضی نے اسے توڑ کر رکھ دیا تھا۔ وہ وہاں منہ کے بل گری تھی جہاں اسے اپنے محفوظ ہونے کا سب سے زیادہ یقین تھا۔ یوں لگ رہا تھا جیسے اس کی کرنی اس کے آگے آ گئی ہو۔

اس نے اپنے ماں باپ کو دھوکا دیا تھا، ان کا مان اور اعتبار توڑا تھا نتیجتاً اللہ نے اسی شخص کے ہاتھوں اس کے اعتبار کو چور چور کر دیا تھا جس کے سہارے وہ اپنی محبت اور خوابوں کے جہان کو تسخیر کرنے نکل کھڑی ہوئی تھی۔ جس کے ایک اشارے پر اس نے نہ صرف اپنی بلکہ اپنے پورے خاندان کی عزت کو داؤ پر لگا دیا تھا۔ اور جس کے ہاتھوں چوٹ کھا کر اسے اب صحیح معنوں میں اپنے والدین کے درد اور انہیں پہنچنے والے صدمے کا اندازہ ہو رہا تھا۔ اس کرب اور اس ذہنی دھچکے کی شدت کا احساس ہو رہا تھا جو وہ انہیں پہنچا کر آئی تھی۔ اور اس احساس کے بعد وہ خود سے نظریں ملانے کے لائق نہ رہی تھی۔ ملال اور پچھتاوں کا ایک انبار تھا جس تلے دب کر اس کے لیے سانس لینا بھی دوبھر ہو گیا تھا۔ دور تک نہ کوئی اپنا تھا اور نہ ہی نہ ہی کوئی غم گسار تھا جس کے کندھے پر سر رکھ کر وہ اپنا غم ہلکا کر سکتی، جس سے وہ مدد مانگ سکتی، اپنی گم شدہ منزل کا پتا مانگ سکتی۔

ایسے میں جب ملازمہ اس کے لیے حویلی کی مالکن کا پیغام لے کر آئی تو نا چاہتے ہوئے بھی اس کا تھکا ہارا ذہن چوکس ہو گیا اور دل کی دھڑکنیں تیز ہو گئیں۔ یہ وہ موقع تھا جس کا تنہا سامنا کرنے کے حق میں وہ کسی صورت نہ تھی۔ اسے اس پل اسفند کے ساتھ کی اشد ضرورت محسوس ہو رہی تھی مگر چونکہ اب اپنی ذات کے لیے کھڑا ہونے کے سوا اس کے پاس دوسرا کوئی چارہ نہ بچا تھا سو وہ دل کڑا کر کے ملازمہ کے ساتھ چلی آئی۔

بی بی نرگس اپنے کمرے میں بچھے تخت پر گاؤ تکیے کے سہارے کہنی کے بل بیٹھی ہوئی تھیں۔ ان کی سونے اور

ہیرے کی انگوٹھیوں سے سجی انگلیوں کے درمیان چاندی کے حقے کی نال دبی ہوئی تھی جسے وہ دھیرے دھیرے گڑگڑا رہی تھیں۔ ان کی نظریں تولتے ہوئے انداز میں اپنے سامنے کھڑی سلوئی کا جائزہ لے رہی تھیں جو انہیں اپنے مقابل پا کر چونک گئی تھی۔ کل زمرد کے ساتھ اندر آنے والی ادھیڑ عمر عورت اس کی ساس اور اسفند کی والدہ تھیں اسے اندازہ نہ تھا۔ اسے ان کی نفرت اور غصے میں ڈوبی نگاہیں اور تند و تیز انداز یاد آیا تو بے اختیار اک خوف کی لہر اس کے جسم میں دوڑ گئی۔ اس نے بے اختیار اپنے خشک پڑتے لبوں پر زبان پھیری۔

"اچھی ہے۔ مگر اتنی بھی کوئی خاص نہیں کہ بہادر ہوش ہی گنوا بیٹھا۔" وہ خود کلامی کے سے انداز میں بولیں تو سلوئی کا مارے حیرت کے منہ کھل گیا۔ وہ اس کے بارے میں ایسے بات کیسے کر سکتی تھیں جیسے وہ وہاں موجود ہی نہ ہو؟ یا پھر وہ کوئی بھیڑ بکری ہو جسے وہ سر تا پیر جانچ رہی ہوں۔

"نام کیا ہے تیرا؟" اگلا سوال داغا گیا تو سلوئی جو ابھی پہلے ہی دھچکے سے سنبھل نہیں پائی تھی اس اندازِ تکلم پہ گھول کر رہ گئی۔

"سلوئی۔"

"یہ کیا بے سرا سا نام ہے؟" انہوں نے منہ بنایا۔ "خیر بیٹھ۔" انہوں نے اپنی دائیں طرف رکھے صوفے کی جانب اشارہ کیا۔ سلوئی صبر کے گھونٹ پیتی خاموشی سے وہاں جا کی۔

"سنا ہے کل تجھے غش آ گیا تھا؟" انہوں نے کش لیتے ہوئے سوال کیا۔

"جی۔"

"کیوں؟"

اور سلوئی کی سمجھ میں نہیں آیا کہ انہیں کیا جواب دے۔

"میں نے پوچھا کیوں؟" اب کی بار انہوں نے قدرے تخی سے دہرا تو سلوئی کے لبوں سے اک بوجھل سانس ٹوٹ کر فضا میں بکھر گئی۔

"میں نہیں جانتی تھی کہ یہ پہلے سے شادی شدہ ہیں۔" وہ نظریں جھکائے دھیرے سے بولی۔ بی بی نرگس کے لبوں پہ اک استہزائیہ مسکراہٹ آ ٹھہری۔ اگلے ہی لمحے وہ قہقہہ لگا کر ہنس دیں۔ سلوئی نے ایک جھٹکے سے سر اٹھایا اور انہیں تعجب سے دیکھنے لگی۔

"چلو آج ایک بات طے ہوئی۔" بی بی ہنستے ہوئے بولیں۔ "عورت چاہے شہر کی ہو یا گاؤں کی۔ مرد کے ہاتھوں بے وقوف بننا اس کی فطرت میں شامل ہے۔" انہوں نے تمسخرانہ نظروں سے اسے دیکھا۔

سلوئی کا دل کیا کہ زمین پھٹے اور وہ اس میں سما جائے۔ ٹھیک ہی تو کہہ رہی تھیں وہ۔ اسفند پہ اندھا بھروسا کرنے والی اور خود کو اس مقام تک گرانے والی وہ خود ہی تو تھی۔ اس کے بعد بھلا اس کے آئی کیو لیول اور ایک ان پڑھ دیہاتی عورت کی سمجھ بوجھ میں کیا فرق رہ جاتا تھا؟

"ویسے ایک بات ہے۔ تیرے ماں پیو نے کلم کلے منڈے (تن تنہا لڑکے) کو کڑی (لڑکی) کیسے دے دی؟" انہوں نے ایک اور انتہائی منطقی سوال کیا۔ سلوئی کے اندر سے ہوک سی اٹھی۔ اب وہ انہیں اپنی کون کون سی نادانیاں بیان کرتی؟

اس کی خاموشی نے بی بی کو چونکا دیا۔ انہوں نے اسے گہری نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے اپنا حقہ گڑگڑایا۔

"چل چھڈ (چلو چھوڑو)۔ یہ بتا کہ اگر تم لوگوں کو بہادر کی پہلی شادی کے بارے میں علم ہوتا تو کیا تیرے گھر والے پھر بھی تیرا نکاح اس سے پڑھوا دیتے؟" وہ اپنے اصل مقصد کی طرف آئیں۔

"نہیں۔" اس کا جواب ان کے حسب منشا تھا۔ وہ اندر تک مطمئن ہو گئیں۔

"تو پھر اب ساری حقیقت جان کر ان کا کیا فیصلہ ہو گا؟" اور سلوئی کا دل کیا کہ وہ دھاڑیں مار مار کر رو پڑے۔

"کچھ نہیں۔" وہ حلق میں اٹکا آنسوؤں کا گولا بامشکل تمام نیچے اتارتے ہوئے نگاہیں جھکا گئی۔ بی بی نرگس کی آنکھوں میں الجھن اتر آئی۔

"کیا مطلب؟"

"وہ مجھے رخصت کر چکے ہیں۔ اب آگے میں جانوں اور میرا نصیب۔" وہ شکستہ سی بولی تو بی بی کی پیشانی پر بل آٹھہرے۔ انہیں اس شہری لڑکی سے اتنے دیہاتی جواب کی امید نہ تھی۔

"سوچ لے۔ یہاں تیری زندگی اتنی آسان نہیں ہونے والی۔" انہوں نے اگلا حربہ آزمایا۔ سلوئی نے اک گہری سانس لی۔

"سوچ لیا۔ میرے پاس واپسی کا کوئی راستہ نہیں۔" اس تلخ حقیقت کو لبوں سے بیان کرتے اس کا دل خون کے آنسو رو دیا تھا۔ اس کی آواز میں لرزش محسوس کر کے بی بی نے قدرے جھک کر حقے کی نال سے اس کی ٹھوڑی اونچی کی۔ اس کی آنسوؤں سے لبریز آنکھیں دیکھ کر ان کے لب سختی سے ایک دوسرے میں پیوست ہو گئے۔

"دیکھ کڑیے، ہر کے سائیں کو دوسری عورت کے ساتھ بانٹنا آسان نہیں ہوتا۔ زمرد میری بھتیجی، میرا خون ہے۔ مجھ سمیت یہاں تیرا کوئی بھی حامی نہیں ہونے والا۔" وہ واضح اور دوٹوک الفاظ میں بولیں۔ سلوئی کے دل میں اک ٹیس سی اٹھی۔

"کوئی بات نہیں۔ اللہ تو ہے ناں۔" وہ زخم خوردہ سا مسکرائی۔

تعجب کی بات تھی کہ اپنے ماں باپ کو بے یارومددگار چھوڑ کر آنے والی کو اب اللہ سے اپنے لیے مدد درکار تھی۔

بی بی نرگس کی آنکھوں میں پھیلی سرد مہری میں اضافہ ہو گیا۔

"چل پھر اب اپنے دن اور رات زمرد سے بانٹنے کے لیے تیار ہو جا۔ ساتھ ہی اس نئی زندگی میں بھی کھپنے کی تیاری کر لے۔ کسی سے اب کوئی گلہ نہ کرنا۔ کیونکہ میں نے تجھے جتنا سمجھانا تھا سمجھا چکی۔" سیدھے ہوتے ہوئے وہ بے مہر سے لہجے میں بولیں۔ سلوئی کی آنکھوں سے آنسو بہہ کر اس کے چہرے پر پھسل آئے۔ وہ دھیرے سے اپنی جگہ سے اٹھ کھڑی ہوئی۔

اس زندگی کا انتخاب اس نے خود کیا تھا۔ سو اب راہ کے ہر خار کو بھی اسے خود ہی چننا تھا۔ ہاں دکھ اس بات کا تھا کہ اس کی محبت کے خوش نما سپنے کا انجام بہت ہی جلد اور بڑے ہی بھیانک موڑ پہ آ کے ہوا تھا۔ شاید اسے ہی مکافاتِ عمل کہتے ہیں اور شاید یہی اس کی سزا تھی۔

☆☆☆

ڈھلتی شام کا عکس اترتے سورج کی کرنوں میں بکھر کر چار سو نرم سی دھوپ بکھیر رہا تھا جب گردیزی ہاؤس کے گیٹ سے جرار کی گاڑی اندر داخل ہوئی تھی۔ وہ اور ہادی لنچ کے بعد اکٹھے سائٹ وزٹ کے لیے نکلے تھے جہاں سے کچھ دیر پہلے فراغت کے بعد وہ دوبارہ آفس جانے کے بجائے سیدھا گھر آ گئے تھے۔

پورچ میں گاڑی کے رکتے ہی دونوں اپنی اپنی طرف کے دروازے کھول کر باہر نکلے تو لان سے آتی نقرئی ہنسی کی آواز پہ انہوں نے ایک ساتھ اس سمت دیکھا جہاں ایلیا اور حیا چائے کی میز سجائے ایک

دوسرے کے برابر بیٹھے ہوئے باتوں میں مشغول تھیں۔ اتنے دنوں بعد گھر کی اداس فضا میں ہنسی کی آواز کانوں کو بے حد بھلی معلوم ہوئی تھی۔ ہادی کے چہرے پر خوشگوار سے تاثرات در آئے۔ وہ دروازہ بند کرتا پلٹا اور تیز قدموں سے ان کی جانب چل پڑا۔

اسے لان کی جانب جاتا دیکھ کر جرار کے ابرو تن گئے۔ اس کے طیبہ کی فیملی سے کبھی بھی اچھے تعلقات نہ رہے تھے۔ سو ابھی بھی حیا کو ایلیا کے ساتھ بیٹھا دیکھ کر اس کا موڈ آف ہو گیا تھا۔ اس کے برعکس ہادی کی خوش مزاجی اپنے عروج پر تھی۔ اس نے جاتے ہی ایلیا سے بڑے بھرپور انداز میں سلام دعا کی تھی اور اگلے ہی لمحے کرسی کھینچ کر بڑے مزے سے ان کی محفل کا حصہ بن گیا تھا۔

اپنے بھائی کو بنا کسی وقت کے یوں ماحول میں مدغم ہوتا دیکھ کر جرار کی جان جل گئی۔ اسے کبھی کبھی اپنے اور ہادی کے مزاج کا فرق حیران کر دیتا تھا۔ وہ جتنا لیا دیا رہنے والا، سنجیدہ مزاج اور کافی حد تک مغرور بندہ تھا ہادی اتنا ہی ہنس مکھ، ملنے ملانے والا اور سادہ مزاج انسان تھا۔ اس کی طبیعت میں پائی جانے والی یہ آسانی جہاں اسے ہر دل عزیز بناتی تھی وہیں اسے انتہائی سہولت کے ساتھ لوگوں کے ساتھ گھلتا ملتا دیکھ کر جرار اکثر رشک میں بھی مبتلا ہو جاتا تھا۔ وہ مانتا تھا کہ لوگوں کو اپنا گرویدہ بنا لینا ہر کسی کے بس کی بات نہ تھی۔ اور اس میں تو یہ خوبی سرے سے ناپید تھی۔

ابھی بھی ہادی کے بلند و بانگ قہقہے کی آواز نے جلتی پر تیل کا کام کیا تھا۔ اس نے ایک تیز نظر سامنے ہوتی ٹی پارٹی پر ڈالی جس میں موجود تینوں لوگ خوشگوار تاثرات لیے کسی بات پر ہنس رہے تھے۔ نا چاہتے ہوئے بھی اس کی نظر حیا کے چہرے پر ٹھہر سی گئی۔ جو ڈھلتی دھوپ کی کومل کرنوں تلے مسکراتا ہوا اس حیا سے بالکل مختلف اور انجان لگ رہا تھا جو صبح اس کے روبرو کھڑی تھی۔ جرار کے اندر کچھ سلگنے لگا۔ وہ لب بھینچے اسے تکتا رہا۔ اور پھر پلٹ کر تیز قدموں سے اندر کی جانب بڑھ گیا۔

اپنے کمرے میں آ کر اس نے اپنا کوٹ اتار کر بیڈ پر پھینکا اور گلے میں بندھی ٹائی کھینچ کر اتارنے لگا۔ نجانے کیوں حیا کو سب کے ساتھ ہنستا مسکراتا دیکھ کر اس کے اندر ابال سے اٹھنے لگے تھے۔ حالانکہ وہ ہنستی یا روتی، جیتی یا مرتی اسے پہلے کی طرح اس سے کوئی سروکار نہیں ہونا چاہیے تھا۔ مگر تعجب کی بات تھی کہ اسے نا صرف اس سے سروکار محسوس ہو رہا تھا بلکہ اس کا یوں بے فکری سے ہنستا بھی بری طرح چبھ رہا تھا۔

اپنے پیچھے دروازہ کھلنے کی آواز پر اس کے ہاتھ لحظہ بھر کو رکے تھے۔ وہ پلٹا تھا اور حیا کو اندر داخل ہوتا دیکھ کر اس کی تیوریاں مزید چڑھ گئی تھیں۔ اس نے ہاتھ میں تھامی ٹائی بیڈ پر پھینکی اور خود صوفے پر بیٹھ کر جوتے اتارنے لگا۔

"چائے لے کر آؤ۔" اس کی تحکمانہ آواز کمرے کی خاموش فضا میں ابھری تو بیڈ سائیڈ ٹیبل کی دراز کھولے کھڑی حیا نے بے اختیار پلٹ کر اس کی جانب دیکھا۔ وہ سرد و سپاٹ چہرہ لیے اپنے موزے اتارنے میں مصروف تھا۔ حیا کی پیشانی پر بل پڑ گئے۔

"نجمہ سے کہیں۔ میں فارغ نہیں ہوں۔" اس نے ملازمہ کا نام لیا۔

جرار نے ایک جھٹکے سے سر اٹھایا۔ اس کی آنکھوں میں انگاروں کی سی تپش تھی۔

"نجمہ میری بیوی نہیں، تم ہو۔"

"اوہ......" حیا نے استہزائیہ انداز میں بھنویں اچکاتے ہوئے سینے پر بازو لپیٹے۔ "تو آپ کو آج یاد آیا ہے کہ میں آپ کی بیوی ہوں۔ دو دن پہلے تک تو آپ نے مجھے بڑے زعم سے جتایا تھا کہ میں آپ کی بیوی کہلانا تو دور آپ کے برابر کھڑی ہونے کے بھی لائق نہیں۔" وہ طنزیہ لہجے میں بولی۔ جرار چند لمحے اسے

دیکھتا رہا اور پھر اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا۔

"تو میں کب تمہیں اپنے برابر کھڑا کر رہا ہوں حیا سکندر؟" وہ دھیرے دھیرے چلتا اس کے مقابل آ کھڑا ہوا۔ "تم جیسی بیویاں برابر کھڑا کرنے کے لیے ہوتیں بھی نہیں۔ ہاں لیکن اگر بات ضرورت پوری کرنے کی ہو تو......؟" معنی خیز انداز میں کہتا وہ خباثت سے مسکرایا تو حیا کا چہرہ کانوں کی لوؤں تک دہک اٹھا۔ اس کا ہاتھ بے اختیاری کے عالم میں اٹھا۔ لیکن اس سے پہلے کہ جرار کے چہرے کو چھو پاتا اس نے بنا کسی دقت کے اسے اپنی گرفت میں جکڑ لیا۔

"اتنا غصہ؟" اس کی چنگاریاں اڑاتی آنکھوں میں جھانکتا وہ اس کی جانب جھکا۔

حیا نے مارے نفرت کے رخ موڑتے ہوئے اپنا ہاتھ چھڑانے کی بھرپور کوشش کی۔ اس کی جھنجلاہٹ اور بے بسی جرار کو مزا دے گئی۔ چند لمحے پیشتر کی ساری کلفت اور جلن اپنے آپ دور ہو گئی۔

"میں تو چائے کی بات کر رہا تھا۔ تم کیا سمجھیں؟" اس کے لہجے میں دنیا بھر کی معصومیت تھی۔ حیا سر تا پا سلگ اٹھی۔ اس نے شعلے برساتی نظروں سے اسے دیکھا۔

"میں نے آپ جیسا گرا ہوا انسان اپنی زندگی میں نہیں دیکھا۔" اس کا ایک ایک لفظ نفرت میں ڈوبا ہوا تھا۔ جرار زہریلے انداز میں مسکرا دیا۔

"اور دیکھو گی بھی نہیں۔"

اس نے ایک جھٹکے سے اسے مزید اپنے قریب کیا تو حیا کی جان نکل گئی۔ خوف اور وحشت نے آن واحد میں اس کی سنہری آنکھوں میں ڈیرا جمایا تو جرار بے اختیار چونک گیا۔ وہ تو سمجھ رہا تھا کہ اس سے دوری میں حیا کی سزا تھی۔ مگر یہاں تو معاملہ اس کے برعکس تھا۔

"اب جاؤ اور میرے لیے چائے لے کر آؤ۔ اور دوبارہ کبھی اپنی اوقات مت بھولنا سمجھیں!" بے رحمی سے اسے دھکیلتا وہ سختی سے بولا۔

حیا گرتے گرتے بچی۔ مگر گھبراہٹ اتنی شدید تھی کہ وہ لمحے کا توقف کیے بنا سنبھلی اور اگلے ہی پل کمرے کی دہلیز پار کر گئی۔

جرار کے لبوں پر اک جاندار مسکراہٹ آ ٹھہری۔ اس کی قربت میں حیا سکندر کے لیے اس کی زندگی کی سب سے بڑی اور کڑی آزمائش تھی۔ اور یہ بات تو طے تھی کہ اگر وہ ناخوش تھا تو حیا کو بھی کسی طور خوش رہنے کی اجازت نہ تھی۔ پھر چاہے اسے اپنے دل پر کیوں نا جبر کے پہرے بٹھانے پڑ جاتے۔ وہ حیا کے اتنے قریب آ جانا چاہتا تھا کہ اسے خود اپنی ذات اور اپنے وجود سے نفرت ہونے لگتی۔ وہ اس کی برداشت کو آخری حد تک آزمانے پر تل گیا تھا۔

(باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ)

☆☆

حمیرا نوشین

انتقام

گھر کی فضا ایک دم ہی مکدر ہو گئی تھی۔ کھلتے چہرے یک دم اداسی کی لپیٹ میں آ گئے تھے۔ ہر ایک چہرے سے پریشانی ہویدا تھی۔ ڈرائنگ روم سے ممانی نعیمہ کی آوازیں زور و شور سے آ رہی تھیں اور امی منمناتے ہوئے بار بار منہ کھول رہی تھیں مگر ممانی بولنے کا موقع ہی کب دے رہی تھیں۔ سارا نے ڈرائنگ روم میں جھانکا تو اپنے باپ کے چہرے پر ناگواری کی فضا دیکھی تھی۔ سلمٰی بھی اپنے شوہر کے چہرے کے ناگوار تاثرات کی طرف پریشانی سے دیکھتیں تو کبھی بھابھی کو بے بسی سے۔

معین اٹھ کر ڈرائنگ روم سے باہر آ گئے سارا جلدی سے پیچھے ہوئی تھی۔ معین ڈرائنگ روم سے کیا گھر سے بھی نکل گئے تھے۔ باپ کے نکلتے ہی وہ سب پھر ڈرائنگ روم سے چپک گئی تھیں۔

''بھابھی! آپ میری بات تحمل سے سنیں، ابھی ہم نے سارا کی صرف ہاں کی ہے کون سا رسم ادا کر دی ہے جو آپ یوں خفا ہو رہی ہیں۔''

''بس رہنے دو تم۔ بالا ہی بالا سب کچھ طے کر لیتی ہو، بھائی بھابھی کو تو کبھی مشورے کے قابل بھی نہیں جانا۔ ہاں آج کوئی پریشانی تم پر آ جائے تو سب سے پہلے بھائی کا در کھٹکھٹا کر اسے پریشان کرو گی۔ پھر سارے دکھڑے بھائی کو سنانے یاد آ جائیں گے، بس خوشی کے موقع پر یا کوئی اہم فیصلہ کرتے ہوئے بھائی کی یاد کبھی نہ آئی۔''

ممانی شروع ہو چکی تھیں۔ اب ان کو چپ کروانا کسی کے بس کی بات نہیں تھی۔ یہ پہلا موقع نہیں تھا کہ ممانی اس طرح گھر میں پریشانی پھیلانے آئی تھیں۔ خاندان کے ہر گھر میں خوشی کے موقع پر وہ ایسا ہی کیا کرتیں۔ کسی نہ کسی بات پر اعتراض کا نقطہ اٹھا لیتیں۔ سارا کو اچھی طرح یاد تھا کہ مہرین کی مہندی میں ان سب کزنز نے ایک ہی ڈیزائنر کے ایک ہی رنگ کے سوٹ لیے تھے اور جیولری بھی۔ سب بہت پیاری لگ رہی تھیں جبکہ ممانی کی بیٹی عبیرہ نے ایک جیسا ڈریس پہننے سے صاف انکار کر دیا تھا کہ ''مجھے وردی پہننے کا کوئی شوق نہیں، میں منفرد نظر آنا چاہتی ہوں۔''

اس نے سب سے ہٹ کر بلیو کلر پہنا تھا مگر جب ممانی نے ان سب کو ایک جیسے لباس اور جیولری میک اپ میں کھلکھلاتے دیکھا تو گویا ان کے تن بدن میں آگ لگ گئی۔ عبیرہ کا سوٹ اس پر بالکل بھی نہ کھل رہا تھا اور یہی بات ان سے ہضم نہیں ہو رہی تھی۔ چچی گلناز کو انہوں نے آڑے ہاتھوں لیا تھا۔

"آپ نے مجھ سے مشورہ کیوں نہیں کیا جب سب بچیاں ایک جیسا لباس پہن رہی تھیں تو میری بچی کے ساتھ یہ اجنبیوں والا سلوک کیوں کیا گیا؟ ہمیں ہی آخر ہر بار سوتیلا کیوں سمجھا جاتا ہے۔"

اب چچی نے لاکھ صفائیاں دیں، اصل بات بیان کی مگر وہ کہاں سننے والوں میں سے تھیں۔ انہوں نے وہ لتے لیے کہ چچی بے چاری روہانسی ہو گئیں۔ گھر کی دو تین اور خواتین بیچ میں بولنے لگیں تو انہوں نے سختی سے انہیں بھی چپ کروا دیا تھا وہ بے چاریاں بھی دم سادھ گئیں۔

ممانی کی زبان کے آگے گویا خندق تھی کسی بڑے چھوٹے کا لحاظ رکھتی تھیں نہ شرم۔ وہ مہندی کا فنکشن درمیان میں ہی چھوڑ کر اپنی فیملی کو لے اپنے گھر روانہ ہو گئیں۔ اتنا اچھا فنکشن ان کی بدفطرتی کی وجہ سے پھیکا پڑ گیا تھا۔ پھر چند مرد و خواتین نے ان کے گھر جا کر معذرت کی تب کہیں جا کر انہوں نے باقی فنکشنز میں شرکت کی۔

پتا نہیں ان کو ایسا کر کے کون سی تسکین ملتی تھی۔ کسی کو خوشی کو برباد کرنا، اپنے آپ کو سب سے برتر سمجھنا ان کی فطرت کا خاصہ بن چکا تھا۔ خاندان کے سب ہی افراد ان کی اس فطرت سے نالاں تھے اور ان سے بددل ہو چکے تھے۔ دل سے تو شاید کوئی بچہ بھی ان کی عزت نہ کرتا تھا۔ رشتے داری کی وجہ سے ان کو برداشت کرنا پڑ رہا تھا کہ کیا کریں ایسے رشتے چھوڑے بھی نہیں جاتے۔ ایسے میں ماموں بھی ان کے ہم خیال ہو جاتے کہ میری بیوی کی بھی عزت ہے جو میں کسی طور کم نہیں ہونے دوں گا۔"

"ہونہہ عزت۔" سارا استہزائیہ مسکرائی۔

"عزت تو انہوں نے اپنی دو کوڑی کی کر لی ہے سب کے سامنے۔ عزت ہمیشہ انہی کی کی جاتی ہے جو دوسروں کی عزتوں کا خیال رکھتے ہیں۔ بے عزتی کر کے بدلے میں بے عزتی ہی کی امید رکھیں۔"

"تم تو خدا کے واسطے چپ کر جاؤ۔ کیوں ہنگامہ بڑھوانا چاہتی ہو؟" مقدس نے اس کی بڑبڑاہٹ پر اسے ڈانٹا تھا تو سارا اسے گھور کر مصلحتاً خاموش ہو گئی تھی۔

ماموں نے صاف کہہ دیا تھا کہ سارا کی جہاں بات پکی ہو رہی ہے وہ ہرگز اس شادی میں شرکت نہیں کریں گے جب تک کہ ممانی لڑکے والوں کے ہاں جا کر لڑکا اور گھر بار نہ دیکھ آئیں۔ اگر ممانی کو لڑکا اور گھر پسند آ گیا تو تب ہی رشتہ ہو گا ورنہ ہم سے اپنے رشتے کو بس ختم ہی سمجھیں۔

ماموں کی بات سن کر امی الگ پریشان کہ اچھی زبردستی ہے دوسروں پر اپنے فیصلے مسلط کرنا۔ اور معین نے صاف کہہ دیا تھا کہ تمہاری بھابھی کو بہت برداشت کر لیا ہم نے۔ اسے کہو اپنے کام سے کام رکھے۔ ہماری بچیاں ہیں فیصلے بھی ہم خود ہی کریں گے۔"

امی بے چاری عجب مخمصے میں پڑ گئی تھیں، شوہر کی مانیں تو بھائی بھابھی ناراض، بھابھی کا خیال کریں تو شوہر کی ناراضی اور سب سے بڑھ کر اتنا اچھا رشتہ ٹھکرائے جانے کا دکھ۔ کیونکہ انہیں قوی امید تھی کہ ان کی بھابھی کو یہ بھی گوارا نہ ہو گا کہ ان کی نند کی بیٹیاں اچھے گھرانوں میں بیاہی جائیں انہوں نے تو فوراً انکار کر دینا تھا۔

کتنے ہی دن یہ معاملہ اٹکا رہا سب کو ذہنی اذیت کا سامنا کرنا پڑ رہا تھا۔ بچوں کے سمجھانے پر اس بار امی نے حوصلہ کر ہی لیا تھا اور بھابھی کی بے تکی بات کو نظر انداز کر دیا اور سارا کا رشتہ وہیں کیا جہاں ہونا تھا۔ ماموں کا فون آتا رہا کہ تمہاری بھابھی ناراض ہے، تمہارا میکا ختم ہو جائے گا۔ اور بھائی کی بات سن کر امی کی آنکھوں میں آنسو آ گئے تھے کیسے آرام سے بھائی نے کہہ دیا تھا کہ میکا ختم ہو جائے گا۔ میکا بھائیوں سے آباد ہوتا ہے بھائی کو بیوی کی بے کار بات پر ان کو سنانے کے بجائے بہن کا میکا ختم کر

رہے ہیں۔ دل ایک دم ہی دکھ سے بھر گیا تھا کتنے ہی دن آنکھ سے پانی چھلکتا رہا، ماں باپ کی یاد دل کو تڑپاتی اور ان کی جدائی آنکھوں سے سیلاب کی صورت بہنے لگتی۔ بچوں نے تسلی دی، شوہر نے سمجھایا تب کہیں جا کر سنبھلیں مگر ایک چبھن مسلسل دل کو اذیت پہنچاتی رہی۔

سارا کی شادی پر بے شک ماموں نے شرکت کر لی تھی مگر غیروں کی طرح۔ ماموں کی فیملی میں سے شادی میں کوئی بھی شریک نہ ہوا تھا۔ اس بار بچوں، معین اور خاندان کے کچھ بڑوں نے جی کڑا کر ہی لیا تھا کہ اب ہر بار کی طرح تذلیل برداشت نہیں ہوگی جس نے خوشی سے شادی میں شرکت کرنی ہے کرے ورنہ اپنے گھر راضی رہے اور صد شکر کہ ممانی کی غیر موجودگی نے تمام فنکشنز بہت اچھے سے کرا دیے۔ سب کے چہرے کھلے رہے، ہنسی مذاق ہوتا رہا۔ نہ کسی بات پر اعتراض اور نہ کسی کا چہرہ غمگین ہوا نہ کسی معاملے میں بدمزگی پھیلی۔ سارا اپنے گھر میں خوش و خرم رخصت ہو گئی تو امی نے سکھ کا سانس لیا۔

سارا کا سسرال بہت اچھا تھا رشتوں کی قدر کرنے والا اور بہوؤں کو عزت دینے والا۔ سارا سسرالی رشتوں کی اس محبت و عزت پر کھل جاتی اور پہلے سے بڑھ کر وہ اپنے سسرال والوں کی عزت و احترام کرتی۔ وہ یاسر کے ساتھ تقریباً ہر دوسرے دن میکے ملنے چلی آتی اور کھلکھلاتی ہوئی بیٹی کو دیکھ کر ماں کی آنکھوں میں تشکر کے آنسو آ جاتے۔

"اللہ سب بیٹیوں کے نصیب اچھے کرے۔" وہ دل سے دعائیں کرتیں۔

"نصیب تو اچھا ہونا ہی تھا جب ایک اتنی اچھی ماں کی دعائیں ساتھ ہوں گی۔ اور پھر آپ نے ہمیشہ ہر ایک کے لیے سکھ کا سامان کیا ہے تو پھر اللہ کیسے اس بندی کی بیٹی کو دکھ دے سکتا تھا۔" سارا نے لاڈ سے ماں کے گلے میں بانہیں حمائل کیں تو وہ مسکرا دیں۔

"بس یہ سب میرے رب کی دین ہے بندے کا کوئی کمال نہیں۔" انہوں نے پیار سے اس کا گال چھوا۔

"ارے ہاں یاد آیا عبیرہ کی شادی کا کارڈ آیا ہوا ہے اس جمعہ بارات ہے۔ سنا ہے، بہت اچھی جگہ شادی ہو رہی ہے لڑکا بہت امیر اور کسی اچھے عہدے پر فائز ہے۔"

"ہوگا ہمیں کیا۔۔۔؟ انہوں نے کون سا ہماری شادی میں شرکت کی تھی جو ہم چاؤ سے ان کے فنکشن اٹینڈ کریں گے۔ آپ کے بھائی ہیں آپ ہی چلی جائیے گا۔" سارا نے تلخی سے کہا۔

"بری بات بیٹا۔ ان کے گھر کی پہلی خوشی ہے جو کچھ انہوں نے کیا وہ ان کا فعل۔ ہمیں زیب نہیں دیتا کہ ہم یوں قطع تعلقی کر کے بیٹھ جائیں۔ شادی میں بلایا ہے تو ضرور جائیں گے اور ہنسی خوشی شرکت کریں گے بس تم یاسر سے بھی کہنا کہ شادی میں ضرور شرکت کرے۔" سلمٰی نے اسے سمجھایا تو وہ ماں کو دیکھتی رہ گئی، کتنا ظرف تھا ان کا۔

"بس یہی تو آپ کی باتیں ہیں جو اللہ ہمیں نوازتا ہی چلا جا رہا ہے۔" سارا کو ماں پر ڈھیروں پیار آ گیا تھا۔

☆☆☆

عبیرہ کی شادی پر خاندان کے سب ہی افراد نے خوشی سے شرکت کی۔ ان کے خاندان کی ہر خوشی کو کرکرا کر دینے والی ممانی بڑی خوش نظر آ رہی تھیں۔ شادی کا بہت اعلیٰ انتظام کیا گیا تھا۔ سب شادی میں بڑھ چڑھ کر حصہ لے رہے تھے۔ ممانی کا برا رویہ سب نے بھلا کر بس خوشی خوشی شرکت کرنے کا سوچا تھا اور یہی ان سب کا بڑا پن تھا۔

معین بھی سالے کے پچھلے رویے کو بھلا کر شادی میں بھرپور طریقے سے شرکت کر رہے تھے۔ وہ بہنوئی تھے چاہتے تو اکڑ دکھا سکتے تھے مگر ان کے نزدیک ایسا کرنا انتہائی گھٹیا پن تھا۔ وہ سالے کی بیٹی کو اپنی بیٹی سمجھ کر رخصت کرنے آ گئے تھے۔ باراتیوں کا استقبال کرنے کے لیے وہ سب

سے آگے کھڑے تھے۔ سب ہی بارات کا بے صبری سے انتظار کر رہے تھے۔ سب ہی کزنز ہاتھوں میں پھولوں کی پتیوں کی پلیٹیں پکڑے قطار بنائے زرق برق لباس پہنے مسکراتے کھلکھلاتے چہرے لیے کھڑی تھیں۔

سارا عجیرہ کو پارلر سے لے کر آئی تھی اور مسلسل اس کے پاس ہی تھی۔ عجیرہ دلہن بن کر بہت ہی پیاری لگ رہی تھی۔ نکاح تو دو دن پہلے ہی ہو چکا تھا آج تو صرف رخصتی تھی۔ ہر کام وقت پر اور اچھے طریقے سے ہو رہا تھا۔ بس اب تو سب کو دولہا اور بارات کا انتظار تھا۔ اور بلآخر یہ شدت بھرا انتظار بھی ختم ہو گیا۔

بارات بہت دھوم دھڑکے سے آئی تھی۔

دولہے کے منچلے دوست دولہے کو گھیرے میں لیے بھنگڑا ڈال رہے تھے اور پھر اچانک ہی ایک دوست نے ہوائی فائرنگ شروع کر دی۔ اس کی دیکھا دیکھی دوسرے دوست بھی اس کا ساتھ دینے کے لیے میدان میں آ گئے اور پھر تو جیسے ہوا بارود بن گئی، بڑوں نے لاکھ روکنا چاہا مگر انہیں ہوش ہی کب تھا وہ اپنی مستی میں مست تھے اور پھر پولیس کی گاڑی کا ہارن سنائی دیے جانے پر بھگدڑ سی مچی اور اچانک ہی گولی دولہا کے سینے کے پار ہو گئی۔ خون کے فوارے نے سب کے اوسان خطا کر دیے۔ سب تتر بتر ہو گئے۔ جو ہاتھ لگے پولیس نے انہیں قابو کر لیا۔ دولہا کو خون میں تربتر زخمی حالت میں اسپتال لے کر پہنچے۔ خوشیوں بھری فضا لمحوں میں ہی افسردگی و پریشانی میں بدل گئی۔ پل میں سہانا منظر کتنا خوف ناک ہو گیا تھا۔ ممانی نے دکھ اور صدمے سے اپنا سینہ پیٹ ڈالا

"ہائے میری بچی کی خوشیوں کو کس کی نظر لگ گئی۔ لوگوں کو میری بچی کی دھنی قسمت برداشت نہ ہوئی۔"

وہ اب بھی لوگوں کو مورد الزام ٹھہرا رہی تھیں۔ دلہن بنی عجیرہ کی حالت غیر ہو گئی تھی۔ وہ بار بار بے ہوش ہو جاتی۔ ہر آنکھ نم تھی سب کو ہی اس واقعے پر افسوس ہو رہا تھا اور پورے خلوص سے اس کے دولہا کی زندگی کی دعائیں مانگ رہے تھے۔ خواتین ممانی کو تسلی دے رہی تھیں اور کزنز عجیرہ کو سنبھالے ہوئے تھیں۔

"اگر دولہا کو کچھ ہو گیا تو......؟ کیا عجیرہ رخصتی سے پہلے ہی بیوگی کی چادر میں لپٹ جائے گی؟

یہ خیال ہی سوہان روح تھا۔ دعاؤں میں شدت آ جاتی۔ اور پھر اللہ نے ان سب کی دعاؤں کی لاج رکھ لی تھی۔ دولہا خطرے سے باہر تھا اور ہوش آ گیا تھا۔ دولہا کی ماں عجیرہ کو منحوس کہہ رہی تھی جس کے آنے سے پہلے ہی اس کے گھر میں قیامت ٹوٹ پڑی تھی۔

وہ کسی طور بھی عجیرہ کو رخصت کروا کر اپنے گھر لے جانا نہیں چاہتی تھیں۔ پھر کچھ ان کے خاندان کے اور کچھ اس طرف کے لوگوں نے ان کو سمجھایا تب کہیں جا کر وہ راضی ہوئیں۔ چند بڑوں کی موجودگی میں وہ تنے چہرے کے ساتھ وہ عجیرہ کو رخصت کرانے آئیں۔ برستی آنکھوں اور پریشان صورت لیے عجیرہ کو رخصت کر دیا گیا۔

اور سارا سوچ رہی تھی کہ ان سب نے تو عجیرہ کی شادی میں خوش دلی سے شرکت کی تھی۔ دوسروں کی خوشیوں کو اپنی بد مزاج فطرت سے پھیکا کر دینے والی ممانی کو کسی نے بھی بد دعا نہ دی تھی مگر پھر بھی ان کے ساتھ کتنا خوف ناک حادثہ ہوا۔ کیسے خوشیوں بھری فضا مکدر ہو گئی، دلوں کو رنج پہنچا، پریشانی اٹھانا پڑی۔ عجیرہ کی ساس کی چھلنی کر دینے والی باتوں نے ممانی کا دل خوب چھلنی کیا۔ بے شک ممانی کی زیادتیوں پر خاندان والوں نے کبھی منہ سے بد دعا نہ نکالی مگر دکھی دلوں کی آہ لگتی ضرور ہے اور انہیں بھی کسی کو ستانے کی آہ لگ گئی تھی جب ہی تو ان کی خوشیوں کو بھی آج گرم ہواؤں نے جھلسا دیا تھا۔ سارا نے قدرت کے ایسے انتقام پر جھرجھری سی لی تھی۔

☆☆

نئے افق

میمونہ صدف

"لاحول ولاقوۃ......" تمام تصاویر کے آخر میں جو تصویر تھی اس کی پہلی شرط ہی نوکری پیشہ لڑکی تھی۔ اس نے تمام تصاویر ایک طرف میز پہ پھینکنے کے سے انداز میں رکھیں۔

"عورت کی کمائی جن مردوں کے منہ کو لگ جائے وہ پھر اپنی کمائی میں اضافے کے لیے ہاتھ پاؤں مارنے کے بجائے، ہاتھ پاؤں توڑ کر بیٹھ جاتے ہیں۔" پلیٹ میں پڑے انڈہ شامی برگر اس نے کیچپ سے لگا کر منہ میں ایک بڑا نوالہ بھرا اور پاس پڑی کولڈ ڈرنک کو اندر اتارتے ہوئے سکون محسوس کیا۔

سامنے بیٹھیں الفت آنٹی اس کے بقول "برگی کبوتری" نے چست ٹراؤزر میں پھنسی ٹانگوں کی حالت تبدیل کرتے ٹشو پیپر سے اپنا پسینہ پونچھا جو گرمی کے سبب کم اور فاؤنڈیشن کی تہہ کے سبب زیادہ اُنڈر رہا تھا۔

"اب پڑھی لکھی کماؤ بیوی کسے بری لگتی ہے۔"

وہ میز پہ موجود اب تمام تصویروں کو اوپر تلے رکھے سمیٹنے کی کوشش میں تھیں۔

"پڑھی لکھی تک تو بات ٹھیک ہے لیکن کماؤ بیوی۔" اس نے سوچ کر جھرجھری لی۔

"اس دور میں کون پڑھ لکھ کر گھر بیٹھنا چاہتی ہے۔"

ان کے چہرے پہ ناگوار تاثرات ابھرے۔

وہ سچ ہی بیان کر رہی تھیں۔ اس دور میں تو لڑکی کا نوکری پیشہ ہونا پسند کیا جاتا تھا۔ خود اس کے لیے کتنے خاندانوں نے اسی لیے رضامندی ظاہر کی تھی کہ وہ نوکری کرتی تھی۔

کب سے اس لڑکی کے لیے وہ رشتے ڈھونڈ رہی تھیں اور وہ تھی کہ ہاتھ ہی نہیں آ کر دے رہی تھی۔ ہر دوسرے رشتے میں اسی سبب سے انکار ہوتا تھا۔

"جو گھر نہیں بیٹھنا چاہتیں یہ ان کا مسئلہ ہے، میرا نہیں۔ میرا مسئلہ یہ ہے کہ میں نوکری اپنا شوہر پالنے کے لیے نہیں کرنا چاہتی۔ شوق پالوں تو الگ بات ہے۔ لیکن ایسا شوہر پالنے سے بہتر مجھے لگتا ہے کہ میں کیوٹ سا ٹومی پال لوں جو دن رات مجھ پہ بھونکے نہیں بلکہ میرے تلوے چاٹے۔"

الفت آنٹی کو اس کے ضرورت سے زیادہ صاف گو ہونے پہ کانوں سے دھوئیں نکلتے محسوس ہو رہے تھے۔ نجانے کون سی منحوس گھڑی تھی کہ اس کا رشتہ طے کروانے کے لیے انہوں نے اس کی ماں سے بیعانہ پکڑ لیا تھا۔ نہ صرف پکڑا تھا بلکہ کھا پی کر ہضم بھی کر لیا تھا۔ اب وہ واپس کہاں سے لوٹاتیں۔ اتنی بڑی رقم وہ ان سے رشتے طے کروانے کی مد میں لے چکی تھیں کہ اب واپس کرنے کا سوچ کر ہی غش آنے لگتا تھا۔

"تو تم ایک بار بتا دو کہ تم شادی کے بعد نوکری کرنا چاہتی ہو یا نہیں کرنا چاہتی تاکہ یہ گتھی تو سلجھے۔"

"یہ میری مرضی ہو گی کہ میں نوکری کروں یا نہیں۔ اور جو میں کماؤں گی وہ خود پہ اڑاؤں گی۔ بلکہ وہی نہیں شوہر کا کمایا بھی اڑاؤں گی۔"

الفت آنٹی اب جلدی جلدی اپنی پیٹ پوجا کی

جانب متوجہ ہوئیں کہ کہیں وہ ان کے سامنے رکھا بھی نہ اڑا لے۔

"اور لڑکا کیا کرتا ہو......؟" ماں نے جتنے آسان مطالبات گنوائے تھے بیٹی اتنا ہی الجھا رہی تھی۔

"محنت کرتا ہو اور بس۔"

"لوہار، چمار، سنار، کمہار بھی بہت محنتی ہوتے ہیں۔ چلے گا......؟" وہ ٹھیک ٹھاک تپ گئیں۔

"دوڑے گا۔" ایک دل فریب مسکراہٹ اس کے لبوں کو چھو گئی جس نے الفت آنٹی کو آگ لگا دی۔ "بس محنتی ہو۔"

"ڈاکو، چور بھی محنت کرتے ہیں۔" برگر منہ میں ٹھونستے وہ مزید تپ کر کہہ رہی تھیں۔

"محنت مثبت ہونی چاہیے نا۔ ورنہ تو بیوی کی کمائی کھانے والا بھی محنت تو کرتا ہی ہے کھانے میں۔" اس کا برگر ختم ہوا تو کولڈ ڈرنک اس نے جلدی

سے اسٹرا سے سڑوک لی۔

"ایک پڑھا لکھا لڑکا لیکن محنتی ہو۔ ابھی بھلے اچھے مقام پہ نہ ہو لیکن اس میں اچھے مقام تک پہنچنے کا جنون ہونا چاہیے۔ ذمہ داریاں اٹھانے کا یارا ہونا چاہیے۔"

الفت آنٹی نے سر ہلا دیا۔ اب پھر سے اس کے لیے لڑکا ڈھونڈنے کی مہم شروع ہونے جا رہی تھی۔

"اب آپ سے میں ایک مہینے بعد ہی مل سکوں گی۔ کمپنی کی طرف سے میں ترکی جا رہی ہوں۔" اپنا پرس اٹھاتے اس نے بل منگوانے کے بجائے اس کی رقم وہیں میز پہ رکھ دی۔

الفت آنٹی "ہائیں" کرتے، منہ کھولے اسے جاتا دیکھ رہی تھیں۔ پھر جلدی سے اس کی رکھی رقم دیکھی کہ وہ ان کا بل بھی ادا کر کے گئی ہے یا نہیں...... شکر کا ایک سانس لیا۔ اس لڑکی کی ایک بات اچھی تھی کہ وہ ان کی مرضی کا کھانا منگوا کر بل کے ساتھ اچھی ٹپ بھی ادا کر جاتی تھی جس میں سے کچھ پیسے وہ اڑا کر دس بیس روپے ٹپ چھوڑ دیتی تھیں۔ اب بھی وہ یہی کر رہی تھیں۔

اور اس کے گھر پہنچنے کی دیر تھی کہ ماں غصے سے بڑبڑانے لگیں...... برتن ٹن ٹن بجنے لگے...... چیزوں کی اٹھا پٹخ جاری تھی۔ وہ انہیں سلام کر کے کمرے میں آ گئی۔ لیکن ماں کا بولنا پھر بھی سنائی دیتا رہا۔

یہ ہر دفعہ ہی ہوتا تھا۔ ماں اسی طرح غصہ دکھاتی تھیں اور جب اس طرح غصہ نہیں نکلتا تھا تو آخر میں اس سے دوبدو بات کرنے پہنچ جاتیں۔ وہ جانتی تھی کہ اب کچھ دیر بعد ماں اس کے سر پہ پہنچ کر اس سے سیدھے سبھاؤ پوچھیں گی۔

"آخر کہاں سے یہ بھوت سوار ہو گیا ہے تمہارے سر پہ کہ کوئی تمہیں نوکری کا نہ کہے۔ مہارانی بنا کر گھر میں سجائے۔ اور اتنی اچھی تنخواہ والی نوکری آخر چھوڑنا ہی کیوں چاہتی ہو۔ اچھا نہیں ہے کہ اپنی کمائی ہاتھ میں آ رہی ہے۔ سو چیزیں جوڑ لیتی ہو، پچاس خرید لیتی ہو۔ کیا برائی ہے کمانے میں؟" ان کا بول بول کر سانس پھول گیا تو اس کے کمرے کے دروازے پہ کھڑی ہو گئیں۔

وہ جو ایک جوتا یہاں اور ایک وہاں اتار کر، دوپٹا کارپٹ پہ گرا کر، بیگ فرشی کشن پہ پھینک کر مزے سے بستر پہ گری تھی۔ اٹھ بیٹھی۔

"کوئی برائی نہیں ہے اگر اپنی مرضی سے کماؤں۔ لیکن سو برائیاں ہیں اگر مجبوری میں کماؤں...... اور مجبوری میں بس میں اپنی ماں کا گھر چلانے کے لیے ہی کما سکتی ہوں کسی نکھٹو مرد کا نہیں۔" ماں سمجھتی تھیں کہ وہ کیوں نہیں چاہتی اور دراصل چاہتی کیا ہے لیکن بار بار اس کے منہ سے سن کر نجانے انہیں کیا ملتا تھا۔

"تمہاری ماں بھی ساری عمر کماتی رہی ہے۔" اسے جتایا تو وہ طنزیہ ہنس دی۔

"ماں کرتی رہی ہے تب ہی میں نہیں کرنا چاہتی پیاری رفعیہ۔" وہ اکثر پیار سے انہیں ایسے ہی بلاتی تھی۔

"زندگی کسی کی بھی آسان نہیں ہوتی۔ لیکن کبھی نہ کبھی آسان ہو ہی جاتی ہے۔"

"جب زندگی گزر جاتی ہے تو آسان ہو جاتی ہے۔ ایسی زندگی کا کیا کرنا پھر جو گزارنے پہ تو آسان نہ ہو لیکن گزر جانے کے بعد آسان ہو جائے......؟" اور اس کی اس بات نے رفعیہ کو خاموش کر دیا۔

اس نے ماں کو دیکھا اور ہر طرف بکھری اپنی چیزیں سمیٹنے لگی۔ ماں اسی طرح دروازے میں کھڑی رہیں۔ اپنا سامان سمیٹ کر وہ ان کے پاس آئی۔ ان کے گال پہ نرمی سے پیار کیا۔

"پیاری ماں! مجھے رفعیہ بانو نہیں بننا کیونکہ وہ میں کبھی بن نہیں سکتی۔ میں خود پہ اٹھنے والے ہاتھ کو ہی توڑ دوں۔ کلائی مروڑنے والے کی گردن مروڑ دوں۔ بٹوہ کھول کر سب نکالنے والے کا سر کھول دوں۔ اور اپنے ہی ہاتھوں بیوہ ہونے کا میرا کوئی

ارادہ نہیں ہے۔" بھرپور مسکراہٹ سے وہ ماں کا دل جلا گئی۔

"تو ایسا کہاں ملے گا جسے آپ کی نوکری سے نہیں آپ سے محبت ہو......" انہوں نے خواہ مخواہ ہی لبوں کو پھیلا کر، طنزیہ مسکراتے ہوئے پوچھا۔

زاشا نے اپنی بانہیں ماں کی گردن کے گرد حمائل کیں اور بڑے پرسکون انداز میں بولی۔

"وہ نہ ملے ...... میں اسے مل جاؤں گی۔ وہ خود مجھے ڈھونڈ لے گا۔ ویسے بھی الفت آنٹی کو بھی دنیا جہاں کے ڈبے چپے قسم کے لڑکے ہی کیوں ملتے ہیں......؟ کبھی کوئی ڈھنگ کا انسان تو لائی نہیں۔"

"جن لڑکیوں کے باپ ایسے مر جائیں ان کے لیے پھر ایسے ہی لڑکے ملتے ہیں۔" ماں کے منہ سے پھسل گیا تھا بس۔

اس کے چہرے کا رنگ فق ہوا...... پھر ماں کے گرد حمائل بازو ڈھیلے پڑتے پہلو میں جا گرے اور چہرہ بالکل سپاٹ ہو گیا۔

وہ جلدی سے پلٹ کر غسل خانے کی سمت چلی گئی۔

"کھانا بنا دیں، بہت بھوک لگی ہے......" اپنی آواز کی لرزش کو چھپاتے ہوئے اس نے اندر گھستے ہی دروازہ بند کر دیا۔

رقیہ بانو کا دل کانپ اٹھا۔ وہ ایسا نہیں کہنا چاہتی تھیں نجانے کیسے ان کے منہ سے یہ سب نکل گیا۔ جانتی تھیں اب پانی کا تلکا کھولے اس کے سامنے کھڑی وہ اپنے اندر کے سب ہی آنسو بہا رہی ہوگی۔ انہیں شدید پچھتاوا ہوا...... دکھ ہوا لیکن اب بات پلٹائی نہیں جا سکتی تھی۔

"اور ساری زندگی مجھے اب ابا کے وجود کا تاوان بھرنا ہوگا۔ ان کی بیٹی ہونے کی سزا کاٹنی ہوگی۔ پہلے ہم ان کی زندگی کی قیمت اپنے جسموں پہ مار کھا کر چکاتے تھے اور اب باقی کی زندگی ان کی موت کی قیمت اپنی روح پہ زخم سہہ سہہ کر چکائیں گے۔"

آئینے کے سامنے، سنک پہ جھکی وہ روتی چلی جا رہی تھی۔ بار بار گالوں کو رگڑ رگڑ کر صاف کرتے وہ روتی چلی جا رہی تھی۔ سرخ متورم آنکھوں اور ناک سے بہتے پانی کو نل کے پانی سے صاف کر رہی تھی لیکن وہ پھر سے بہہ رہے تھے، بار بار بہہ رہے تھے اور وہ بار بار انہیں دھو رہی تھی۔ ابا کی کسی بات پہ بھی خود کو بالکل ٹھیک رکھنا، معمول کے مطابق برتاؤ کرنا کبھی بھی آسان نہیں رہا تھا۔

"اور مجھے غلط فہمی تھی کہ ان کے جانے سے وہ عذاب ختم ہو گیا جو میں اور ماں سہتے رہے ہیں۔ یہ عذاب ان کی موت کے ساتھ نہیں بلکہ ہماری موت کے ساتھ ہی ختم ہوگا کیونکہ وہ خود تو چلے گئے لیکن اپنے اعمال ہمارے لیے چھوڑ گئے جو کبھی سانپ کبھی بچھو بن کر ہمیں کاٹتے رہیں گے۔" اب وہ دیوار کا سہارا لیے کھڑی آئینے میں اپنی صورت دیکھ رہی تھی۔ یہ سب ہمیشہ سے یونہی چلتا آ رہا تھا۔ آئندہ بھی یونہی چلنا تھا۔

☆☆☆

وہ کمپنی کی طرف سے دو ہفتے کے کورس پہ ترکی آئی تھی۔ کمپنی نے سلطان احمت میں واقع ایک چار ستارے والے ہوٹل میں اس کے لیے کمرا مختص کروایا تھا۔ اس کا کھانا پینا بھی کمپنی کی ذمہ داری تھا۔ ہفتے کے پانچ دن وہ صبح نو بجے ٹریننگ کے لیے پہنچ جاتی جو شام سات بجے تک چلتی رہتی۔ ٹریننگ سنٹر وہاں سے قریب ہی ایمی نونو میں تھا۔ اسی لیے وہ کمپنی کی گاڑی میں پندرہ منٹ کے اندر اندر اپنے ہوٹل پہنچ جاتی تھی۔ تب تک وہ اتنا تھک چکی ہوتی کہ باہر نکل کر استنبول دیکھنے کی تو ہمت بھی نہ ہوتی جہاں ساری دنیا گھومنے پھرنے ہی نکلتی تھی۔

ہوٹل پہنچ کر وہ لباس تبدیل کر کے ہوٹل کی سب سے اوپری منزل پہ پہنچ جاتی جہاں سے اسے سارا شہر روشنیوں میں نہایا دکھائی دیتا۔ یہاں ہوٹل کا ریستوران تھا جو دیکھنے میں کسی سن روم جیسا تھا۔ اردگرد کے اکثر ہوٹلز کے ریستوران سب سے اوپری

منزل پہ ہی واقع تھے۔ اس ریسٹوران کے تین اطراف شیشے کی دیواریں اور چوتھی طرف اس کا باورچی خانہ تھا۔ ناشتا اور رات کا کھانا وہ وہیں آ کر کھاتی تھی جو کمپنی ہی برداشت کر رہی تھی۔ دوپہر کا کھانا اسے دوران ٹریننگ ہی آدھے گھنٹے کے وقفے میں مل جایا کرتا تھا۔ یوں اس کی رہائش اور کھانا پینا مفت تھا۔ لیکن اگر اسے گھومنے پھرنے یا باہر سے کھانے کے لیے کچھ بھی درکار تھا تو اس کا خرچا اسے خود اٹھانا تھا، اسی لیے بھی وہ ابھی تک باہر نہیں نکلی تھی۔

اس دن بھی اس نے اپنے لیے شیشے کے ساتھ والی میز چنی تھی۔ وہاں بیٹھ کر کھانے میں اسے روشنیوں میں نہائے استنبول کو ٹھیک سے دیکھنے کا موقع مل جاتا تھا۔ وہ معمول سے کچھ دیر سے ریسٹوران آئی تھی ورنہ وہ آٹھ بجے جب وہاں آتی تو اکادکا لوگ ہی بیٹھے ملتے تھے۔ آج وہ لباس تبدیل کرنے کے بعد اپنے کپڑوں کی دھلائی میں لگ گئی تھی۔ کمرے کی صفائی تو ہوٹل کی انتظامیہ اس کی غیر موجودگی میں ہی کر دیا کرتی تھی کہ ان کے پاس کمرے کی اضافی چابی موجود ہوتی تھی لیکن اپنے کپڑے تو اسے خود ہی دھونے تھے۔ وہ چاہتی تو یہ خدمات بھی ہوٹل سے حاصل کر سکتی تھی لیکن یہ مفت نہیں تھیں۔ اس کے بدلے ہر دفعہ اس سے سو لیرا لیے جاتے جو کم از کم اسے زیادہ لگے تھے۔ اس سے بہتر تھا وہ کپڑے خود دھو لے اور اس نے یہی کیا تھا۔

تو اس دن کپڑے دھو کر فارغ ہوتے ہوتے نو بج گئے تھے اور جب وہ سوا نو ریسٹورنٹ آئی تو بس ایک میز ہی خالی دکھائی دی تھی۔ اتفاق سے میز شیشے کی دیوار سے ہٹ کر تھی لیکن یہ بھی غنیمت تھا کہ اسے بیٹھنے کی جگہ مل گئی تھی کہ اس وقت اسے بہت زوروں کی بھوک لگی تھی۔

ریسٹوران میں بوفے ڈنر کا انتظام ہوتا تھا گو کہ یہ بوفے ڈنر پاکستانی بوفے جیسا تو نہیں تھا لیکن اب یہی کھانا اس کی مجبوری تھی۔

اپنی پلیٹ میں جب وہ کافی کچھ بھر کر اپنی مطلوبہ میز پہ آئی تو وہاں ایک لڑکا بیٹھا تھا۔

''معاف کیجیے گا یہ میری جگہ ہے۔'' اس نے شستہ انگریزی میں کہا۔ لڑکا شکل سے مقامی لگتا تھا یا شاید ایرانی تھا۔ اسے کبھی بھی ترکی، ایرانی اور عراقیوں میں فرق نہیں سمجھ میں آتا تھا۔ اسی لیے وہ بس اندازہ ہی کر سکی تھی کہ وہ مقامی ہی ہے۔

''یہاں کوئی نہیں تھا تو مجھے لگا کہ یہ میز خالی ہے۔'' اس نے بھی جواباً انگریزی میں ہی جواب دیا۔

صد شکر کہ وہ انگریزی سے واقف تھا ورنہ وہاں اکثر اسے ایسے لوگ ٹکرا جاتے جو انگریزی تک نہیں جانتے تھے۔ پھر اسے کسی ترجمہ کرنے والے کی مدد درکار ہوتی تھی تاکہ وہ اپنی بات پہنچا سکے اور اس کی سن سکے۔

وہ فوراً اٹھ گیا تھا۔ پھر ادھر ادھر متلاشی نظروں سے میز ڈھونڈنے کی کوشش کرتا رہا لیکن سب ہی میزیں بھری ہوئی تھیں۔ صرف واحد وہ تھی جس کی میز پہ وہ اکیلی تھی۔

اس وقت وہ یہ بھی نہیں کر سکتا تھا کہ یہاں سے چلا جاتا اور بعد میں آ جاتا کہ ریسٹوران کا وقت دس بجے تک تھا۔ اب جاتا تو پھر بھوکا ہی سونا پڑتا۔ اپنی پلیٹ بھر کر وہ پھر سے اسی کونے میں چلا آیا جہاں وہ بیٹھی تھی۔ عین اس کے سر پہ کھڑا ہو کر وہ کھڑے کھڑے ہی کھانے لگا جہاں وہ کھانا کھا رہی تھی۔ زاشا کا چلتا ہاتھ سست ہوا اور منہ بھی...... اپنے سر پہ اس کا یوں کھڑے ہو کر کھانا اسے برا لگ رہا تھا۔

''مہربانی فرما کر آپ یہیں بیٹھ جائیں۔ یوں کھڑے ہو کر کھانا معیوب لگ رہا ہے۔'' اس نے انگریزی میں ہی کہا۔

اس کی اس پیشکش پہ لڑکے کی باچھیں چر گئیں۔ جھٹ سے کرسی سنبھالی اور اس کا شکریہ ادا کرتے ہوئے وہ کھانے لگ گیا گویا کھڑا ہی اسی لیے تھا کہ وہ اس مسکین کو بیٹھنے کا کہہ دے گی۔

"آپ یہاں اکیلی آئی ہیں......؟" اس کے سوال پہ زاشا نے اسے گھورا۔

"نہیں بارات کے ساتھ آئی ہوں۔" جواب اس نے اردو میں دیا تا کہ وہ سمجھ نہ سکے۔

"جی۔ میں کمپنی کی طرف سے ٹریننگ پہ آئی ہوں۔" پھر اخلاقاً زبردستی مسکرانا پڑا۔

"میں بھی ایک بزنس پروجیکٹ کے سلسلے میں یہاں آیا ہوں۔"

"تو آپ بزنس مین ہیں...؟"

"میں بزنس مین نہیں ہوں۔ وہ تو میرے باس ہیں۔ لیکن میں بھی جلد بن جاؤں گا۔ باس کے بعد سب میرا ہی تو ہے۔" اس نے بکرے منہ سے جواب دیا۔

اس کی بات پہ زاشا نے سر ہلایا۔

"شارٹ کٹ۔" اس کی بڑبڑاہٹ اب بھی اردو میں تھی۔

"میں ان سے بزنس کے سب ہی گر سیکھ رہا ہوں۔" زاشا نے اثبات میں سر ہلایا۔ اسے کیا کہ وہ بزنس کی الف ب سیکھے یا سارے گر۔

"ویسے باس کے بعد سب کچھ آپ کا کیسے ہو جائے گا......؟" ہاں اس بات میں اسے دلچسپی محسوس ہوئی تھی۔

"کیونکہ میرے باس میرے والد ہی تو ہیں۔" اس نے دانتوں کی غیر ضروری نمائش کی۔

"لاحول ولاقوۃ۔" حسبِ عادت اس کے منہ سے نکلا پھر زبان دانتوں تلے دبا دی۔ کم از کم یہ جملہ اردو میں نہیں تھا جسے وہ سمجھ نہ سکتا۔ اس کی بات پہ پھر سے بتیسی دکھائی دی اور پھر وہ کھانے میں مصروف ہو گیا۔

کچھ کچھ رکھا تا وہ اسے کسی پاکستانی اداکار جیسا لگ رہا تھا جس کا نام اور صورت واضح نہیں ہو رہی تھی لیکن وہ یقین سے کہہ سکتی تھی کہ وہ ہو بہو اس کے طور اطوار اور بولنے کا انداز کسی سے ملتا جلتا تھا جو ٹی وی پہ آتا تھا۔ اس وقت کم بخت یاد نہیں آ رہا تھا۔

"ہمارا بزنس کوئی بہت بڑا نہیں ہے۔ بس یہی چھوٹا موٹا رینٹ آ کار کا کام ہے۔ پہلے ہم اپنے ملک میں یہ کام کر رہے تھے۔ اب یہاں کرنا چاہتے ہیں۔ یہاں بھی کوشش ہے کہ ہم ٹورسٹ کمپنیز کے ساتھ مل کر کام کریں۔ ابھی ایک ٹورسٹ کمپنی کے ساتھ جڑے ہوئے ہیں۔ مستقبل میں مزید کے ساتھ کام کا ارادہ ہے۔" اس نے سر ہلایا۔ وہ مزید اس کے کام کی کسی تفصیل میں کوئی دلچسپی نہیں رکھتی تھی۔

"تو آپ اس ہوٹل میں کب تک ہیں......؟"

"لو اب خواہ مخواہ لیچڑ ہو گا۔" اپنی پلیٹ میں موجود چکن باربی کیو کا آخری ٹکڑا منہ میں ڈالنے سے پہلے اس نے خود سے کہا۔

"خیر میرا لیچڑ ہونے کا کوئی ارادہ نہیں ہے۔ یہ تو بس یونہی پوچھا۔" اس بار جملہ اردو میں کہا گیا تھا۔ زاشا کا اپنے منہ کی طرف ہاتھ جاتا پتھر ہوا۔ پلکیں جھپکائے بنا وہ اسے دیکھنے لگی۔ وہ اردو سمجھتا تھا، بولتا بھی تھا اور وہ اب تک اس کے سامنے بیٹھی کیا بکواس کر رہی تھی۔

"آپ اردو بولتے ہیں۔" بے یقینی سے اس نے کہا۔

"یہ اطلاع ہے یا سوال......؟" اسے اس بات سے لطف آیا تھا۔

زاشا حیرت سے بس اسے دیکھ رہی تھی۔ سو لعنتیں خود پہ دو سو اس پہ بھیجیں۔

"یہ میری اپنی زبان ہے تو کیوں نہ بولوں......؟" وہ مزے سے کہہ رہا تھا۔

"پاکستانی......؟" وہ پھٹی آنکھوں سے اسے دیکھتے ہوئے پوچھ رہی تھی جس پہ وہ اس کے تاثرات سے محظوظ ہوتا ہوا مسکرا دیا۔

"پراؤڈ ٹو بی پاکستانی۔" دائیں ہاتھ کی شہادت اور اس کی ساتھ والی انگلی ہوا میں لہراتے ہوئے اس نے خود پہ فخر کیا۔

زاشا نے اپنی حماقت پہ آنکھیں بھینچ لیں۔

شاید اسے لگا تھا کہ آنکھیں کھولنے پہ وہ غائب ہو جائے گا۔ لیکن منظر تو وہی رہا تھا۔ وہ سامنے ہی بیٹھا مزے سے کھا رہا تھا، مسکرا رہا تھا۔

"تو اتنی دیر سے پٹر پٹر انگریزی کیوں بول رہے ہیں......؟" اس نے اب کھا جانے والی نظروں سے اسے گھورا کہ یہ بھی اس کی غلطی تھی جو اس نے نہیں بتایا۔

"آپ نے کون سا پوچھا تھا۔ بس شروع ہو گئیں انگریزی میں۔ اور میرے استاد کہتے تھے کہ بیٹا جی جب کوئی آپ سے انگریزی میں بات کرے تو جواب انگریزی میں ہی دیا کرو۔ اس سے اگلے پہ دھاک بیٹھتی ہے۔"

یہاں اس کی عزت خاک ہو گئی تھی اور اسے اپنی دھاک کی پڑی تھی۔

"آپ کے اس استاد کی وجہ سے......" وہ کچھ کہتے کہتے رک گئی۔

"میری یہ استاد میری ممی ہیں۔" پھر سے دانتوں کی نمائش۔

زاشا کا دل کیا اس کے دانت ہی توڑ دے۔

"یہ جو کچھ بھی میں نے ابھی کہا تھا نا وہ سب بکواس تھا۔" اب وہ اپنی جھینپ مٹانے کو کہہ رہی تھی۔

"جو کچھ مطلب......؟" اس نے جیسے ناسمجھی سے پوچھا۔ پھر جیسے سمجھتے ہوئے سر کو ایک جھٹکا دیتے ہوئے کہا۔

"یہ کہ آپ یہاں کمپنی کی طرف سے آئی ہیں......؟"

زاشا نے دانت پیسے خود پہ ضبط کیا کچھ دیر میں وہ قاتل بننے والی تھی کیونکہ مقتول اسے بری طرح اکسا رہا تھا کہ اسے قتل کر دیا جائے۔

"نہیں......وہ جو کہا کہ......" اسے سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ دوبارہ پھر سے کیسے کہے۔

"اچھاااا۔" اس نے جیسے سمجھتے ہوئے اچھا کو لمبا کھینچا۔

"یہی کہ میں شارٹ کٹ ڈھونڈ رہا ہوں۔ لیچڑ ہونے لگا ہوں۔"

اُفف ف ف......اتنی اچھی یادداشت۔

"وہ تو بہت مزے کی بات تھی۔ اگر میں بتا دیتا کہ میں پاکستانی ہوں تو یہ سب کیسے سننے کو ملتا۔"

زاشا پہ گھڑوں پانی پڑ گیا۔ وہ اب اس سے نظریں تک نہیں ملا پا رہی تھی۔ اور وہ مزے سے مسکرا رہا تھا۔

"دراصل مجھے لگا کہ آپ مقامی ہیں۔ یا ایرانی یا عراقی قسم کے۔"

"اتنا کچھ ایک ساتھ......؟" وہ ہنس دیا۔

"بس ان ہی کی کوئی ملی جلی قسم...... لیکن پاکستانی تو ہرگز نہیں ہیں۔ پاکستانی ایسے کہاں ہوتے ہیں......؟" اس نے منہ بنایا کہ یہ اس کے نقوش اور صاف رنگت کا قصور تھا کہ وہ دھوکا کھا گئی۔

"میں ہوں بھی ملی جلی قسم ہی۔ وہ کیا ہے کہ میرے والد پاکستانی ہیں اور میری ممی ترکی۔ تو یہاں میرا ننکا ہے اور پاکستان میرا دادکا۔"

زاشا نے خود کو نارمل کیا اور پھر اس کی طرف دیکھا۔

"آئی ایم رئیلی سوری۔" وہ واقعی معذرت کر رہی تھی۔ جواباً وہ مسکرا دیا۔

"اس کی ضرورت نہیں ہے۔ میں سچ میں آپ کے وہ جملے انجوائے کر رہا تھا۔ برا تو بالکل بھی نہیں لگا۔"

زاشا اس کے چہرے کی سچی تحریر پہ مسکرا دی۔ نیپکن سے ہاتھ صاف کرتے اس نے اپنی پلیٹ ایک طرف سرکا دی۔

"اب آپ شرمندہ مت ہوں اور یہ بتائیں کہ میرا ننکا گھوم پھر کر دیکھا بھی ہے کہ بس یونہی ٹریننگ ہی کیے جا رہی ہیں؟"

"بس یونہی۔" زاشا مسکرائی۔ اسے پھر سے وہی پاکستانی اداکار یاد آیا جس سے اس کے سارے انداز مل رہے تھے۔ لیکن نام نہیں یاد آ کر دے رہا تھا

۔

"پھر کل تو اتوار ہے۔ آپ کا آف ہی ہوگا تو چلیں کہیں گھوم کر آتے ہیں۔؟"

زاشا نے اسے کچھ مشکوک نظروں سے دیکھا۔

"لیکچر نہیں ہو رہا۔ آداب میزبانی نباہ رہا ہوں۔ مفت کا گائیڈ بننے کی آفر کر رہا ہوں۔ اگر آپ کو اعتراض نہ ہو تو۔"

"ٹھیک ٹھیک......"

"تو کل صبح پونے سات نیچے لابی میں ملتے ہیں۔"

"اتنی صبح......؟" چھٹی والے دن بھی اتنی صبح اٹھنے کا سن کر وہ چلا اٹھی۔

"بھئی بورصہ جانا ہے تو صبح والی فیری سے جانا بہتر ہے۔ اور اپنے ساتھ کوئی جیکٹ ویکٹ لے آیئے گا۔ الوداغ کی پہاڑیوں پہ برف پڑی ہوتی ہے۔ یوں سمجھ لیں یہاں کا مری ہے۔"

اس نے سمجھتے ہوئے سر ہلایا۔

"کل ملتے ہیں۔" اپنی جگہ کھڑی ہو کر اس نے پاس پڑا اپنا موبائل اٹھایا اور داخلی دروازے کی طرف بڑھ گئی۔ سیڑھیاں اترتے ہوئے اسے یاد آیا وہ اس کا نام تک پوچھنا بھول گئی تھی۔ ایک چپت اپنے سر پہ ماری۔ اب وہ واپس نہیں پلٹنا چاہتی تھی۔ یہ مزید حماقت ہوتی اور جتنی حماقت وہ کر چکی تھی، کافی تھی۔

☆☆☆

اگلی صبح وہ جیسے تیسے اٹھ کر تیار ہوئی اور نیچے لابی میں پہنچی۔ وہ وہیں اس کا منتظر تھا۔ اسے دیکھ کر مسکرایا۔

"شکر ہے آپ وقت سے آ گئیں۔ گاڑی کب سے آ چکی ہے۔" سلام کے بعد وہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ بھوری لیدر جیکٹ اور نیلی جینز کی پینٹ پہنے، گردن کے گرد مفلر لپیٹے اور سر پہ اونی ٹوپی پہنے وہ مکمل تیاری سے آیا تھا۔ پاؤں میں برف پہ چلنے والے لمبے جوتے تک چڑھا رکھے تھے۔ زاشا نے اس کے مقابلے میں تو کم ہی تیاری کی تھی۔ اسے تو دیکھ کر بھی ٹھنڈ لگ رہی تھی۔

اس سے پہلے ہی وہ ریسپشنسٹ کو ہاتھ ہلاتا سیڑھیاں چڑھتا داخلی دروازے سے باہر نکل گیا۔ زاشا بھی بھاگتے ہوئے ہی اس کا ساتھ دے رہی تھی۔

"کیا ہم ناشتے کے بغیر جائیں گے......؟" وہ کوٹ کی جیبوں میں ہاتھ دیے، تیز چلتے اس کے پیچھے تھی۔

"ناشتا فیری میں کر لیں گے۔" قریب ہی ان کی گاڑی کھڑی تھی جو ایک بڑی مسافر بردار وین تھی۔ اسی قسم کی وین اسے ٹریننگ سینٹر لے جانے کے لیے آتی تھی۔

گاڑی کا دروازہ کھولتے اس نے ہاتھ سے اسے اندر بیٹھنے کی پیشکش کی۔ وہ اندر بڑھی تو اس نے دروازہ دھکیل کر بند کر دیا۔ خود وہ ڈرائیور کے برابر والی نشست پہ بیٹھ گیا تھا۔ باقی وین خالی تھی۔ دونوں مقامی زبان میں بات کرنے لگے جس کا کوئی حصہ اسے سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔

ایک رات پہلے ملنے والے اس اجنبی پہ بھروسا کرتے میں اکیلی اس کے ساتھ چلی آئی ہوں۔ نجانے یہ کون سی زبان بول رہے ہیں۔ کیا بات کر رہے ہیں۔ مجھے کہاں لے کر جا رہے ہیں۔ اگر یہ مجھے اغوا کر لیں تو اس پرائے دیس میں تو میرا قیمہ تک کسی کو نہ ملے۔

"لاحول ولا قوۃ۔" زاشا کو پل بھر میں اپنی بے وقوفی پہ غصہ آیا اور پھر خوف سے اس نے جھرجھری لی۔ زیر لب وہ آیات کا ورد کرنے لگی۔

کچھ ہی دیر میں پورٹ آ گیا جہاں سے انہیں فیری میں بیٹھنا تھا۔ اس نے صد شکر کیا۔

گاڑی سے اتر کر وہ اس کے پیچھے اسی طرح بھاگتی رہی۔ ابھی انہیں ٹکٹ بھی خریدنا تھا۔

"تمہارا نام کیا ہے؟" وہ پیچھے قریباً بھاگتے ہوئے چلا رہی تھی۔ ہوا اتنی تیز تھی کہ اسٹول میں لپٹے

اس کے بال نکل نکل کر اڑ رہے تھے۔ ہاتھ کوٹ کی جیب میں تھے لیکن ناک ٹھنڈی ہوا سے سرخ پڑ رہی تھی۔ دانت بج رہے تھے۔ سمندر سے اٹھتی ہوائیں سیدھا آ کر ٹکرا رہی تھیں اور اس کی قلفی جما رہی تھیں۔

''بلال......'' تیزی سے چلتے ہوئے اس نے ذرا سا مڑ کر اونچی آواز میں جواب دیا اور کاؤنٹر کی طرف بڑھ گیا تاکہ ٹکٹ خرید سکے لیکن پہلے سے بنی لمبی قطار میں اسے انتظار کرنا تھا۔ وہ بھی اس کے پیچھے کھڑی تھی۔

''اتنی جلدی کس بات کی ہے؟''

''ساڑھے سات بجے فیری چل پڑے گی۔ اس سے پہلے ٹکٹ خریدنا اور پورٹ تک جا کر فیری میں سوار ہونا ہے۔ وقت ہمارا انتظار نہیں کرنے والا اسی لیے ہمیں اسے پکڑنے کے لیے بھاگنا ہوگا۔'' قطار میں سے لوگ تیزی سے نکل رہے تھے اور پیچھے سے شامل ہو رہے تھے۔

''آپ نے اپنا نام نہیں بتایا۔'' قطار میں کھڑے بور ہوتے ہوئے نجانے کہاں سے اسے اس کا نام پوچھنا یاد آ گیا تھا۔

''زاشا......''

ان کی باری قریب ہی تھی اور وقت بھی تیزی سے ہاتھوں سے پھسل رہا تھا۔ وہ بار بار کلائی پہ بندھی گھڑی دیکھ رہی تھی جبکہ بلال اپنے ہاتھ میں موجود موبائل پہ وقت کو بھاگتے دیکھ رہا تھا۔

ٹکٹ ملتے ہی وہ تیزی سے باہر کی طرف بھاگے جہاں سے انہیں فیری میں سوار ہونا تھا۔ یہ ایک بڑا بحری جہاز نما تھا جس پہ سوار ہو کر وہ مختلف ہالز میں سے ہوتے ہوئے آخر میں ایک بڑے ہال نما کمرے میں داخل ہوئے تھے جس کی شکل کسی بس کمپنی کے ویٹنگ روم جیسی تھی۔ اپنی نشست ڈھونڈنے پہ انہیں معلوم ہوا کہ انہیں کھڑکی کے برابر والی نشست نہیں ملی تھی۔ زاشا کے لیے یہ مایوس کن صورت حال تھی جس پہ اس کا منہ بن گیا کیونکہ وہ پہلی بار سمندر کا سفر کر رہی تھی۔ اسے پانی کو ہر پل دیکھنا تھا۔

''پہلے ناشتا لے لیتے ہیں۔ پھر جگہ بھی ڈھونڈ لیں گے۔'' وہ پچھلے ہال کی طرف چلا آیا جو کسی ریسٹورنٹ کی شکل کا تھا۔ وہاں ایک کونے میں گول دائرے کی مانند ایک بڑا کونا ریسٹورنٹ کے لیے مختص تھا جہاں کے مینو کارڈ میں کھانے پینے کے لیے بہت کچھ درج تھا۔

''قہوہ......؟'' وہ ترکی کے مخصوص مسالہ قہوہ کی پیشکش کر رہا تھا جو اس نے کچھ دن پہلے ہی پی کر دیکھا تھا۔ ایک سے دوسرا گھونٹ پینا محال ہوا تو وہ قہوے کا کپ وہیں چھوڑ گئی۔ اب دوبارہ سے وہ ایسا تلخ تجربہ نہیں کرنا چاہتی تھی۔ کوئی اسے مفت بھی پلواتا تو بھی نہیں۔

''شکریہ۔ میں کافی لینا پسند کروں گی۔'' کافی کے دو کپ اور سینڈوچز کے ساتھ اس نے برف کی ڈلی جیسی چینی کی چھ سات ڈلیاں لے لیں کہ ایک دو سے تو منہ اس کا پتا ہی نہیں چلتا تھا۔

اس ہال سے نکل کر وہ اپنے پچھلے ہال کی طرف ہی آ گئے اور پیچھے کی ان نشستوں پہ بیٹھ گئے جو زیادہ تر خالی ہی تھیں۔ جہاز چل چکا تھا۔ اب مزید کسی سواری نے نہیں آنا تھا اور ہال کی بیشتر نشستیں خالی ہی تھیں۔ اسی لیے اب وہ کہیں بھی بیٹھتے انہیں کوئی اٹھانے والا نہیں تھا۔

''آپ کو یقیناً یہاں کھانے پینے کا مسئلہ ہوتا ہوگا کیونکہ یہاں کے کھانے روایتی پاکستانی کھانوں سے مختلف ہیں۔''

جواباً مسکرانے کے سوا اس کے پاس کوئی چارہ نہیں تھا۔ وہاں کے کھانے اس کے حسب ذائقہ نہ تھے لیکن اب جس دیس میں تھی وہیں کا کھانا اس کی مجبوری تھی۔ لیکن سچ یہی تھا کہ اتنے دنوں سے پاکستانی گندم کی روٹی کھانے کو وہ ترس گئی تھی۔ بریڈ کے نام پہ ہمیشہ ہر جگہ اسے فرنچ بریڈ کھانے کو دی جاتی تھی۔ جس پہ وہ پنیر لگا لیتی۔ من چاہتا تو ساتھ تازہ زیتون اور ابلے انڈوں کے قتلے رکھ کر سینڈوچ

بنا لیتی لیکن یہ سب بھی پاکستانی کھانوں کا نعم البدل نہیں تھے۔

"مجھے ناشتے اور ٹکٹ کے پیسے بتا دیں۔" اپنا بیگ کھولتے ہوئے وہ اس میں سے ایک چھوٹا والٹ نکال رہی تھی۔

"آپ میری مہمان ہیں۔ مہمانوں سے کون پیسے لیتا ہے۔"

"لیکن میں آپ کی مہمان نہیں بننا چاہتی۔ میں یہاں اپنی مرضی سے گھومنے آئی ہوں۔ اپنا کماتی ہوں تو اپنا خرچا اٹھا سکتی ہوں۔"

"لیکن ہمارے ہاں مہمان اور وہ بھی خواتین سے خرچا لینا معیوب سمجھا جاتا ہے۔ اس لیے آپ یہ سب رہنے دیں۔"

"تم اچھے گائیڈ ہو جو گھما بھی رہے ہو اور کھلا بھی رہے ہو۔ ایسی ہی سخاوت دکھاتے رہے تو جلد کنگال ہو جاؤ گے۔"

"یہ سخاوت ہر کسی کے لیے نہیں ہوتی۔ پاکستانی مہمان کی تو بات ہی الگ ہے۔"

زاشا نے ایک گہری سانس لیتے جیسے بحث کو سمیٹا اور والٹ واپس رکھ دیا۔ یہ طے تھا کہ وہ اس سے پیسے نہیں لینے والا۔

"کیا جاب کرتی ہیں آپ......؟" اب وہ کافی اور سینڈوچ کھاتے ہوئے اس کی نوکری کی نوعیت جاننا چاہ رہا تھا۔ وین میں بیٹھ کر وہ جس خوف کا شکار ہوئی تھی وہ کب کا اڑن چھو ہو چکا تھا بلکہ اب تو اسے اپنی سوچ کے بارے میں سوچ کر اس کے احمقانہ ہونے پہ افسوس ہو رہا تھا۔ وہ بھلے پاکستانی تھا لیکن وہ ترکوں کا خون بھی رکھتا تھا جو بے حد مہمان نواز قوم ہیں۔

"میں ایک فرٹیلائزر کمپنی کے فنانس ڈپارٹمنٹ میں ہوں۔" اس نے آسان الفاظ میں وہ اسے اپنی جاب کے بارے میں بتایا۔

زاشا کھڑکی سے باہر سمندر کی لہروں کو دیکھنے لگی۔ یہ کسی بھی سمندری سفر کا پہلا تجربہ تھا۔ پاکستان میں رہ کر بھی وہ کبھی کراچی نہیں گئی تھی۔ پانی کا بہت بڑا ذخیرہ اس نے بس ڈیمز کی صورت ہی دیکھا تھا جس میں ننھی منی کشتیاں ایک خاص حد تک جاتی تھیں۔

"مشکل جاب ہو گی جس کے لیے آپ کو دوسرے ملک ٹریننگ کے لیے بھیجا جاتا ہے۔ ہمارے ہاں عورتوں کی ایسی جاب کو پسند نہیں کیا جاتا جس میں وہ دوسرے ملک اتنے عرصے کے لیے قیام کریں۔" وہ مخصوص سوچ کا ذکر کر رہا تھا اور ٹھیک کہہ رہا تھا۔

"ہمم......لیکن میری مجبوری ہے کیونکہ میں اپنے گھر کی واحد کفیل ہوں۔" بلال کچھ دیر متامل ہوا۔ "آپ کے فادر......؟"

"فوت ہو چکے ہیں۔" بلال اس کے جملے پہ معذرت کر رہا تھا اور وہ سوچ رہی تھی۔

"اگر وہ فوت نہ ہوئے ہوتے تو ایک دن میرے ہاتھوں فوت ہو چکے ہوتے۔ اچھا ہی ہوا کہ ان کی موت کا گناہ میرے سر نہیں آیا۔" ایسی بات وہ سوچ ہی سکتی تھی۔ اتنی کڑوی بات تو وہ کبھی ماں کے سامنے بھی نہیں کہہ سکتی تھی جن کے سامنے وہ اپنا سارا زہر اگلا کرتی تھی۔

"میری ممی بھی پی ایچ ڈی ہیں۔ ایک یونیورسٹی میں پروفیسر تھیں۔"

زاشا نے بہت مرعوب ہو کر اسے دیکھا۔ خود اس کی اپنی ماں میٹرک پاس تھیں لیکن اس کے باوجود ساری عمر انہوں نے محنت کر کے اسے پالا تھا۔ کبھی کبھار وہ سوچتی کہ ماں محنتی نہ ہوتیں تو کیا ہوتا......؟

"والد سے جب ان کا رشتہ طے ہوا تو وہ محض ماسٹرز تھیں اور پھر شادی کے بعد ہی انہوں نے پی ایچ ڈی مکمل کی۔" یہ بات پہلے سے بھی زیادہ متاثر کن تھی۔

"انہیں یقیناً فیملی کی سپورٹ رہی ہو گی۔"

اسے ہمیشہ سے یہی لگتا تھا کہ ترقی اور پڑھائی وہی عورتیں کر سکتی ہیں جن کے خاندان ان کی مکمل طور سے حمایت کرتے ہوں، ان کے لیے سازگار حالات

پیدا کریں۔

اس کی بات پہ وہ ہولے سے ہنسا۔

"فیملی کی نہیں......بس والد کی......والد اور ممی کی لو میرج ہے۔ میرے والد جب ترکی روزگار کے لیے آئے تھے تو ان کی ملاقات ممی سے بورصہ میں ہوئی تھی جہاں میرے نانا کا ایک مقامی ریسٹورنٹ ہے۔ ممی وہیں نانا کے ساتھ ٹورسٹ گائیڈ کی خدمات سرانجام دیتی تھیں۔ والد کے لیے بھی وہ گائیڈ بنیں اور پھر وہ گائیڈ انہیں اتنا پسند آ گیا کہ انہیں پارٹنر بنا لیا۔"

اپنی بات کے اختتام تک وہ ہنس دیا تو زاشا بھی مسکرا دی۔ اس کا ناشتا ختم ہو چکا تھا جبکہ وہ ابھی تک کھا رہا تھا۔ وہ باتیں زیادہ کر رہا تھا اور منہ کم چلا رہا تھا۔

"والد کو جلد ہی پاکستان واپس جانا پڑا تھا۔ دادی کی طبیعت خراب رہنے لگی تھی اور وہاں وہ اکیلی رہتی تھیں۔ میرے دادا کئی سال پہلے ہی دادی اور والد کو گھر سے نکال چکے تھے۔ وہ بیوی اور بیٹے کی ذمہ داری نہیں اٹھانا چاہتے تھے اسی لیے یہ ذمہ داری میرے والد نے خود اٹھائی۔ اسی ذمہ داری کو اٹھانے کے لیے انہیں اپنی پڑھائی کو بھی چھوڑنا پڑا۔ لیکن دادا کے اس فیصلے نے ان سے ایک فیصلہ ضرور کروا لیا کہ وہ اپنے بیوی بچوں کا خرچا ہمیشہ خود اٹھائیں گے۔ والد کم پڑھے لکھے تھے لیکن ایک شاندار شوہر اور بہت مہربان باپ ثابت ہوئے۔ دادی کی وفات کے بعد وہ ممی کو واپس ترکی لے آئے تھے۔ ممی نے یہیں سے مزید پڑھنے کی خواہش ظاہر کی تب تک میرا بڑا بھائی اسامہ بھی اس دنیا میں آ چکا تھا۔ ممی نے استنبول میں رہ کر پی ایچ ڈی شروع کی، والد کی نوکری انقرہ میں تھی جبکہ اسامہ ماں کے ساتھ ہی رہا۔ ماں پڑھنے کے ساتھ اسامہ کو بھی دیکھتی تھیں۔ بورصہ سے ہی ایک لڑکی بلوا لی گئی جو دن بھر بھائی کا خیال رکھتی اور ماں پڑھتی رہتیں۔ لیکن ماں کے یہ سارے اخراجات والد نے خود اٹھائے۔ ماں نے صرف یکسوئی سے پڑھائی کی۔ والد انقرہ میں دو نوکریاں کرتے تھے تاکہ ماں کو کوئی مسئلہ نہ ہو۔ پی ایچ ڈی کے دوران ہی میں بھی پیدا ہو گیا۔ اب دو بچے تھے اور ماں تھیں۔ ساتھ ہی ماں کو یونیورسٹی میں ہی نوکری بھی مل گئی۔ والد نے منع کر دیا کہ وہ تیسری نوکری کر لیں گے لیکن ماں خود پہ زیادہ ذمہ داریاں نہ ڈالیں۔ وہ پہلے ہی پڑھائی اور دو بچوں کے ساتھ ایک مشکل زندگی گزار رہی تھیں۔ آسان زندگی تو والد کی بھی نہیں تھی لیکن انہیں لگتا تھا کہ وہ بس کمانے کا کام کر رہے ہیں جبکہ ماں ایک ساتھ کئی کام کر رہی ہیں۔ یوں ماں نے ہمیں پالا اور پڑھائی کی بس۔ کمانے کی ذمہ داری مکمل طور سے والد نے اٹھائی۔" زاشا نے اس کی ماں اور والد کی کہانی کو کسی داستان الف لیلا کی مانند سنا تھا۔

"کیا دنیا میں اتنے اچھے والد بھی ہوتے ہیں جن کا ذکر اتنے فخر، خوشی اور محبت سے کیا جائے۔؟ اگر اتنے اچھے والد موجود ہوتے ہیں تو خدا نے ایک میرے حصے میں کیوں نہیں لکھ دیے" خود سے سوال کرتے اس کی آنکھوں میں پل بھر کو نمی اتری تو اس نے سمندر کے پانیوں کو دیکھتے اپنا پانی ان کے حوالے کر دیا۔ اس تکلیف دہ موضوع کو سننا ہمیشہ سے اسے ایسے ہی رلاتا تھا۔

"ممی نے ہمیشہ بہت شاندار جاب کی ہے لیکن اپنی مرضی سے۔ والد نے کبھی بھی ان سے گھر کا خرچ چلانے کو نہیں کہا اور نہ ہی ممی نے چلایا۔ جب ہم اسکول جاتے تھے تو ممی یونیورسٹی جاتی تھیں۔ جب ہم کچھ بڑے ہوئے اور ممی کو لگا کہ وہ اب تھکنے لگی ہیں تو انہوں نے وہ نوکری چھوڑ دی۔ ممی ہمیشہ والد سے زیادہ امیر رہی ہیں، نانا کی جائیداد میں سے بھی ایک مناسب حصہ انہیں ملا کہ ممی نے یہاں بورصہ میں اپنا گھر خرید لیا لیکن والد نے انہیں پھر بھی باقاعدگی سے جیب خرچ دیا کہ یہ ان کا بنیادی حق تھا۔"

وہ باہر ہی دیکھ رہی تھی۔ اپنے آنسو چھپانے کے لیے یہ ضروری تھا۔

"شاید میرے والدین کی کہانی آپ کو بور کر رہی ہے لیکن میں ایسے ہی ہر جگہ ہر کسی کے سامنے ان کے گن گانے لگتا ہوں۔" زاشا نے جبراً مسکراتے ہوئے رخ اس کی طرف کیا۔

"بالکل بھی نہیں۔ میں بس یہ سوچ رہی تھی کہ دنیا میں ایسے مرد بھی ہوتے ہیں......؟"

"بالکل ہوتے ہیں۔"

"حیرت ہے۔ کیونکہ مجھے ایک بھی نہیں ملا۔"

"اپنے لیے......؟"

اس کے سوال پہ وہ کچھ گڑبڑائی۔ اس کے گال لال پڑے۔

"اپنے سے جڑی کسی بھی عورت کے لیے......"

بلال نے کچھ تعجب سے اسے دیکھا جس کے چہرے پہ گہری سوچ کنندہ تھی۔ وہ کچھ پوچھنا چاہتا تھا لیکن چپ ہی رہا۔

"خیر، میرا بھائی بالکل ایسا نہیں ہے۔ اس کی بیوی جاب کرتی ہے کیونکہ وہ اس سے جاب کرواتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ اس دور میں دو لوگوں کے جاب کیے بنا گزارہ نہیں ہوسکتا......" اس نے بھائی کی سوچ پہ ایک گہری سانس بھری۔ "اور اس گزارے میں اس کے بچے کتنا سفر کر رہے ہیں، بھابھی کی صحت کتنا سفر کر رہی ہے، ان کا تعلق کتنا سفر کر رہا ہے وہ نہیں دیکھنا چاہتا بلکہ وہ سننا بھی نہیں چاہتا۔ وہ بس اس رقم کو دیکھتا ہے جو ہر ماہ اس کے گھر میں آتی ہے۔ ہر ماہ بڑھنے والی آسائشات اس کی نظروں سے ہٹیں تو وہ کچھ اور دیکھ بھی سکے۔ شاید زندگی اس نے آسائشات کا دوسرا نام سمجھ لیا ہے جس کے بدلے وہ سب کچھ قربان کرنے کے لیے تیار ہے۔ ممی اور والد کو اس کی تربیت پہ بھی کبھار شک ہونے لگتا ہے کہ ان سے کوئی چوک ہوگئی جو وہ ایسا ہے۔ لیکن بس وہ ایسا ہی ہے۔" دکھ اور تاسف سے ایک اور گہری سانس خارج کرتے اس نے پہلو بدلا۔

"لیکن میں ایسا گھر نہیں بنانا چاہتا۔ میرے سامنے میرے دادا، میرے والد اور میرے بھائی کی صورت تین مردوں کی مثال موجود ہے۔ ایک وہ جو بیوی بچوں کی ذمہ داری نہیں اٹھانا چاہتا تھا، ایک وہ جو مکمل طور سے بیوی بچوں کی ذمہ داری اٹھاتا رہا ہے اور ایک وہ جس نے اپنا بوجھ آدھا اپنے بیوی کے کندھوں پہ بھی ڈال رکھا ہے...... میں ایسا گھر بنانا چاہتا ہوں جیسا میرے والد اور ممی نے بنایا کیونکہ مجھے ان تینوں گھروں میں سے وہی گھر زیادہ آسودہ دکھائی دیا جہاں گھر کی عورت آسودہ رہی۔"

زاشا کا رخ کھڑکی کی طرف ہی تھا۔ یہ دکھانے کو کہ وہ سمندر کے پانی میں گم ہے، درحقیقت وہ اپنی آنکھ کا پانی اس سے چھپا رہی تھی۔

"والد کہتے ہیں کہ عورت بھلے بلین ایئر ہی کیوں نہ ہو، نان نفقہ کی ذمہ داری شوہر کے سر ہی ہونی چاہیے کیونکہ اللہ نے یہ ذمہ داری اس کے سر ڈالی ہے۔ اس ذمہ داری کو اٹھانے کے قابل بنایا ہے۔ اپنی ذمہ داری وہ کیوں بیوی کے سر ڈالنے کی کوشش کرتا ہے جبکہ وہ پہلے ہی کتنی ذمہ داریاں اکیلے اٹھا رہی ہوتی ہے اور ان ذمہ داریوں میں شوہر اس کا ساتھ نہیں دیتا۔" زاشا کتنی دیر اسے دیکھتی رہی۔ ابھی وہ کہہ رہی تھی کہ اس نے کبھی ایسا مرد نہیں دیکھا اور ابھی ہی اس کے سامنے ایسی سوچ کا مرد بیٹھا تھا جو اسے حیران کر رہا تھا۔ وہ پچھلی رات اس سے جب ملی تو ہر بات پہ دانتوں کی نمائش کرتے ہوئے وہ بالکل بونگا سا انسان لگا تھا۔ لیکن لوگ عموماً وہ نہیں ہوتے جو پہلی ملاقات میں نظر آتے ہیں۔ جو یہ کہتا ہے کہ پہلی ملاقات کا تاثر ہی آخری تاثر ہوتا ہے، وہ غلط ہے۔

ایک خاموشی دونوں طرف قائم ہوگئی۔ بلال اٹھ کر ہال میں چلنے پھرنے لگا تھا۔ وہ اپنی جگہ خاموشی سے بیٹھی کھڑکی سے باہر دیکھتی رہی۔ اس کا دل بوجھل ہوگیا تھا اور وہ کچھ دیر اکیلی بیٹھنا چاہتی تھی۔ بلال نے اسے ایسا موقع دیا تھا جس میں خود کو نارمل کرسکتی تھی۔ کچھ دیر بعد بلال نشست پہ واپس آگیا

تھا۔ تب تک وہ خود کو نارمل کر چکی تھی۔

"بورصہ پہنچتے ہی والے ہیں۔ آج میں آپ کو اپنے نانا کے ریستوران بھی لے جاؤں گا۔"

"تو آپ اپنے نانا سے ملنے آ رہے تھے اور مجھے بھی ساتھ لے آئے۔" وہ اس کی چالاکی پہ اس کی کھچائی کر رہی تھی۔ وہ مسکرا رہا تھا۔

"ممی بھی وہیں ہوتی ہیں۔ دراصل میں تو ممی سے ملنے آیا ہوں۔ کھانا ہم نانا کے ریستوران میں کھائیں گے۔ وہاں کا تندوری چکن بہت لاجواب ہوتا ہے۔" وہ اپنا بیگ دیکھ رہی تھی۔ چیزیں چیک کر رہی تھی۔ ساحل قریب آ رہا تھا۔

جہاز رک گیا تو وہ دونوں پورٹ پہ اترے۔ وہاں ایک وین والا ان کا منتظر تھا۔ بلال اب بھی ڈرائیور کے ساتھ والی نشست پہ بیٹھا تھا۔ اس بار پورٹ سے دو اور جوڑے بھی وین پہ سوار ہوئے تھے جنہیں بورصہ چیئر لفٹ تک جانا تھا۔ بلال نے بتایا تھا کہ یہ جوڑے گھوم پھر کر جب لنچ کے لیے رکیں گے تو قیام اس کے نانا کے ریستوان میں ہی ہوگا۔ وین دراصل اسی ٹریول ایجنسی کی تھی جن کے ساتھ بلال کے والد کام کرتے تھے۔ اسی مناسبت سے وہ نانا کے ریستوران پہ کچھ رعایت پہ لنچ بھی کروا دیا کرتے جس سے ان کا گاہک بھی خوش اور نانا کا ریستوران بھی آباد۔

وہ خاموشی سے سارا رستہ باہر دیکھتی رہی۔ شروع میں وہ ایک خوب صورت شہر جیسا تھا۔ پرسکون سا شہر۔ وین ایک بڑے سے درخت سے کچھ فاصلے پہ رکی تھی جس کے بارے میں بلال بتا رہا تھا کہ وہ انکا پلین ٹری چھ سو سال پرانا درخت تھا۔ یہ ایک چھتری کی مانند پھیلا ہوا درخت تھا، جس کی پھیلی شاخوں کے نیچے قریباً پچیس سے تیس میزیں بمعہ کرسیوں کے رکھی ہوئی تھیں جن پہ گاہک بیٹھے ہوئے تھے۔ قریب میں کچھ دکانیں تھیں جہاں تازہ پھل دستیاب تھا۔ نیچے ایک طرف جاتی سیڑھیوں سے اتر کر وہ آئی تو قریب میں ایک مصنوعی آبشار بھی

جس کے سامنے کھڑے ہو کر وہ اپنی تصاویر لینے لگی۔ ساتھ ہی کچھ جھونپڑی نما دکانیں بنائی گئی تھیں جہاں مقامی خواتین و مرد چھوٹی موٹی اشیاء فروخت کر رہے تھے۔ آدھے گھنٹے کے اس قیام میں اسے وہاں کی ہر شے نے مسحور کیا تھا۔ سب سے زیادہ وہاں کی صاف چھوٹی گلیوں نے جو پتھروں کی بنی تھیں لیکن بالکل صاف ستھری تھیں۔

وہاں سے وین الوداغ پہاڑ کی طرف جا رہی تھی جہاں پہ برف باری میں چیئر لفٹ موجود تھی اور آنے والوں سیاحوں کی توجہ کا مرکز بھی۔

"میں چیئر لفٹ میں بیٹھنے میں بالکل دلچسپی نہیں رکھتی۔ مجھے ہائٹ فوبیا ہے۔ اسی لیے ہم کہیں اور چلتے ہیں۔" زاشا نے اپنی مشکل بیان کی تو بلال نے اس کا توڑ بھی سوچ لیا۔

"تو ہم رستے میں نانا کے ریسٹورنٹ اتر جاتے ہیں۔ وہیں قریب ہی ممی کا گھر بھی ہے......"

وین جہاں رکوائی گئی وہاں اردگرد خوب صورت جنگل تھا۔ ایک طرف نانا کا ریستوران تھا اور سڑک کے دوسری طرف لکڑی کی باڑ کے پار لکڑی کے بنے خوب صورت چھوٹے گھر تھے۔ اس کے لیے تو یہ منظر بھی اس قدر حسین تھا کہ وہ کتنی ہی دیر اسے ہی دیکھتی رہی۔ وین چلی گئی تو بلال اس کے پاس چلا آیا۔

"اس جگہ پہ گھر......" واؤ کے انداز میں اس نے ہونٹ سکوڑے۔

"تم کسی جنت میں ہی رہتے ہو۔ یقیناً جنت اتنی ہی حسین اور خوب صورت ہوگی۔" اس نے مڑ کر بلال کو دیکھا۔

"میں تو پاکستان میں رہتا ہوں۔" اس نے شانے اچکائے۔

"یہاں بھی تو تمہارا ہی گھر ہے۔"

"ممی کا گھر......" اس نے جھٹ تصحیح کی۔

"ایک ہی بات ہوئی...... ممی بھی تمہاری ہی ہیں۔"

"میں بس اسی چیز کو اپنی مانتا ہوں جو میں نے

اپنے ہاتھوں سے کمائی ہو......" وہ اب اسے ریستوران چلنے کی پیشکش کر رہا تھا لیکن وہ وہیں سامنے لکڑی کے بینچ پہ بیٹھنے کی خواہش مند تھی۔ بلال نے شانے اچکاتے اس کا ساتھ دیا۔

"تو یہاں سے کتنی دور ہے تمہاری ممی کا گھر......؟" وہ موبائل سے کھٹا کھٹ مناظر کی تصاویر اتار رہی تھی لیکن تصاویر میں وہ جگہ اس کی آدھی بھی دکھائی نہیں دے رہی تھی جتنی اصل میں تھی۔

"پانچ منٹ کی واک پہ......"

"تو ہم نانا کے ریستوران میں کھانا کیوں کھائیں......تمہارے گھر......" سر نفی میں ہلاتے اس نے تصحیح کی۔ "میرا مطلب تمہاری ممی کے گھر کیوں نہ کھائیں؟" وہ کچھ حیرت سے چونکا۔

"آپ گھر پہ کھانا کھائیں گی......؟"

"اگر تمہاری ممی پاکستانی روٹی بنانا جانتی ہیں تو ہاں کیوں نہیں......؟" اس وقت اسے شدت سے ماں کے ہاتھ کا بنایا کھانا یاد آ رہا تھا اور وہ کسی ماں کے بنائے کھانے کی ہی خواہش مند تھی۔

"ممی ترکش اور پاکستانی دونوں طرح کے کھانے بنانا جانتی ہیں۔ ہمارے گھر میں شروع سے ہی ایک دن ترکش اور دو دن پاکستانی کھانا بنا کرتا تھا کیونکہ والد پاکستانی کھانا زیادہ شوق سے کھاتے تھے۔ اور جس روٹی کی آپ بات کر رہی ہیں وہی تینوں وقت ہمارے دسترخوان پہ کھائی جاتی ہے۔"

"تو بس پھر آج ہم آپ کے ممی کے مہمان بنیں گے۔"

"ڈن......" کچھ دیر وہ وہیں لکڑی کے بنے بینچوں پہ بیٹھی رہی۔

بلال سڑک پار کر کے ریستوران چلا گیا۔ نانا تو اب وفات پا چکے تھے لیکن ان کی جگہ اب ریستوران میں ماموں اور ممانی ہوتے تھے۔ ریستوران کے پیچھے سے ہی ایک دروازہ نکلتا تھا جو سیدھا ان کے گھر کی طرف جاتا تھا۔ پچھلے دروازے سے نکل کر جو بھی کچا حصہ تھا وہاں ایک مختصر سا کچن گارڈن بنایا گیا تھا جہاں سے ریستوران کے لیے تازہ سبزیاں توڑی جاتی تھیں۔

اسے وہاں بیٹھے خاصا وقت ہو چکا تھا جب بلال اپنے ماموں کے ساتھ ایک ہاتھ میں چھوٹی سی تھالی اٹھائے چلا آ رہا تھا۔

ماموں بہت پرجوش سے ترکی زبان میں اسے خوش آمدید کہہ رہے تھے جس کا ترجمہ بلال کر رہا تھا۔

"ماموں نے جب سنا کہ میرے ساتھ پاکستانی مہمان خاتون آئی ہیں تو انہوں نے اپنے ریستوران کے مشہور کباب بنا کر آپ کے لیے لائے ہیں۔ اب آپ چاہیں تو یہیں بیٹھ کر اسے کھا سکتی ہیں اور چاہیں تو ریستوران چل سکتی ہیں۔"

"بہت شکریہ۔ مگر اس کی ضرورت نہیں تھی۔ ہم گھر جا کر لنچ کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔" اس نے اپنی زبان میں ہی کہا جسے بلال نے ترکی زبان میں ترجمہ کر دیا۔ ماموں اس کی بات سن کر کہہ رہے تھے کہ ان کے ہاں مہمان کھائے بے بنا نہیں جاتے اس لیے وہ یہ چھوٹی سی دعوت قبول کر لیں۔

زاشا نے ایک بار پھر سے شکریہ ادا کیا۔

ماموں ہاتھ ہلاتے سڑک پار کرتے چلے گئے۔

وہ دونوں وہیں بینچ پہ بیٹھ کر کباب کھانے لگے۔ کباب واقعی مزیدار تھے۔ زاشا جب سے وہاں آئی تھی یہ پہلی مزیدار چیز اس نے کھائی تھی۔

کھانا کھاتے ہوئے یکدم بلال کو دیکھتے جیسے اس پاکستانی اداکار کا نام یاد آ گیا۔

"مجھے یاد آ گیا کہ تمہاری شکل کس پاکستانی اداکار سے ملتی ہے۔" بلال نے کھاتے ہوئے سر اٹھا کر اسے دیکھا۔

"یقیناً آپ فواد خان کہنا چاہتی ہوں گی۔"

"اس جیسی رنگت تو ہے لیکن اسٹائل اور نقوش واسع چوہدری جیسے ہیں۔"

"لاحول ولاقوۃ۔"

زاشا نے بہ مشکل ہنسی کو دبایا۔

"اتنا برا تو نہیں ہوں میں...... شاید اس جیسی بونگی حرکتیں کرتا ہوں گا لیکن اب اتنا بھی ظلم نہ کریں کہ سیدھا سیدھا اس سے ملا دیا۔"

"پہلی نظر میں ہی مجھے دیکھ کر یہی لگا۔ بس اس کا نام دیر سے یاد آیا۔"

بلال نے منہ بناتے سر جھٹکا۔ اس نے برا نہیں منایا تھا بس برا منانے کی اداکاری کر رہا تھا۔

"کباب بچ میں بے حد لذیذ ہیں۔" اس کی اس تعریف پہ بلال مسکرا دیا۔ کھانا کھانے کے بعد وہ تھال وہیں چھوڑ کر اٹھ گیا۔

"یہ بہمت لے جائے گا۔ اب ہم چلتے ہیں۔"

وہ دونوں سڑک پار کر کے دوسری طرف پہنچے تو باہر کچھ گاہکوں کو کھانا دیتا ایک نوعمر لڑکا بلال کو دیکھ کر ہاتھ ہلانے لگا۔ بلال نے اسے اپنی زبان میں ہی سمجھا دیا کہ وہ دوسری طرف کے بیچ سے جا کر تھال اٹھا لائے۔

"ممی اکیلی یہاں رہتی ہیں......؟"

"وہ لڑکا بہمت جو ریستوران پہ تھا ممی کے گھر کے اسٹور میں رہتا ہے۔ اس سے ممی اکیلی نہیں پڑتیں اور اسے بھی سر چھپانے کی جگہ مل گئی۔ ویسے تو والد اکثر یہیں ہوتے ہیں لیکن ہم دونوں کام کے سلسلے میں ایک جگہ نہیں رہتے۔ والد اسی لیے اپنا کام مجھے سونپنا چاہتے ہیں تاکہ اب آرام سے ممی کے ساتھ رہ سکیں۔ ساری زندگی کام کے سلسلے میں ان دونوں کا بہت کم وقت ساتھ گزرا ہے۔"

سڑک کے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے وہ دونوں تقریباً پانچ منٹ کے بعد ایک ذیلی رستے پہ اتر گئے۔ اب زاشا کو ان کھیت کھلیانوں میں دور ایک لکڑی کا خوب صورت گھر دکھائی دے رہا تھا۔ یقیناً وہی اس کا گھر تھا۔

"مجھے لگتا ہے کہ ایک ذمہ دار سربراہ بننا دنیا کا مشکل ترین کام ہے۔"

زاشا خاموش رہی۔ وہ اس موضوع کو نہیں چھیڑنا چاہتی تھی لیکن موضوع گھوم پھر کر وہیں آ جاتا تھا جہاں سے وہ بچ کر نکلی تھی۔

"اس کے کاندھوں پہ کئی ذمہ داریاں ہوتی ہیں۔ کئی لوگوں کی ذمہ داریاں، کئی کاموں کی ذمہ داریاں، وہ ساری عمر بھاگ دوڑ میں ہی گزار دیتا ہے۔ کم از کم میں نے تو اپنے والد کو ایسا ہی دیکھا ہے۔"

"سربراہ مرد ہو یا عورت اس کی زندگی ایک سی ہوتی ہے۔ بلکہ عورت سربراہ ہو تو اس کی زندگی زیادہ مشکل ہو جاتی ہے کہ اسے کمانے کے ساتھ گھر کی، بچوں کی بھی تمام ذمہ داریاں خود پوری کرنی ہوتی ہیں۔ بھاگ دوڑ تو اس کی زندگی کا بھی حصہ ہوتی ہے۔ سکون تو اسے بھی نصیب نہیں ہوتا۔" بلال نے سر ہلایا۔ وہ متفق تھا۔

"جیسے کہ میری ماں......" دل میں سوچتے زاشا نے رخ دوسری طرف پھیر لیا۔

"ممی کا نام کیا ہے......؟" موضوع بدل گیا۔

"فیروزہ۔"

زاشا مسکرائی۔

گھر پہنچ کر اس نے دروازہ بجایا۔ ممی نے ہی دروازہ کھولا۔ بانہیں پھیلا کر اسے خود سے لگا لیا۔ دونوں ماں بیٹا زور و شور سے مل رہے تھے۔ اس ویرانے میں ان دونوں کے ملاپ سے جیسے ایک ہنگامہ برپا ہو گیا تھا۔ وہ ایک کونے میں خاموش سی کھڑی دیکھتی رہی۔ یکدم بلال کو یاد آیا۔

"ممی! مہمان آئے ہیں۔" اس نے اردو میں ہی کہا۔ یقیناً وہ اردو بولتی اور سمجھتی تھیں۔

ممی نے اسے بھی اسی طرح پرتپاک انداز میں خوش آمدید کیا جیسے وہ بلال سے ملی تھیں۔ وہ سرخ و سفید رنگت والی ایک خوب صورت خاتون تھیں جنہوں نے بڑا سا عبایا جیسا فراک اور سر پہ اسکارف لپیٹ رکھا تھا۔ اسے وہ پہلی نظر میں ہی اچھی لگی تھیں۔

جس کمرے میں وہ آ کر بیٹھی اس پہ دو اطراف میں دیوار کے ساتھ فرشی کشنز کی بیٹھک بنی تھی۔

سامنے بڑا قالین بچھا تھا۔ دیواروں پہ بھی روایتی دریوں کے چھوٹے ٹکڑوں سے سجاوٹ کی گئی تھی۔ اسے ایسی روایتی آرائش پسند آئی تھی۔

منہ ہاتھ دھو کر جب وہ وہاں آئی تب تک ممی سامنے قالین پہ دسترخوان لگا چکی تھیں۔ دسترخوان پہ کباب، چکن کڑاہی اور سلاد رکھا جا چکا تھا۔ باورچی خانے سے تازہ روٹی پکنے کی مہک آ رہی تھی جو اتنے عرصے میں پہلی بار نتھنوں سے ٹکرائی تھی۔

"میں نے یہاں آنے سے پہلے ممی کو بتا دیا تھا۔ انہوں نے جھٹ پٹ کھانے کا انتظام کر لیا۔" زاشا کو اب سمجھ میں آیا کہ وہ اتنی جلدی سب بنا کر کیسے لے آئی تھیں۔ جب اس نے گھر جانے کی بات کی تھی، بلال ریستوران جا کر یقیناً انہیں فون کر کے آیا تھا۔

روٹیاں ایک تھال میں لپیٹ کر وہ وہاں لائیں تو زاشا کو اپنے گھر جیسا کھانا اور ماحول دیکھ کر بہت سکون ملا تھا۔ کہیں سے انہیں دیکھ کر نہیں لگتا تھا کہ وہ سادہ سی گھریلو عورت پی ایچ ڈی تھیں اور کسی یونیورسٹی میں پروفیسر رہی تھیں۔ ان کے مزاج میں سادگی نمایاں تھی۔

"بلال نے اتنے کم وقت میں بتایا کہ میں زیادہ کچھ نہیں بنا سکی۔ بس جو سادہ کھانا گھر میں بنتا ہے وہی بنایا ہے۔" وہ مہربان سی خاتون نادم ہو رہی تھیں اور انہیں نادم دیکھ کر وہ نادم ہو رہی تھی۔

"میں اتنا نہیں کھاتی آنٹی۔ یہ بہت سارا ہے۔ بس مجھے تو تازہ روٹی کی شدت سے خواہش تھی جو آپ نے پوری کر دی۔"

کھانا بہت لذیذ بنا ہوا تھا۔ وہ واقعی پاکستانی کھانے بنانے میں ماہر تھیں۔

کھانا کھانے کے ساتھ وہ دونوں ماں بیٹا اپنی زبان میں اپنے معاملات پہ بات کرتے رہے تھے۔ زاشا کے سامنے بار بار کھانے کے ڈونگے رکھے جا رہے تھے جس میں سے وہ کبھی ڈال لیتی کبھی شکریہ کے ساتھ لوٹا دیتی۔ بلال کی کوئی کال آئی تو وہ اٹھ کر باہر گیا۔

"پہلی بار یہ کسی لڑکی کو گھر تک لایا ہے......"

زاشا کا منہ تک جاتا ہاتھ رکا۔ وہ شاید غلط سمجھ رہی تھیں۔ شاید ان کے نزدیک وہ اس کی کوئی خاص مہمان تھی۔

"ہم کل ہی ملے تھے۔ بس ایک ہی کامن بات تھی کہ ہم دونوں پاکستانی ہیں۔ میں یہاں اکیلی آئی ہوں اسی لیے مجھے گھمانے کے لیے ساتھ لے آیا۔" وہ ان کو کسی بھی قسم کی خوش فہمی میں مبتلا نہیں کرنا چاہتی تھی اسی لیے سچ سچ بتا دیا۔

"شادی شدہ ہو؟" پھر سے وہ ٹھٹکی۔ گو کہ وہ ان کی خوش فہمی دور کر چکی تھی۔ لیکن وہ پھر بھی اسی قسم کے سوالات کر رہی تھیں۔

"نہیں......" جبراً مسکرا کر جواب دیا۔

اب وہ کھانا کھاتے ہوئے غیر آرام دہ ہو رہی تھی۔ ذاتی نوعیت کے سوالات اسے ایسے ہی پریشان کرتے تھے۔ اسے ڈر تھا کہ اب فیروز آنٹی اس کے خاندان کے بارے میں نہ پوچھنے لگ جائیں۔ وہ بھی جھوٹ نہیں بولتی تھی لیکن اس کے خاندان کا سچ اتنا مکروہ تھا جسے وہ بھی کسی کے سامنے لانا نہیں چاہتی تھی۔

"آپ کھانا بہت اچھا بناتی ہیں۔"

وہ بس مسکرا دیں۔ پھر ان کے مابین اسی قسم کی ہلکی پھلکی گفتگو ہوتی رہی جب تک بلال نہیں آ گیا۔

کھانے کے بعد بلال نے اپنے لیے قہوہ بنوایا اور اس کے لیے کافی لائی گئی۔ کافی بھی ایسی تھی کہ کسی مہنگے پاکستانی ریستوران میں بیٹھ کر پی جا رہی ہو۔

"ترکی میں کتنا وقت مزید ہو؟"

"دو ہفتے۔ ایک گزر گیا۔ ایک ہی رہتا ہے۔"

"اور جو رہتا ہے اس میں جتنا ممکن ہو سکا میں انہیں گھماؤں گا۔ افسوس رہے گا کہ استنبول ہی گھوما جا سکتا ہے کیونکہ صبح سے شام یہ اپنی ٹریننگ میں مصروف ہوتی ہیں۔" بیٹے کی بات پہ وہ ہنس دیں۔

"یہ ہمیشہ سے مہمان نواز رہا ہے۔ جب بھی

ہمارے گھر کوئی آ جائے یہ اپنی ساری مصروفیات چھوڑ کر اس کو وقت دیتا ہے۔ اسے گھمانے لے جاتا ہے۔ اس پہ اپنی ساری جمع پونجی لگا دیتا ہے۔ ایک بار احمد کے ایک بہت پرانے دوست آئے۔ میں اس وقت کسی کام سے انقرہ میں تھی تو اس نے ان کے لیے کوکنگ تک کی اور پہلی بار مجھے علم ہوا کہ اللہ نے مجھے بیٹے کے روپ میں ایک سگھڑ بیٹی دی ہے۔"

وہ قہوہ پیتے ہوئے قہقہہ لگا کر ہنس دیا۔ "مہمان نوازی مجھے والد سے ملی ہے۔" انہوں نے محبت پاش نظروں سے بیٹے کو دیکھا۔

"اس بیٹے نے مجھ سے اور اپنے باپ سے سب اچھی عادات لے لی ہیں اور دوسرے نے کچھ بھی نہیں لیا۔" ایسا کہتے ان کا لہجہ دکھی تھا۔ بلال بھی کچھ سنجیدہ سا ہو گیا۔ ماحول گمبھیر ہو گیا تو زاشا کو بولنا پڑا۔

"آپ نے سب کچھ بہت اچھا بتایا ہے۔ آپ چاہیں تو اپنے قادر کی طرح ایک ریستوران کھول سکتی ہیں۔" اس کی بات پہ وہ بھرپور مسکرا دیں۔

"اب اتنی ہمت نہیں کہ پورا ریستوران کھولا جائے۔ لیکن والد کے ریستوران میں ایک اسپیشل ڈش میں بنا کر بھجواتی ہوں۔ اکیلی گھر پہ رہتی ہوں تو ایسی مصروفیات مجھے رکھنا پڑتی ہیں جن سے مجھے بوریت محسوس نہ ہو۔" اس بات پہ وہ اسے بالکل ماں جیسی لگی تھیں۔

☆☆☆

واپسی پہ اسی وین نے انہیں ریستوران سے لیا تھا جہاں باقی سیاحوں نے کھانا کھایا تھا۔ جاتے ہوئے فیروز آنٹی نے اسے ایک پیارا سا لیمپ دیا تھا جو ترکی میں اسے جابجا مختلف رنگوں میں دکھائی دیا تھا۔ وہ وہاں کی مخصوص سوغات مانی جاتی تھی۔ زاشا ان کے گلے لگی تو دیر تک لگی رہی۔

"میں پاکستان آئی تو تمہارے گھر ضرور آؤں گی۔" وہ پھیکا سا مسکرا دی۔ اس کے پاس خاندان کے نام پہ بس ایک ماں ہی تو تھی۔ وہ انہیں کیا بتاتی کہ ان کی مکمل فیملی جیسی فیملی اس کی کبھی نہیں رہی۔

وین میں وہ خاموش تھی۔ بس ان کی فیملی کے بارے میں سوچ رہی تھی۔

"دنیا میں آئیڈیل چیز کچھ نہیں ہوتی۔ ہر شے میں کچھ نہ کچھ کمی رہ ہی جاتی ہے۔ اتنے خوب صورت خاندان میں بلال کا بھائی کہیں نہ کہیں ایک ایسا تکلیف دہ کانٹا ہے جو گھر کے ہر فرد کے پاؤں میں کاٹ رہا ہے۔ جسے وہ نکال کر پھینک بھی نہیں سکتے۔ وہ جب تک موجود رہے گا، چبھتا ہی رہے گا...... بالکل ابا کی طرح......"

فیری میں سوار ہوتے ہی اسے نیند آ گئی تو وہ شیشے کے سہارے سر ٹکا کر سو گئی۔ پورٹ آنے پہ بلال نے ہی اسے جگایا تھا۔

"واپسی پہ بہت خاموش ہیں آپ...... زیادہ تھک گئی ہیں۔"

"شاید...... مجھے اس طرح سفر کی عادت نہیں ہے۔ کمپنی کے بھیجے گئے ان ٹورز کے علاوہ میں نے کبھی ایک شہر سے دوسرے شہر تک کا سفر نہیں کیا۔"

بلال اس کی بات پہ کچھ حیران ہوا لیکن اس نے اس کا اظہار نہیں کیا۔ پھر وین پہ ہی وہ اسے ہوٹل تک چھوڑ گیا تھا۔ اسے کسی ضروری کام سے کہیں جانا تھا اسی لیے وہ اسی وین پہ چلا گیا تو وہ اندر آ گئی۔

رات بستر پہ لیٹتے ہی کچھ عجیب سی کیفیت تھی۔ وہ کچھ سوچنا نہیں چاہتی تھی لیکن سوچ رہی تھی۔ اپنے باپ اور ماں کے بارے میں...... اپنی زندگی کے بارے میں...... ایک ایسے تکلیف دہ پہلو کے بارے میں جو اس کے اندر پھانس جیسا تھا اور وہ ہر کسی سے چھپا لینا چاہتی تھی۔

☆☆☆

زاشا کی زندگی میں جتنی بھی یادداشت تھی اس میں گھر میں افلاس ہی دکھائی دیتا تھا۔ رفیعہ بانو کولہو کا بیل بنی پہلے پورا دن ایک اسکول میں نان چنے کا ڈھابا چلاتی تھیں جس میں بسکٹ، چپس، ٹافیاں بھی رکھی ہوتیں۔ اسکول سے واپس آ کر گھر کے کام سمیٹتے

وہ کچھ محلے کے بچوں کو ٹیوشن دیتیں تا کہ چند پیسے ہاتھ آسکیں۔ پھر رات تک سارے کام ختم کر کے وہ کپڑے سلائی کرنے بیٹھ جاتیں جو آس پڑوس کی عورتیں کم دام دینے کی لالچ میں انہیں دے جاتیں اور وہ چند دام مل جانے کے لالچ میں سینے بیٹھ جاتیں۔ ان کے لیے زندگی بس اپنی اور اپنی بچی کی ضروریات پوری کرنے کا نام تھا لیکن اس سب سے بڑا محاذ اپنی آمدنی کو اپنے نکھے، آوارہ اور نشئی شوہر سے بچا کر رکھنا تھا جو پورا دن گھر سے غائب رہتا...... کبھی دنوں اور کبھی ہفتوں...... اور جب آتا تو مار پیٹ، گالم گلوچ کر کے ان سے یا تو پیسے کھینچ کر لے جاتا یا گھر کی کوئی آدھی پونی چیز جسے بیچ کر وہ اپنا نشہ پورا کر سکے۔

ابا شروع سے ایسے نہیں تھے۔ جب ماں اور ابا کی شادی ہوئی تھی تو ابا ایک مقامی اسکول میں چوکیدار تھے۔ آمدنی کم تھی تو ماں نے آمدنی بڑھانے کے لیے ہی اسی اسکول میں ڈھابا لگانا شروع کیا تھا۔ ابا نے جب دیکھا کہ گھر کا خرچا تو ماں بھی چلا سکتی ہے تو انہوں نے چوکیدار کی نوکری چھوڑ دی۔ ان سے گرمی میں پورا دن گیٹ پہ نہیں بیٹھا جاتا تھا۔ سارا دن گھر رہ کر ابا کو فارغ رہنے اور ماں کی کمائی کی ایسی عادت پڑی کہ پھر وہ نوکری کرنا ہی نہیں چاہتے تھے۔ ایسے میں کچھ آوارہ مزاج دوستوں کا ساتھ بھی میسر آگیا تو ابا کو نشے کی لت بھی پڑ گئی۔ وہاں سے ماں اور اس کی زندگی پھر ایسی تنگ ہوئی کہ سانس تک لینا محال لگنے لگا تھا۔

''ابا ہمیں مارتے کیوں ہیں؟'' پانچ سال کی عمر میں زمین پہ بیٹھی، زخم سہلاتی، روتی ہوئی ماں سے اس نے یہ سوال کیا تو ماں نے اسے گلے سے لگا کر بھینچ لیا۔

وہ اس بچی کو کیا بتاتیں کہ اس کے ابا انہیں کیوں مارتے ہیں؟ ایسی کسی بات کا ان کے پاس جواب صرف یہی تھا کہ ان کے نصیب میں مار کھانا تھا...... کبھی نصیب کی کبھی شوہر کی۔

زاشا ان کی واحد اولاد تھی اور اس کی تربیت وہ میٹرک پاس خاتون بہت اچھے طور سے کرنا چاہتی تھیں لیکن جب باپ ایسا ہو تو ماں کتنی بھی محنت کر لے، کچھ نہ کچھ، تھوڑی کمی رہ ہی جاتی ہے۔ زاشا کو پڑھائے سب اسباق وہیں رد ہو جاتے جب اس کا باپ آ کر سو کو صفر میں بدل دیتا۔ جس اسکول میں وہ ڈھابا چلاتی تھیں اسی اسکول میں زاشا کو داخل کروا دیا۔ اپنے ساتھ تو وہ اسے ہمیشہ سے ہی رکھتی تھیں کہ گھر پہ اس کا خیال کون کرتا، الٹا نشئی باپ کہیں کسی جگہ جا کر بیچ ہی دیتا تو وہ کیا کرتیں......؟ ساری مار وہ اسی کے لیے کھاتی تھیں، پورا دن محنت اسی کے لیے کرتی تھیں، اپنی جان اسی کے لیے ہلکان کیے رکھتیں۔ اسے بھی گنوا دیتیں تو کہاں جاتیں۔

''تم نے بہت سارا پڑھنا ہے تا کہ اپنی ماں جیسی زندگی نہ گزارو۔'' اسکول سے گھر جاتے ہمیشہ وہ اسے یہی تلقین کرتیں جسے وہ ہر روز اپنے پلو سے باندھ لیتی۔ محنت تو اسے یوں بھی ماں کی طرف سے گھٹی میں ملی تھی۔ سارا دن کرنے کو تو کچھ ہوتا نہیں تھا اسی لیے کتابیں کھول کر ہی پڑھتی رہتی۔

جب ابا گھر آتے تو وہ اپنے اور ماں کے کمرے میں جا کر چھپ جاتی۔ کسی چارپائی کے نیچے، بڑی پیٹی کے پیچھے۔ ابا اور ماں نے ڈر سے اسے بچائے رکھے۔ وہ گھٹ گھٹ کر روتی، کانپنے لگ جاتی۔ اپنا آپ تو وہ چھپ کر بچا لیا کرتی لیکن ماں کو نہیں بچا پاتی تھی۔

''ماں! ابا آپ سے پیسے مانگتے ہیں تو آپ انہیں پیسے دے کیوں نہیں دیتیں......؟''

''میں اسے پیسے دیتی ہوں تو بھی وہ مجھے مارتا ہی ہے کیونکہ اسے مزید پیسے چاہیے ہوتے ہیں۔ میں اسے پالنے کے لیے تو نہیں کماتی کہ ساری رقم اسے تھما دوں۔'' ابا کے جانے کے بعد وہ جگہ جگہ چھپائی رقم نکال کر اکٹھی کرتیں اور گنتیں۔

''کم از کم اس طرح آپ مار سے تو بچ جائیں گی۔'' اس کے معصوم دماغ کو یہی حل سوجھا تھا۔

"مرد کا ہاتھ ایک بار عورت پہ اٹھ آجائے تو پھر بار بار اٹھتا ہے۔"

پھر جوں جوں وہ بڑی ہوتی گئی چھپنے کی جگہیں اس سے چھوٹی رہ گئیں، ابا زیادہ ہوشیار ہو گئے کہ اسے ڈھونڈ ہی لیتے اور ماں کے ساتھ وہ بھی مار کھاتی۔ اس کا سوال کہ ابا انہیں کیوں مار رہے ہیں اب سوال نہیں رہا تھا کیونکہ اسے جواب مل گیا تھا۔

"ہم کیا ساری زندگی اسی طرح پٹتے رہیں گے ماں......؟ آپ جو کمائیں گی ابا اسی طرح مار پیٹ کر، چھین کرلے جائیں گے......؟"

"تو اور کیا کروں......؟"

"پولیس میں رپورٹ درج کرائیں۔" رفیعہ بانو اس بارہ سال کی بچی کی بات پہ حیران رہ گئیں۔

"ایسے مت دیکھیں...... ایک بار اندر ہوں گے تو اگلی بار سیدھے ہوں گے...... اور اگر آپ یہ نہیں کریں گی تو میں کردوں گی۔"

وہ دن بدن تلخ ہوتی جا رہی تھی۔ وہ اپنی ہم عمر بچیوں جیسی شوخ وشنگ اور بے فکری نہیں تھی کیونکہ ان کے حالات اس سے کب کا بچپن چھین چکے تھے۔ وہ بچپن سے سیدھا جوانی میں پہنچی تھی یا شاید ادھیڑ عمر میں جہاں کاندھوں پہ ذمہ داریاں، مسائل کو سلجھانے کی فکریں اور حالات سے لڑنے کا عزم ہوتا ہے۔ کبھی وہ اس کا چہرہ ٹٹولتیں تو وہاں سنجیدگی اور تلخی ہی رقم دکھائی دیتی۔ رفیعہ بانو کو اپنی اکلوتی بیٹی پہ خود سے زیادہ ترس آتا تھا۔ وہ چاہ کر بھی، اتنی محنت کے باوجود اسے زندگی کے بنیادی حقوق نہیں دے سکیں جس میں صحت مند ماحول کا پہلا درجہ تھا۔ اسی لیے وہ ایسی ہو گئی تھی۔

لیکن ایک اچھی بات تھی کہ زاشا نے محنت نہیں چھوڑی تھی...... وہ پہلے سے زیادہ محنت کرنے لگی تھی۔ پڑھائی کے ساتھ ٹیوشنز بھی لیتی تھی۔ شاید اس کے اندر حالات کو بدلنے کا یہی حل تھا۔ میٹرک کے بعد کی ساری تعلیم اس نے وظیفے سے ملنے والی رقم سے حاصل کی تھی۔ وہ شروع سے ہی جانتی تھی کہ ماں اس کی اعلیٰ تعلیم کے خرچے برداشت نہیں کرسکیں گی اسی لیے اس نے ہمیشہ سے ہی محنت کی تھی۔

جب وہ بی ایس سی میں تھی تب ہی ایک دن محلے کے چند لوگ ابا کی لاش کسی کوڑے دان کے پاس سے اٹھا کر لائے تھے۔ وہ نشے میں دھت کہیں پڑے ملے تھے۔ پچھلے تین مہینے سے وہ گھر نہیں آئے تھے۔ کہاں رہے کسی کو خبر نہ تھی اور اب آئے تو اس صورت...... رفیعہ بانو ابا کی لاش دیکھ کر رو رہی تھیں لیکن وہ خاموش تھی۔ باپ کے نام پہ کوئی ایک بھی اچھی یاد اس کے ذہن میں نہیں تھی کہ وہ روتی۔ کوئی ذمہ داری جو انہوں نے اٹھائی ہو، محبت سے کبھی اس کے سر پہ ہاتھ رکھا ہو یا پیار کیا ہو۔ اس کے کسی مسئلے پہ اسے تسلی دلاسا دیتے، اسے حل کرنے کی کوشش کی ہو۔ تو ایسے باپ پہ وہ کیوں روتی محض اس لیے کہ وہ اس کا باپ تھا۔ اسے تو کوئی خوبی کشش تک محسوس نہیں ہوتی تھی کہ وہ دنیا دکھاوے کو ہی ایک آدھ آنسو بہا لیتی۔ اس رشتے نے ہمیشہ اسے تکلیف ہی دی، اس کا دم گھٹتا تھا ان کے ہونے سے تو اچھا ہی ہوا کہ وہ چلے گئے...... پھر وہ کیوں روتی......؟

زندگی کا بدترین باب تمام ہوا۔ اس کی ماں اور وہ ایک قید سے رہا ہو گئے۔ ابا کی صورت جو عذاب ان کے سروں پہ مسلط رہتا تھا وہ ختم ہو چکا تھا۔ وہ یوم آزادی تھا اور ایسے دن بھلا کون روتا ہے۔ وہ بھی نہیں روئی تھی۔

اب وہ جو کچھ بھی اپنے دم پہ تھی...... اپنی ماں کی محنت اور اپنی ہمت کے دم پہ لیکن ایسا کیوں تھا کہ باپ نام کا جو خلا زندگی میں رہ گیا تھا وہ کسی چیز سے، کسی خوشی سے، کسی آسائش سے نہیں بھرتا تھا۔ وہ کمی کسی بھی طرح پوری نہیں ہو کر دے رہی تھی۔ جو زندگی گزار چکی تھی وہ اپنا وجود اس کی شخصیت میں اس بری طرح چھوڑ گئی تھی کہ وہ چاہ کر بھی اسے نکال نہیں پائی تھی۔

"رشتوں کی کمی چیزوں اور آسائشات سے نہیں جاتی۔ وہ ایک بلیک ہول کی تاریکی کی طرح

ہمارے وجود سے ہمیشہ چمٹی رہتی ہے پھر چاہے ہم کچھ بھی کرلیں۔"

اپنے آنسو چہرے سے صاف کرتے ہوئے وہ ترکی کے اس ہوٹل میں اندھیرا کیے سونے کی کوشش میں تھی لیکن گزشتہ زندگی کے زخم جو ہرے ہو گئے تھے وہ اسے سونے نہیں دے رہے تھے۔

☆☆☆

اگلے روز جب وہ ٹریننگ سے واپس ہوٹل پہنچی تو بلال اسے ہوٹل کی لابی میں ہی بیٹھا دکھائی دیا جو موبائل پہ وقت گزار رہا تھا۔ اسے دیکھتے ہی فوراً کھڑا ہو گیا۔

"کافی دیر سے منتظر تھا۔ چلیں آج ڈنر باہر سے کرتے ہیں۔" وہ تھکی ہوئی تھی لیکن ڈنر تو بہرحال کرنا ہی تھا۔

"چینج کر آؤں؟"

"اسی طرح ٹھیک ہیں۔ زیادہ وقت نہیں لگے گا۔ یہ پیچھے فوڈ اسٹریٹس تک ہی تو جانا ہے۔ واک کرتے ہوئے جائیں گے تو پتا بھی نہیں چلے گا۔" وہ اسی طرح سرہلاتے اس کے ساتھ نکل آئی۔

سلطان احمت میں واقع فوڈ اسٹریٹس میں سے کسی ایک ریسٹورنٹ میں روایتی حمام میں پیزا بنایا جاتا تھا۔ بلال اسے وہیں لے کر آیا تھا۔

"یہاں کے پیزا کا ذائقہ ہی اصل ذائقہ ہے۔" وہ کوئی اٹلی میں نہیں بیٹھا تھا کہ ایسا دعویٰ کر رہا تھا پھر بھی وہ مسکرادی۔

روایتی حمام میں بننے والا پیزا، کچی کچی سبزیوں اور ہلکے پھلکے مسالوں کے ساتھ، برائے نام چیز اور چکن لیے ہوئے اس کے نزدیک بس پاسنگ مارکس ہی لے سکا تھا۔ اگر پیزے کا اصل ذائقہ اسے کہتے تھے تو پیزا ایک معمولی ذائقے کا حامل تھا۔

"پاکستانی پیزے کی اپنی بات ہے۔" اسے کہنا ہی پڑا۔ بلال قہقہہ لگا کر ہنس دیا۔ اسے برا نہیں لگا تھا کیونکہ وہ دونوں ممالک میں سے خود پاکستانی کھانوں کا زیادہ دل دادہ تھا۔

"میرے والد کو ترکی کی ہر شے پسند ہے سوائے اس کے کھانوں کے۔ اس معاملے میں وہ جھٹ سے پاکستانی بن جاتے ہیں۔"

زاشا کھل کر مسکرادی۔ بلال کھاتے ہوئے اسے ٹھہر کر دیکھنے لگا۔

"دو ہفتے بعد میں بھی پاکستان آرہا ہوں۔ ملاقات کریں گے۔" ایک بڑا ٹکڑا منہ میں رکھتے وہ بھرے منہ سے بولا۔ زاشا نے ہاتھ روک کر اسے دیکھا اور پھر سے کھانے لگی۔

"وہ میرا اپنا ملک ہے۔ وہاں مجھے گائیڈ کی ضرورت نہیں ہے۔" اس نے ہلکے پھلکے انداز میں کہا تو بلال بھی مسکرادیا۔

"گائیڈ نہ سہی، دوست سہی۔"

"ہم دوست کب بنے؟" اس نے اچنبھے سے اسے دیکھا۔ بلال کی مسکراہٹ سمٹی۔

"تو آپ مجھے دوست نہیں سمجھتیں۔؟"

زاشا نے بس اسے دیکھا اور جیسے دیکھ کر نظر انداز کر دیا۔ وہ خاموش تھی۔ بلال اس کے بعد اس سے زیادہ خاموش ہو گیا تھا۔

واپسی کے سارے سفر وہ اس کو مختلف دکانوں میں بھی روایتی چیزوں کے بارے میں بتاتا رہا لیکن وہ وہاں نہیں تھی۔ وہ ٹھیک سات سال پہلے اپنی بی ایس سی کی کلاس میں تھی جہاں اس کی دوست حوریہ ڈیسک پہ چڑھی، گروپ کی لڑکیوں کو بتا رہی تھی۔

"رحیم بابا نے ہی مجھے بتایا کہ زاشا کے فادر پچھلے سال ڈرگز کی زیادتی کی وجہ سے فوت ہوئے تھے۔ وہ اسے اور اس کی مدر کو بہت مارتے تھے از دیٹ ٹرو زاشا؟"

اور وہ تیزی سے کتابیں سمیٹتی وہاں سے نکلتی چلی گئی۔ اس دن کے بعد وہ دوبارہ اس کالج نہیں گئی، اس نے کوئی دوست نہیں بنائی۔ وہ ہر اس جگہ سے بھاگ جاتی جہاں دور دور سے بھی اس کے باپ کا نام گزرتا تھا۔ اس نے خود کے لیے کئی بار ایسے جملے سنے تھے کہ "یہ بشیر چرسی کی بیٹی ہے نا۔"...... بشیر چرسی کا ربن وہ ماتھے

سے اتار کر پھینک دینا چاہتی تھی۔

"چلیں اندر......؟" بلال کے سوال پہ وہ حال میں لوٹی۔

"کیوں......؟" اسے نہیں پتا لگا کہ وہ کب مٹھائیوں کی دکان کے سامنے کھڑے تھے۔

"اندر چل کر ٹیسٹ کرتے ہیں۔ یقیناً یہاں کی منفرد مٹھائی تو آپ کو پسند آئے گی۔ خاص طور پہ ٹرکش رولز۔"

"مجھے میٹھا زیادہ پسند نہیں ہے۔" اس وقت واحد جگہ جہاں وہ جانا چاہتی تھی اس کا کمرا تھا۔

"تب ہی آپ اتنی کڑوی ہیں۔" وہ بڑبڑایا تھا لیکن کچھ اس طرح کہ وہ سن سکے۔

زاشا خاموش رہی۔ اسے ایسے کسی تبصرے سے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔ خود کے لیے مغرور، گھمنڈی، تلخ، بدمزاج، منہ پھٹ جیسے الفاظ وہ کئی بار سن چکی تھی۔ اس نے کہہ دیا تو کیا ہوا۔

ہوٹل واپسی پہ وہ اسے لفٹ تک چھوڑ کر اپنے کمرے کی طرف چلا گیا تھا۔

"میں اسے نہیں بتا سکتی کہ میں نے اپنی جو حدود مقرر کی ہیں ان میں دوستی نام کی کوئی چیز نہیں ہے۔ نہ لڑکیوں کے لیے اور نہ ہی لڑکوں کے لیے۔" اسے کاریڈور کے آخر میں گم ہوتے دیکھ کر اس نے سوچا اور لفٹ میں سوار ہوگئی۔

☆☆☆

اگلے پورا ہفتے وہ جیسے ہی ٹریننگ سے لوٹتی بلال اسے اپنے ساتھ گھسیٹ کر کہیں نا کہیں لے جاتا۔ کبھی وہ گرینڈ بازار کی سیر کرتے پائے جاتے تو کبھی استقلال اسٹریٹ کی...... کبھی وہ یونہی ٹرام میں بیٹھ کر تھوڑا گھوم کر کچھ اسٹیشن آگے اتر جاتے۔ کبھی باسفورس کروش میں ڈنر کی خاطر سوار ہو جاتے۔ کئی بار وہ یونہی بے مقصد ہی چلتے چلے جاتے لیکن زاشا کو یوں دیر رات استنبول کی سڑکوں پہ چلنا بھی اچھا لگتا تھا۔ نجانے کیوں اسے بلال کی باتیں اور اس کا ساتھ اچھا لگتا تھا۔ پہلی بار کوئی مرد اسے ایسے تحفظ مہیا کر رہا تھا، اس کے خرچے اٹھا رہا تھا، اس کی پروا کر رہا تھا، اسے وقت دے رہا تھا۔ یہ سب معمول کے مطابق نہیں تھا اور اسے یہ سب اندر سے اچھا لگ رہا تھا۔

"میں پہلے دن سے تمہیں "تم" کہتی آرہی ہوں اور تم ابھی تک "آپ" سے باہر نہیں نکلے۔"

"آپ کہنا عزت دینا ہے۔ میں نے کبھی کسی سے بھی "تم" کہہ کر بات نہیں کی۔ شاید آپ نے دیکھا نہیں کہ میں ہمت کو بھی آپ کہہ کر بلا رہا تھا۔ "تم" کا لفظ میری لغت میں نہیں ہے۔"

"تم زندگی میں کبھی کسی کو تم نہیں کہو گے۔؟"

وہ دونوں ایک سنگی بنچ پہ جا بیٹھے جس کے عقب میں دور توپ کپی محل جگمگا رہا تھا اور قریب ہی کچھ فوارے پانی گرا رہے تھے۔ اگلی صبح پانچ بجے کی اس کی فلائٹ تھی۔ ساتھ میں ان کا آخری وقت تھا۔

"کہوں گا نا...... اپنی لائف پارٹنر کو......" زاشا بے ساختہ ہنس دی۔

"ڈیڑھ ہفتے میں یہ پہلی ہنسی ہے۔" اس کی ہنسی وہیں تھم گئی۔

"تم میری ہنسی تک گنتے ہو؟"

"اتنی سڑیل لڑکی کبھی مجھے ملی جو نہیں ہے۔"

زاشا مسکرا دی۔ اسے اس کا انداز برا نہیں لگتا تھا۔

"ممی بھی میرے ساتھ پاکستان آئیں گی۔ پھر والد اور ممی کو لے کر گھر آؤں گا ملنے۔"

"کیوں......؟" اس نے اتنا بے ساختہ پوچھا کہ بلال اس کی شکل دیکھ کر رہ گیا۔ اس کیوں کا جواب اسے آتا تھا لیکن اسے زاشا کو دینا نہیں آتا تھا۔

"میرے پاس ملوانے کو کوئی قابل قدر خاندان نہیں ہے تمہاری طرح۔"

"جیسا بھی ہو، ہم پھر بھی تمہارے گھر آنا چاہیں گے۔" اس کے جملے کے بجائے زاشا بس ایک لفظ میں کھو گئی تھی...... "تم"

کچھ دیر پہلے وہ کیا کہہ رہا تھا اور اب وہ اسے "تم" کہہ کر مخاطب کر رہا تھا۔ جو راز کھل رہا تھا وہ اسے ہولا رہا تھا۔

اس نے تین بار گہری گہری سانسیں لیں اور پھر رخ اس کی طرف مکمل طور سے موڑ کر بیٹھ گئی۔

"سنو بلال! میں نے کبھی کسی کو یہ سب نہیں بتایا لیکن تمہیں بتا رہی ہوں کیونکہ شاید تمہیں بتا کر تمہیں روکنا ضروری ہے۔ میں تمہاری طرح پڑھے لکھے، مہذب ماں باپ اور ایک قابل بیان قسم کے خاندانی پس منظر کی مالک نہیں ہوں۔ نجانے تم مجھے کیا سمجھ رہے ہو لیکن جو بھی سمجھ رہے ہو وہ غلط ہے۔"

"اس سے کیا فرق پڑتا ہے کہ تم کیسے خاندان سے ہو؟" وہ دونوں اس وقت آمنے سامنے سنجیدہ بیٹھے تھے۔

"فرق پڑتا ہے بلال...... کیونکہ جب میرے گھر میں بیٹھ کر یا آتے جاتے تمہیں اور تمہارے پیرنٹس کو یہ پتا چلے گا کہ میں ایک نشئی باپ کی اولاد ہوں اور اسی نشے نے میرے باپ کی جان لے لی تو شاید تم کبھی ملنا تو دور میری شکل بھی دیکھنا نہیں چاہو گے۔"

اپنی بات کر کے اس نے رخ پھیر لیا۔ اس کی آنکھیں اور آواز دونوں بھر آئی تھیں۔ اپنے حصے کا سچ اس نے بول دیا تھا۔ اب دونوں طرف خاموشی تھی۔ بلال کتنی دیر خاموش رہا پھر اٹھ کر نیچے زمین پہ اس کے سامنے گھٹنوں کے بل بیٹھ گیا۔

"کسی کے گناہ کی سزا دوسرے کو دینا کہاں کی عقل مندی ہے زاشا۔؟ تمہارے فادر جیسے بھی تھے اس میں تمہارا کوئی قصور نہیں ہے۔ ان کے کریکٹر کو دیکھ کر کسی کو بھی تمہارا کریکٹر سرٹیفکیٹ ایشو کرنے کا کوئی حق نہیں ہے۔ تم اپنی الگ حیثیت رکھتی ہو، الگ شخصیت کی مالک ہو، میں کیوں تمہارے فادر کے کسی عمل کے لیے تمہیں مجرم ٹھہراؤں۔ تم اگر ایسا سوچتی ہو کہ یہ سب جان کر مجھے یا میرے پیرنٹس کو کوئی فرق پڑے گا تو ایسا نہیں ہے یقین جانو کہ یہ سب جان کر مجھے تم پہ رشک آ رہا ہے کہ تم نے خود کو اتنے مشکل حالات میں اس قابل بنایا اور یہاں تک پہنچ گئی۔ تمہاری مدر کتنی باہمت خاتون ہیں جنھوں نے اکیلے تمہاری پرورش کی، تمہاری تمام ذمہ داریاں پوری کیں۔ یہ سب سوچ کر میرے نزدیک تمہارا مقام بڑھ گیا ہے زاشا، کم نہیں ہوا۔ میں وہ معیار (پیمانہ) توڑتا ہوں زاشا جس میں تمہارے باپ کے گناہوں کو ڈال کر تمہیں ماپا جائے۔"

وہ دونوں ہاتھوں میں چہرہ چھپا کر رونے لگ گئی۔ شاید پہلی بار کسی نے اسے یہ سب کہا تھا جو وہ سوچتی تھی۔ پہلی بار کوئی شخص اسے یہ کہہ رہا تھا کہ اس کے باپ کے گناہ ان کے ساتھ دفن ہو گئے ہیں، اس کی ذات ان سے بری الذمہ ہے۔ وہ کتنی دیر چہرہ چھپا کر روتی رہی۔ اس کا بس نہیں چلتا تھا وہ ہر اس جگہ سے بھاگ جائے جہاں کوئی اسے جانتا ہو...... کوئی اسے اس کے باپ کے نام سے نہ پکارے۔ کوئی بشیر نشئی یا بشیر چرسی کی بیٹی جیسے القابات سے اسے نہ نوازے...... اور سامنے بیٹھے اس انسان نے اسے اس سب سے باہر نکال دیا تھا۔

بلال نے جیب سے ٹشو پیپر نکال کر اس کی طرف بڑھایا۔ زاشا نے اپنا چہرہ پونچھا۔

"کیا اب بھی مجھے اجازت نہیں ہے کہ میں ممی اور والد کو تمہارے گھر لا سکوں......؟" وہ سنجیدہ تھا۔

زاشا نے اسے غور کر دیکھا اور یکدم پھر سے اس کی ہنسی چھوٹ گئی۔

"پہلے تم ایڈمٹ کرو کہ تم واسع چوہدری سے ملتے ہو۔" وہ منہ بناتا واپس بینچ پہ آ کر بیٹھ گیا۔

"فواد خان جیسی پیاری صورت کو واسع سے ملانے والی لڑکی بالکل ہی سڑی ہوئی ہے۔ مجھے ایک بار پھر سے سوچنا پڑے گا۔"

زاشا نے ہاتھ میں پکڑا ٹشو اسے دے مارا جسے اس نے خود پہ گرنے سے پہلے ہی دور اچھال دیا۔ دونوں نے ایک دوسرے کو دیکھا اور ایک ساتھ ہنس دیے۔

دونوں اب ہوٹل کی طرف جا رہے تھے کہ زاشا کو واپسی کی پیکنگ بھی کرنی تھی۔ اسے ماں کو جا کر بتانا تھا کہ وہ جو کہتی تھی کہ وہ خود اسے ڈھونڈ لے گا تو اس نے اسے بالآخر ڈھونڈ ہی لیا۔

☆☆

سورج دن بھر کی مشقت کے بعد اب افق کے پار اپنے گھر لوٹنے کی تیاری میں تھا۔ سارے جہاں کو روشنی اور خون گرمانے والی حرارت مہیا کرنا آسان کام نہیں سو وہ بھی تھکا ہارا، جھکے کندھے والے دفتر سے لوٹ رہے افراد کی طرح ست تھا۔ اس کی تھکان بھری واپسی نے ماحول کو سوگوار کر دیا تھا۔ سرمئی اور نارنجی آسمان تلے نیم کے درخت پر چہچہاتی چڑیاں بھی اس اداس فضا میں چپ تھیں۔ میں جو ارقم کے دوست جاوید کے جانے کے بعد سے جلے پیر کی بلی کی طرح صحن میں گھوم رہی تھی، اس خاموشی اور اداسی سے گھبرا کر اندر چلی آئی۔ دکھ اور غصہ اتنا تھا کہ آنکھیں اور زبان دونوں برسنے کو بے قرار تھے۔ میرا شک درست تھا۔ ارقم مجھے بے خبر رکھتے ہوئے اپنی زندگی کا سب سے بڑا فیصلہ کر چکا تھا۔ مجھے جو سرپرائز دینے کی بات وہ فون پر دوست سے کر رہا تھا وہ واقعی سرپرائز تھا۔ یقین کرنا مشکل تھا کہ میری مشکلات، تکالیف اور تنہائی کا رازدار میرا بیٹا میرے ساتھ ایسا کر سکتا ہے لیکن یہی تو دنیا ہے اور یہی دنیا کا دستور کہ یہاں آپ کی توقعات اور یقین کے مطابق کچھ نہیں ہوتا۔

میری کہانی کوئی نئی یا انوکھی نہیں۔ ارقم دو سال کا تھا جب اس کے والد چل بسے اور میں عدت کے بعد میکے آ گئی۔ متوسط گھرانہ تھا تین شادی شدہ بھائی اور ان کے بچے۔ امی ابا کی زندگی میں ایک دو رشتے آئے لیکن میں نے انکار کر دیا۔ میں نے دیکھا تھا فوراً دوسری شادی کرنے والی ماں کو لوگ اچھا نہیں سمجھتے تھے پھر میرا بیٹا میری زندگی تھا۔ میں اس پر کوئی سوتیلا رشتہ نہیں لادنا چاہتی تھی۔ جب تک والدین زندہ تھے تب تک کسی طرح حالات بہتر رہے لیکن ان کے جاتے ہی ارقم اور میرے گرد سے حفاظتی حصار بھی ختم ہو گیا۔ اب ہم دونوں مفت کی روٹی توڑنے والے، بے غیرت، اضافی افراد تھے اور اسی حیثیت کے مطابق ہمارے ساتھ سب کا سلوک بھی تھا۔ میرا دل بیٹے کے ساتھ ہونے والی زیادتی اور نا

انصافی پر بہت دکھتا مگر خون کے گھونٹ پی کر سب کی خدمت میں جتی رہتی۔

میرے ایک دور کے کزن بڑے نیک اور عمر میں مجھ سے کافی بڑے تھے۔ امی ابا کی زندگی میں ان کا گھر آنا جانا تھا۔ میرے والدین کی وفات کے بعد جب انھوں نے مجھ سے نکاح کا عندیہ دیا تو جیسے طوفان آ گیا۔ حیرت اور اعتراض کے ساتھ ہی بھابیوں نے صاف کہہ دیا، ہمارے ہی گھر میں ہماری ناک کے نیچے 'یہ سب' چل رہا تھا۔ برسوں سے جاری گھر میں ان کی آمدورفت اس جائز خواہش کے بعد ایک گناہ سے جوڑ دی گئی جو بہتان کے علاوہ کچھ نہ تھا۔ 'یہ سب' کا الزام ایسا دل پر لگا کہ میں نے خود مختار ہونے کی ٹھان لی کہ نہ مجھے کوئی کھلائے گا نہ سنائے گا۔

زبیدہ خالہ بیوہ تھیں۔ وہ محلے بھر کی خالہ تھیں اور امی کی سہیلی بھی۔ انھوں نے مجھے بڑا سہارا دیا۔ ان کے توسط سے میں نے کئی چھوٹے موٹے کام شروع کیے اور ٹیوشن پڑھانے لگی۔ اس پر بھی گھر میں اعتراض اٹھے لیکن زبیدہ خالہ اب میرے بھائیوں اور بھابیوں کو چپ کرا دیتی تھیں۔ کزن نے زبیدہ خالہ کے ذریعے پھر اپنا عندیہ دہرایا، زبیدہ خالہ نے بھی اصرار کیا لیکن میں نے سختی سے انکار کر دیا۔ اس طرح تو سب کی جھوٹی باتوں پر مہر لگ جاتی۔ زبیدہ خالہ نے ہی محلے کے بزرگوں سے کہہ کر بھائیوں پر دباؤ ڈالا اور مکان میں میرا حصہ دلوایا۔ اس طرح میں سب سے الگ اپنے حصے میں اپنے بیٹے کے ساتھ رہنے لگی۔ بعض اوقات اپنوں سے زیادہ غیر ہمارے کام آتے ہیں۔

زبیدہ خالہ نے بیوہ ہونے کے بعد مروت اور لحاظ میں اپنے قریبی تعلقات میں بہت کچھ سہا تھا۔ وہ مجھے ہمیشہ کہتیں کہ تم میری غلطیاں نہ دہراؤ۔ ڈٹ جانا، انکار کرنا اور اپنے لیے لڑنا سیکھو۔ میری مشکلات کا بدلہ اللہ نے ارقم کی صورت دیا تھا۔ وہ قابل اور نیک بیٹا تھا۔ وقت بدل گیا تھا۔ اب ہر جگہ اس کی تعریف کے ساتھ میری قربانی کے ذکر اور ستائش پر میرا سینہ فخر سے تن جاتا تھا۔

اتفاق سے جاوید اس کا پوچھنے گھر آیا تو میں نے اس سرپرائز کے متعلق پوچھ لیا اور ذرا سے دباؤ اور ہچکچاہٹ کے بعد اس نے دوست کا راز اگل دیا تھا۔

☆☆☆

صحن کا دروازہ معمول کی آواز کے ساتھ کھلا تو میں فوراً باہر آئی لیکن ارقم کی بجائے زبیدہ خالہ آئی تھیں۔

"کیا ہوا؟" میرا اترا چہرہ دیکھتے ہی انھوں نے سوال کیا۔

"وہی ہوا جس کا مجھے ڈر تک نہیں تھا۔"

وہ مجھے گھورتے ہوئے چارپائی پر بیٹھ گئیں۔

"ایک تو تم ماں بیٹا بھی سیدھی بات نہیں کرتے! جلیبیاں نہ بناؤ، سیدھے سیدھے کہو۔"

"ارقم کو کوئی لڑکی پسند آ گئی ہے، شام کو جس کوچنگ سینٹر میں پڑھاتا ہے وہ بھی وہاں کام کرتی ہے۔"

"وہ نیک بچہ ہمیشہ تمہارے کام آسان کرتا ہے، لو یہ بھی کر دیا۔" ان کی اس بات پر میں نے سختی سے لب بھینچے۔

"فکر نہ کرو، تم نے اس کی تربیت بڑی اچھی کی ہے، کوئی ایسی ویسی لڑکی پسند نہیں کرے گا۔"

"تربیت تو خیر میں نے بڑی اچھی کی ہے۔" میرے لہجے میں غرور تھا۔ "لیکن میرا بیٹا اتنا معصوم ہے کہ ایسی ویسی لڑکی اسے پھنسا ضرور سکتی ہے۔"

"ہر ماں کو اپنا بیٹا معصوم لگتا ہے جب کہ۔"

"بات تو مکمل سن لیں، وہ بیوہ ہے اور ڈھائی سال کی بیٹی ہے اس کی۔"

"تمہیں تو خوش ہونا چاہیے اس بات پر۔"

زبیدہ خالہ اب ذرا حیران ہوئیں۔

"میں کیوں خوش ہوں گی اس بات پر؟" میں نے تنک کر پوچھا۔

"بیوگی کی زندگی کو تم سے بہتر کون جانتا ہے۔"
وہ ذرا توقف سے گویا ہوئیں۔
"شاید ارقم کی اس لڑکی کو پسند کرنے کی وجہ بھی یہ ہی ہو۔"
"مجھ سے بہتر کوئی نہیں جانتا اسی لیے کہہ رہی ہوں کہ جس ماں کو اولاد کی فکر ہو وہ کبھی ایسا فیصلہ نہیں کرتی۔ یہ تو۔" میں رک گئی۔
"یہ زعم، یہ غرور، یہ برتری کا احساس اپنے۔" زبیدہ خالہ اپنی جگہ سے اٹھ گئیں۔ "بے شک تم نے مشکل زندگی گزاری اور اولاد کے لیے بڑی قربانیاں دیں لیکن اس زعم میں تم دوسری عورت کے ایسا نہ کرنے پر اسے خود سے کم تر یا غلط کہنے کا حق نہیں رکھتیں۔"
"میں نے کوئی قربانی نہیں دی، یہ ہر ماں کا فرض ہے کہ اولاد کی بھلائی کو مقدم رکھے۔"
"یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ دوسری شادی کرنے والی عورت اولاد کی بھلائی کو مقدم رکھ کے ہی وہ فیصلہ کرتی ہو۔"
"سوتیلا رشتہ اور بچے کو دنیا کی باتیں سننے کا موقع دینا کہاں سے اولاد کی بھلائی ہوئی؟"
"ہر سوتیلا رشتہ ظالم یا برا نہیں ہوتا اور دوسری شادی بچے کو تحفظ اور بھرا پرا خاندان بھی تو عطا کرتی ہے۔"
"آپ نے بھی تو نہیں کی تھی۔"
"لوگ کیا سوچیں گے، دنیا کیا کہے گی، مجھے اس بات کا زیادہ ڈر تھا۔ پھر میرے لیے جو بھی رشتے آئے ان کے دو دو تین تین بچے تھے۔ مجھے اپنے بچوں کے لیے تو باپ چاہیے تھا لیکن میرا دل کسی اور کے بچوں کی ماں بننے کے لیے تیار نہیں تھا۔ ایسا کوئی رشتہ ہوتا جس کی اولاد نہ ہوتی تو میں دنیا کی فکر چھوڑ کر شاید نکاح کر لیتی۔۔۔" زبیدہ خالہ عمر اور تجربے کے اس دور میں تھیں کہ بلا خوف اور لگی لپٹی کے ایمان داری سے سچ کہہ رہی تھیں۔ وہ واپس چارپائی پر بیٹھ گئیں۔ "تم اس وقت روایتی ماں کی طرح سوچ رہی ہو، صرف ایک عورت بن کر سوچو اور اپنی زندگی کا ایمان داری سے تجزیہ کرو تو بیٹے پر بہت پیار آئے گا۔"
"ہر ماں روایتی ہوتی ہے اور اس کی ترجیح اولاد کی خوشی اور بھلائی۔"
"تو پھر پریشانی کیا ہے؟ ارقم کی خوشی میں خوش رہو۔"
"یہ بھی ماں کا فرض ہے کہ اسے آگ سے کھیلنے نہ دے، کنویں کھائی میں گرنے سے بچائے۔"
"لو! تم تو روایتی ماں ہی نہیں ابھی سے روایتی ساس بھی بن گئی۔" انھوں نے میری بات کاٹ کر کہا۔
"زبیدہ خالہ! چاند سی بہو اور اپنی پسند سے ٹھونک بجا کر لڑکی پسند کرنے کے ارمان میرے بھی ہیں اور سچ کہوں تو میں خود غرض ماں ہوں، اپنے بیٹے کو کیسے کسی اور کا بچہ اور بیوہ کی ذمہ داری اٹھانے دوں؟ ساری زندگی بیٹے کے لیے وقف کرنے کے بعد یہ خواہش تو جائز ہے ناں!"
"تو تمھیں بدلہ چاہیے اب۔؟ ماں کی بے غرض محبت کیا ہوئی؟"
"بدلہ کیسا زبیدہ خالہ! اتنا حق تو بنتا ہے میرا۔ مجھے تو یہ افسوس ہے کہ میرے بیٹے نے ساری عمر اس کے لیے وقف کر دینے والی ماں کے بارے میں کیوں نہ سوچا۔ ساری دنیا کے ظلم سہے پھر تنہائی اور اب بہو کے ظلم سہوں، وہ بیٹے کو دور لے جائے اور میں پھر تنہا ہو جاؤں۔۔۔ ایک بار پھر دنیا مجھے طعنہ دے کہ دیکھو جس کے لیے سب کیا وہ ہی اب چھوڑ گیا!"
مجھے رونا آ گیا۔ دنیا کے سامنے سرخرو ہونے کی خواہش اب پوری ہوئی تھی کہ بیٹا پھر اسے مٹی کر دینے پر تلا تھا۔ مجھے ابھی سے سب کی چہ چہ اور افسوس کرتی نظریں محسوس ہو رہی تھیں۔
"ضروری نہیں ایسا ہی ہو، یہ مفروضات ہیں تمہارے۔ ارقم بہت سمجھ دار اور حساس بچہ ہے مجھے

یقین ہے کہ وہ تمہیں نظر انداز کر کے کوئی فیصلہ نہیں کرے گا......" زبیدہ خالہ نے میرا ہاتھ تھپتھپا کر تسلی دی۔ "اور یہ ہم جیسی عورتوں کی ذمہ داری بھی ہے کہ دوسری بیوہ خواتین کی زندگی آسان بنائیں، انہیں وہ سب نہ سہنے دیں جو ہم نے سہا۔"

☆☆☆

میں اس خدمت خلق کے لیے تیار تھی نہ ہی اپنا اثاثہ یوں گنوانا چاہتی تھی اس لیے اگلے دن میں اس لڑکی سے ملنے اور اس کا دماغ ٹھکانے لگانے خود کوچنگ سینٹر پہنچ گئی۔ اسٹاف روم کی کھڑکی سے ارقم کو دیکھ کر مجھے وہیں رکنا پڑا۔ ارقم کے مقابل میز کی دوسری طرف شاید وہ ہی لڑکی تھی۔

"میں نے آپ کو جواب دے دیا ہے پھر کیوں وہ ہی سوال کر رہے ہیں آپ؟"

"میں نے آپ سے جواب کی وجہ پوچھی ہے۔"

وہ جاننا آپ کے لیے ضروری نہیں۔"

آپ مجھے مطمئن اور قائل کر دیں کہ آپ کا فیصلہ درست ہے ورنہ میں اپنی بات پر قائم ہوں۔"

"کیا آپ کو مجھ سے محبت ہے؟" وہ زچ تھی۔

"ابھی تک تو نہیں۔" میرا بیٹا دلکشی سے مسکرایا اور مجھے غصہ آیا۔

"پھر کیوں پیچھے پڑے ہیں آپ؟"

"یہ غلط بیانی ہے صبا! میں پیچھے نہیں پڑا ہوں بلکہ طریقے سے اپنا مدعا بیان کیا ہے......" وہ اب سنجیدہ تھا۔ "آپ کیوں انکار کر رہی ہیں؟"

"آپ میرے ساتھ اس اکیڈمی میں پڑھاتے ہیں، دو گلی کے فاصلے پر آپ کا گھر ہے، یہ آپ کی پہلی شادی ہے، آپ کو اندازہ ہے یہ تمام باتیں میرے کردار کو کس طرح پیش کر رہی ہیں؟"

"یہ آپ کے نہیں میرے کردار کو پیش کر رہی ہیں۔"

"ہا...... کس دنیا میں رہتے ہیں آپ؟ ہمارے معاشرے میں بات کچھ بھی ہو کردار صرف عورت کا اچھالا جاتا ہے۔ یہ بات علم میں آتے ہی دنیا میرا جینا حرام کر دے گی۔"

"دنیا دنیا دنیا......" ارقم نے دھیرے سے میز پر ہاتھ مارا۔ "کیوں اتنا ڈر، اتنا خیال دنیا اور زمانے کا؟"

"کیوں کہ رہنا اسی دنیا، اسی زمانے میں ہے اور......"

"کیا آپ اور میں دنیا اور زمانہ نہیں؟" مجھے یقین تھا وہ بھی میری طرح الجھ کر اسے دیکھ رہی ہوگی۔

"اسی دنیا اور زمانے کے خوف سے میری امی نے تنہا زندگی گزاری ہے۔ بلاشبہ میں ان کا سہارا تھا لیکن سچ یہ ہے کہ یہ کافی نہیں۔ اسلام دین فطرت اسی لیے ہے لیکن ہم نے اللہ کے سامنے سرخرو ہونے سے زیادہ دنیا اور زمانے کے سامنے سرخرو ہونے کو نصب العین بنا لیا ہے۔ میں کسی امینہ کو اس خود ساختہ تنہائی اور درد سے بچا سکوں تو وہ میری ماں کو میرا خراج تحسین ہوگا اور میرا ماننا ہے زمانہ اور دنیا ہم بھی ہیں، دنیا اور زمانے میں دوسری قسم کی باتیں عام ہوں گی تو پہلی قسم کی خود ہی بند ہو جائیں گی۔"

زبیدہ خالہ اتنی نہ تھی لیکن میری بھی وہ عمر اور تجربہ تو ہو ہی گیا تھا کہ اعتراف کر لوں۔ کئی بار اپنی تنہائی اور اکیلے پن سے گھبرا کر میں پچھتائی تھی کہ کاش دنیا کیا کہے گی کی فکر چھوڑ کر میں نے کسی کا بڑھا ہاتھ تھام لیا ہوتا! اپنا فیصلہ دنیا کے بجائے میں نے دین شریعت اور سنت کو کسوٹی بنا کر کیا ہوتا۔ مجھے موقع ملا تھا کہ میں پھر کسی کو 'دنیا کیا کہے گی لوگ کیا سوچیں گے' کی بھینٹ نہ چڑھنے دوں۔

میرا رخ صبا کے گھر کی سمت تھا۔ ایک نئی رسم کی بنیاد کے لیے مجھے بارش کا پہلا قطرہ جو بننا تھا۔

☆☆

مکمل ناول

ام طیفور

منوا کر دل و جاں ہم سے

ایک تفصیلی سٹنگ کے بعد رباب آنٹی اور زمن نیورو سرجن ڈاکٹر مہریار راؤ کے کمرے سے باہر نکلی تھیں۔ دونوں کے چہروں پہ بے حد اطمینان تھا۔ زمن کو اتنے عرصے میں پہلی بار یقین ہوا تھا کہ زوہا ٹھیک ہو سکتی تھی۔ اب تک کی خجل خواری نے اسے اندر ہی اندر مایوس کر دیا ہوا تھا لیکن ڈاکٹر مہریار نے انہیں نہ صرف تسلی دی تھی بلکہ زوہا کے ٹھیک ہو جانے کے اسی فیصد چانسز بتائے تھے۔ زمن کے لیے یہی بہت تھا کیونکہ اب تک وہ جس بھی ڈاکٹر کے پاس گئی تھی سب ہی نے پانچ سے دس فیصد کی امید دلا کے رخصت کیا تھا۔ زمن ہاتھ میں رپورٹس والی فائل کھولے اسے دیکھ رہی تھی جبکہ رباب آنٹی اور مہریار آپس میں بات کر رہے تھے۔

"نیکسٹ ویک آپ پیشنٹ کو لے آیے گا۔ میں تھارولی چیک اپ کر کے اسی ماہ کے اندر آپریشن کی تاریخ دے دوں گا۔ اس سے زیادہ ڈیلے نہ کرنا مناسب ہوگا، پہلے ہی دیر ہو چکی ہے!"

وہ رباب آنٹی کو بتا رہا تھا۔ زمن نے چونک کے اسے دیکھا۔ اس نے رباب آنٹی کو پیسوں کا پوچھنے کا اشارہ کیا۔ وہ مہریار کی قدرے بائیں جانب کھڑی انہیں انگوٹھے اور انگشت شہادت کو مسل کے اشارہ دے رہی تھی۔ رباب آنٹی نے تو دیکھا سو دیکھا خود مہریار نے بھی دیکھ لیا۔

"ان سے کہیے کہ پیسوں کی فکر مت کریں۔ بس آپ تیاری پکڑیں۔"

زمن کو کہنے کے بجائے اس نے رباب آنٹی کو جواب دیا تھا۔ زمن کو برا لگا، وہ دل میں اونہہ کہتی دوبارہ فائل کی جانب متوجہ ہوئی۔

"زمن......" رباب آنٹی نے گاڑی کی چابی اس کی جانب بڑھائی۔ "تم پارکنگ میں چلو۔ میں دس منٹ میں وہیں پہنچتی ہوں۔ بے شک گاڑی کھول کے اندر بیٹھ جانا۔"

زمن نے گومگوں کی کیفیت میں چابی تھام تو لی لیکن وہ اکیلی جانا نہیں چاہ رہی تھی۔

"میں آپ کے ساتھ ہی چلتی ہوں نا آنٹی۔ اکیلی کیسے جاؤں گی وہاں تک۔"

"میری جان یہ تو پارکنگ ہے۔ اچھا ایسا کرو مہریار کے آفس میں ہی بیٹھو، میں بس ابھی آئی۔"

وہ بنا اس کا جواب اور مرضی جانے کاریڈور کی جانب چل دی تھیں۔ زمن ان کو پکارنے اور نا پکارنے کی کیفیت میں کھڑی تھی جب مہریار نے اسے اندر چل کے بیٹھنے کا کہا۔

"بیٹھ جائیے کچھ دیر۔ رباب آنٹی کی اس ہاسپٹل میں ان گنت دوستیاں ہیں۔ اور دوستی نبھانے کے لیے وہ کسی بھی حد تک جا سکتی ہیں...... آیے بیٹھ جاییے۔"

مہریار نے اسے قدرے نرمی سے آفر کی تھی۔ وہ اس کے لیے دروازہ کھولے کھڑا تھا۔ زمن کو اچھا نہیں لگا بے مروت ہونا۔ اس نے اندر کی جانب قدم بڑھا دیے۔ مہریار بھی اس کے پیچھے تھا۔ رباب آنٹی نے کاریڈور کے اختتام پر ایک بار پلٹ کر اس جانب دیکھا تھا......!

☆☆☆

نانی پیاری کب سے آئس کریم کا باؤل ہاتھ میں تھامے چمچہ گھمائے جا رہی تھیں اور آئسکریم تھی کہ شرم سے پانی پانی ہوئی جاتی تھی۔ داڑھ نکلوانے کے بعد ڈاکٹر نے آئسکریم کھانے کا کہا تھا۔ زاردن ناک کی نوک پہ عینک جماتا انہیں بغور دیکھ رہا تھا۔ داور کو نجانے کیا اشارہ کیا کہ وہ گھٹنوں کے بل گھسٹتا ان کے قریب ہوا اور پہلے منہ اٹھا کے نانی پیاری کا منہ دیکھا اور پھر ان کے باؤل کو۔۔ منہ سے رال ٹپکنے سے پہلے بولنا لازم تھا۔

"نانی...... او نانی بی......" وہ سن نہیں رہی تھیں بس چمچہ چلا رہی تھیں۔ سوچیں نہ جانے کہاں بھاگ پڑی تھیں۔ داور کو آئسکریم کی پتلی ہوتی حالت پہ ترس آ رہا تھا۔

"نانی بی...... اللہ کا واسطہ ہے کھا لیں۔ کوئی آئسکریم کے ساتھ بھی یہ ظلم کرتا ہے۔ اگر دہی کھانا تھا

تو وہ اندر فریج میں بھی تھا۔لیکن اس کے اندر تو بلینڈر پھیرنا بند کریں.......!"

نانی پیاری ہنوز اسی پوزیشن میں رہیں تو داور نے زارون کو ساتھ دینے کا اشارہ کیا۔دونوں ایک ساتھ چلائے۔

"نانی پیاری!"

اوران کے ہاتھ سے باؤل چھوٹتے چھوٹتے بچا۔ ہڑبڑا کے نیچے جھکیں اور جوتا اٹھا کے داور کو کھینچ مارا جو جھکائی دے گیا۔ جوتا سیدھا ناک کی پھننگ پہ عینک سیٹ کرتے زارون کے چہرے کو جالگا۔ عینک پھسل کے فرش پہ۔ اس ہفتے میں دوسری عینک تھی جس کی شامت آئی تھی۔۔ وہ بے چارہ بلبلا کے رہ گیا۔

"کیا نانی....... میں نے کیا کہا تھا۔ پہلے ہی میرے چہرے سے نیل نہیں گئے اب تک۔ آپ اور ستارے لگا دیں۔ یونی میں لڑکیاں نیل گائے کہنے لگ گئی ہیں مجھے۔!"

"غلط کہتی ہیں۔ انہیں تمہیں مدہوش گائے کہنا چاہیے۔ جس کو یہ نہیں پتا چلتا کہ ایک پیر میں جوگر بلیک پہن کے جاتا ہے اور دوسرے پاؤں میں بلو۔" داور نے ٹھٹھا لگا کے اس کا موڈ مزید خراب کیا۔

"بکواس ، بند کرو تم دونوں۔ جان ہولا کے میری رکھ دی۔ کیسی ضروری بات سوچ رہی تھی تمہیں کیا پتا۔ آج تو ویسے ہی دل بیزار سا ہوا پڑا ہے جب سے موئے ڈاکٹر کے پاس سے آئی ہوں دل ہی نہیں لگ رہا.......!"

داور نے زوردار تالی بجائی۔ نانی کے ہاتھ سے باؤل ایک بار پھر پھسلتا پھسلتا بچا لیکن وہ برداشت کر گئیں۔

"مجھے پہلے ہی شک تھا نانی بی کہ وہ ہمیں ایویں ہی باہر نہیں بھیج رہا۔ اس نے آپ کے دانت کے ساتھ دل بھی نکال لیا ہونا ہے۔ لکھوا لیں مجھ سے۔ آج کل تو انسان کا پرزہ پرزہ بک جاتا ہے۔ آپ کا دانت بھی بیچے گا اور دل بھی.......!"

"کم بخت۔ بے غیرت۔" نانی پیاری کا یہ نشانہ درست لگا تھا۔ داور کمر دہری کرتا پرے کھسک گیا۔ "سانس کیسے لے رہی ہوں جو دل نکال لیا ہے تو۔ بک بک کرالو بس۔ مجھے تو اس بچی کا چہرہ نہیں بھولتا جو میرے باہر آنے پہ اندر گئی تھی۔ کیسی پیاری صورت تھی لیکن دیکھی بھالی سی......!" نانی بی سوچنے والے انداز میں باؤل کو منہ سے لگاتے ہوئے بولیں۔ آئسکریم سوپ بن چکی تھی اب اسے ایسے ہی پیا جا سکتا تھا۔ داور اور زارون نے آئسکریم کی ایسی بے حرمتی پہ صبر کا گھونٹ بھرا۔ نانی کی بات پہ داور کی زبان پھر چلی۔

"مجھے معلوم تھا وہ آپ کو پسند آئے گی نانی بی۔ مجھے بھی آئی تھی۔ آپ کہیں گی تو کل ہی سارا اتا پتا آپ کو لادوں گا بس امی اور ابا کو آپ نے منانا ہے.......!" داور شرماتے اور کھسیاتے کی اداکاری کرتا بولا تو زارون کی آنکھیں پھٹنے کو ہوگئیں۔

"اوئے تو....... اگ تو لے۔ ادرک جتنا ہے تو اور شادی کا سوچ رہا ہے۔ نانی بی کو تیرے لیے نہیں میرے لیے پسند آئی ہوگی۔ کیوں نانی بی......!"

لو جی زارون کی اپنی گاڑی پٹڑی توڑتی آ کھڑی ہوئی تھی۔ داور غصے سے سیدھا ہوا۔

"بک مت۔ بھابھی ہے تیری۔"

"میری نہیں تیری....... سمجھا....... آنکھیں نکال دوں گا جو بری نگاہ ڈالی.......!" زارون نے سینہ تانا۔

"اپنی آنکھیں تو سیٹ کرالے پہلے جو عینک کے بنا دیکھ بھی نہیں سکتیں۔ لڑکی خاک دیکھے گا تو۔"

"لڑکی دل کی آنکھ سے دیکھی جاتی ہے داور۔ دل کی۔" زارون سینے پہ دوہتڑ مارتا ہوا بولا تو نانی پیاری نے آئسکریم پیتے ہوئے اسے ترحم سے دیکھا۔

"تیرا دل تو ہر لڑکی دیکھ کے ڈیلے باہر نکال لیتا ہے۔ مہر لالہ سے کہہ کے سلائیاں پھرا دوں گا....... سمجھا۔"

"او بند و کر لو تم دونوں اپنی ٹر ٹر۔ میرے

پچھلوں کی توبہ۔ جو تم جیسے نیشوں کے آگے کبھی کوئی بات کروں۔ اور تُو زارون۔ تُو تو واقعی اپنی ماں کی سب سے وڈی نیش اولاد ہے جو اس نے اپنے مغروں اتار کے یہاں انی ڈالنے بھیج دی ہے۔ دفع دور ہو تم لوگ......!"

نانی پیاری دونوں کے لتے لیتے ہوئے اٹھ کھڑی ہوئیں۔ چپل میں پیر گھسیڑ کے دونوں کو کینہ توز نگاہوں سے گھورتے ہوئے ایک ہاتھ گال پہ رکھتے دوسرے میں آئسکریم کا خالی باؤل لیے لاؤنج سے نکل گئیں۔ پیچھے زارون اور داور نے سکون سے نیم دراز ہوتے اپنی اپنی ہینڈ فری جیبوں سے نکالیں۔

"یار داور یہ نیش کون سی اولاد ہوتی ہے بھلا؟" زارون نے ہینڈ فری کان میں گھساتے ہوئے موبائل سیدھا کیا اور داور سے پوچھا۔

"سب سے بابرکت بچہ...... اسے کہتے ہیں نیش جیا!" جواب میں داور نے بھی اسی معصومیت سے جواب دے کر اپنی ہینڈ فری کانوں میں لگا لی تھی۔ اب دونوں ٹھنڈے ہو کے موبائل میں گم ہو چکے تھے۔

☆☆☆

زمن ساکت سی سانس بھی تھم تھم کے لیتی ڈاکٹر مہر یار کے بالکل سامنے ریوالونگ چیئر پہ ٹانگ پہ ٹانگ رکھے بیٹھی تھی۔ وہ دبو قسم کی لڑکی نہیں تھی پر اتنی بولڈ بھی نہیں تھی کہ بلاوجہ ماحول میں ڈھلنے کی خاطر کچھ بھی کرتی پھرتی۔ وہ ادھر ادھر دیواروں پہ لگی پینٹنگز دیکھ دیکھ کے حفظ کر رہی تھی۔ کبھی نگاہ گلاس ٹاپ والے ٹیبل پہ رکھی نقلی کھوپڑی پہ جا پڑتی جس کا منہ اسی کی جانب تھا تو ایک بار پہلو لازمی بدلتی۔ کیسی بدہیئت سی تھی، وہ سوچتی اور دوبارہ دیواریں تاڑنے لگتی۔ دل میں آنٹی رباب کی دہائی جاری تھی کہ کہیں سے بس وہ واپس آئیں تو یہاں سے جان چھوٹے۔ سامنے ڈاکٹر مہر یار حیات سکون سے اپنے سامنے پھیلے کاغذات میں گم تھا۔ ایک فسوں تھا جو کمرے میں طاری تھا۔ زمن کو ہی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ آخر کون سی چیز تھی جو اس کے اعصاب پہ سوار ہو رہی تھی۔ اس نے بغور ڈاکٹر مہر یار کو دیکھا۔ روشن کشادہ پیشانی۔ لمبی پلکوں والی ہلکی بھوری آنکھیں۔ ابرو درمیان سے ملتے تھے۔ اونچی ناک اور بڑھی ہوئی شیو۔ بالوں کا فلفی سا ہیئر کٹ ڈاکٹر جیسے معتبر بندے کے لیے عجیب تو تھا لیکن اسے بے حد جچ رہا تھا۔ گھنی مونچھوں کے ساتھ بڑھی ہوئی شیو۔ وہ ایک مکمل پیکیج تھا۔ یہ خیال ذہن میں آتے ہی زمن کو ہنسی آئی جسے اس نے اپنے بیگ میں منہ دے کر روکا۔

"میرا جائزہ تو آپ ایسے لے رہی ہیں جیسے رشتہ کروانا ہے۔"

ڈاکٹر مہر یار کی آواز پہ اس کے ہاتھ تھرا سے گئے۔ شرمندگی کا شدید احساس حواسوں پہ حاوی ہوا۔ وہ سیدھی ہوتے ہوئے بولی۔

"ک...... کون بھلا...... میں...... میں جائزہ لے رہی ہوں۔ میں؟" وہ استہزائیہ اپنے سینے پہ انگلی رکھتے ہوئے بولی۔

"کیا آپ کے علاوہ یہاں کوئی ہے جسے کہوں گا۔ آپ ہی ہیں جو مسلسل دیکھ رہی ہیں؟" اسی مصروف انداز میں جواب فوراً آیا۔ زمن نے چیئر دوسری جانب گھمائی اور بولی۔

"پاگل نہیں ہوں میں۔ ویسے بھی صبح کے ٹکراؤ کے بعد کوئی اچھا امپریشن نہیں چھوڑا آپ نے مجھ پہ...... وہی سوچ رہی تھی کہ دن کو دکھائی دینے والے شام میں کیا ہو جاتے ہیں......!"

مہر یار نے ایک اچٹتی نگاہ اس کی پشت پہ ڈالی اور مسکرا کے سر جھٹکتا واپس کام کرنے لگا۔

"اچھی بات ہے۔ سوچ کا کیا ہے جیسی بھی آجائے آنے دینا چاہیے ورنہ دماغ کو پراگندہ کرتی ہے۔ اب آپ کو مجھے ایسا کہہ کے سکون تو مل ہی گیا ہوگا۔ رائٹ۔"

زمن ایک جھٹکے سے واپس گھومی اور بولی۔

"میرا دماغ کبھی گندا نہیں ہوا۔ میری بہن کا علاج کر کے احسان ضرور کر رہے ہیں لیکن باتیں سنا کے ضائع تو نہ کریں۔ میں ذرا آنٹی رباب کو دیکھ لوں۔"

اس سے پہلے کہ مہریار حیات اس پہ دوبارہ کوئی جملہ اچھالتا، وہ جلدی سے اٹھی اور کمرے سے باہر نکل گئی۔ مہریار کے لبوں کی مسکراہٹ گہری ہوئی لیکن وہ ہنوز کاغذات پہ قلم چلانے میں مصروف تھا۔ اس نے زمن کو روکا نہیں تھا۔

باہر نکل کر دروازہ بند کرتے ہی زمن کو لگا جیسے وہ کسی قید سے آزاد ہوئی ہے۔ دو چار لمبی سانسیں کھینچ کے اس نے دل میں اعتراف کیا کہ اندر کمرے میں موجود شخص کا سحر جیسے ہر شے پہ حاوی تھا۔ وہ سر جھٹک کے، ہونٹوں کو گول کر کے لمبا سانس چھوڑتی اس جانب چل دی جدھر آنٹی رباب گئی تھیں۔ اس نے سوچ لیا تھا کہ وہ پارکنگ میں ان کا ویٹ کر لے گی لیکن واپس ڈاکٹر مہریار حیات کے آفس میں نہیں آئے گی۔

☆☆☆

گھر آتے آتے دونوں کو کافی وقت ہو گیا تھا۔ ہاجرہ بے چینی سے ان کی منتظر تھیں۔ رباب آنٹی اسے ڈراپ کرتے ہوئے کچھ دیر کے لیے اندر آئی تھیں اور ہاجرہ کو مکمل تسلی دلاسا دینے کے بعد گئی تھیں۔ وہ مطمئن تو ہو گئی تھیں لیکن دل کے وہم نہیں جاتے تھے۔

زوہا کے سونے کے بعد زمن چائے کے مگ لیے لاؤنج میں آ گئی تھی۔ ہاجرہ کو مگ پکڑاتے ہوئے اس نے ٹوکا۔

"اب کیا ہے امی۔ کیوں سوچ سوچ کے ٹینشن لے رہی ہیں۔ رباب آنٹی نے کہا ہے نا سب اچھا ہو گا۔ بس اب فکر نہ کریں اور آپریشن کی تیاری کریں۔ ایک بار آپریشن ہو گیا تو ڈاکٹر کہہ رہا تھا زوہا کو ریکور ہونے میں زیادہ وقت نہیں لگے گا۔ ابھی بھی اگر دیر نہ کی گئی ہوتی تو زوہا کب کی چل پھر رہی ہوتی، لیکن جو ہوتا ہے اچھے کے لیے ہوتا ہے۔ اس کا آپریشن لیٹ ہونے میں کوئی تو بہتری ہو گی نا۔ آپ یہ سوچیں کہ نا ہمارے پاس رقم ہے نہ کوئی زیور جو بیچ کے زوہا کا علاج کرواتے، تو ایسے میں رباب آنٹی کے ذریعے آپ سمجھیں کہ بس کوئی غیبی مدد ہوئی ہے ہماری......"

صوفے سے کمر ٹیکے، پلکیں موند کے چائے کے سپ لیتی اور باتیں کرتی وہ ہاجرہ کو بے حد تھکی ہوئی لگی تھی۔ محض ان کے ساتھ بیٹھ کے کچھ وقت تسلی دینے کی خاطر وہ چائے بھی بنا لائی تھی حالانکہ داڑھ نکلوانے کے بعد ڈاکٹر نے ہاجرہ کو گرم اشیاء سے پرہیز کا کہا تھا۔ لیکن انہوں نے زمن کو یاد دہانی نہیں کروائی تھی۔ وہ مسلسل انہیں باتوں سے مطمئن کر رہی تھی جبکہ اس کی آنکھیں نیند سے اس قدر بوجھل تھیں کہ وہ زبردستی انہیں کھولے ہوئے تھی۔ ہاجرہ نے دیوار گیر گھڑی کی جانب دیکھا، بارہ بجنے والے تھے۔ انہیں زمن پہ بے طرح ترس آیا۔ صبح پانچ بجے کی اٹھی وہ آج سارا دن بھاگ دوڑ میں لگی رہی تھی۔ چھوٹی سی عمر میں کس قدر مشقت اٹھانی پڑتی تھی اسے۔ اس سوچ نے ان کی آنکھیں نم کر دیں۔ زمن کی نیند کی سرخی لیے خوب صورت مڑی پلکوں والی آنکھوں کو دیکھ کے وہ ہمیشہ نگاہ چرا لیا کرتی تھیں۔ دل میں چٹکی لیتی یاد دردبھرا لاوا بن کے ابلنے لگتی تھی......!

"اچھا اٹھو اور جاؤ سو جاؤ۔ چائے مت پیو پوری۔ نیند چلی جائے گی۔ اٹھو شاباش، باقی سب صبح دیکھیں گے اب......"

اور وہ جیسے اسی انتظار میں تھی۔ آدھا چائے سے بھرا مگ ٹیبل پہ رکھ کے وہ کھڑی ہو گئی۔ ماں کا جھک کے گال چوما اور جوتی میں پیر پھنساتی اپنے کمرے میں چلی گئی۔ ہاجرہ نے ترحم سے اسے دیکھا اور پھر ٹیبل پہ رکھے چائے کے مگوں پہ نگاہ مرکوز کی۔ انہوں نے اپنے مگ سے گھونٹ بھی نہیں بھرا تھا۔ سوچیں اور فکریں بس بھنور کی طرح ان کے دماغ

میں چکراتی تھیں۔ کیسا کیسا وقت وہ گزار آئی تھیں لیکن آزمائشیں تمام ہونے کا نام ہی نہیں لیتی تھیں۔ ایک طویل مدت سے انہیں رات کو چین کی نیند سونا نصیب ہی نہیں ہو سکا تھا کیونکہ راتیں انہیں ہولاتی۔ رات کے سناٹے میں انہیں کسی کی چیخیں سنائی دیا کرتی تھیں اور وہ بیالیس سالہ خاتون ہو کے بچوں جیسا ڈر محسوس کرتی تھیں لیکن کہہ نہیں پاتی تھیں۔ کوئی کندھا ڈھونڈا کرتی تھیں جس پر سر رکھ کے وہ اپنے تمام خوف اور درد بھلا دیں۔ لیکن اس کندھے کا خیال آتے ہی اذیتوں کے نئے در وا ہو جاتے تھے جن سے چھٹکارا پانے کو کوئی راہ فرار نہ ملتا تھا۔

☆☆☆

زمن کمرے میں داخل ہوئی تو بیڈ دیکھ کے اس کا جوڑ جوڑ دہائیاں دینے لگا۔ وہ اوندھی دھپ سے بیڈ پہ لیٹ گئی۔ لیٹے لیٹے اس نے اپنی چپلیں ہلکے جھٹکے سے اتاریں اور پیر اوپر کر کے کروٹ لے لی۔ بند ہوتی نگاہوں کے سامنے سائیڈ ٹیبل پہ رکھا ہینڈ بیگ آ گیا۔ یک دم موبائل کا خیال آیا تو لیٹے لیٹے ہی ہاتھ گھسا کے اسے ٹٹولا اور نکال کے سوچ آن کیا۔ اگلے ہی پل اس کی نیند بھک سے اڑی تھی۔ وہ ایک جھٹکے سے اٹھ بیٹھی۔ یہ اس کا موبائل نہیں تھا بلکہ اسی ماڈل کا بالکل نیا نکور سیل فون تھا جس میں اس کی سم ڈالی گئی تھی۔

"یہ بھلا کیسے ممکن ہے۔ میرا تو سائیڈ سے کریک تھا۔" اس نے سوچا اور اپنے کانٹیکٹس دیکھنے لگی۔ سب ہی موجود تھے۔ میسجز چیک کیے۔ واٹس ایپ دیکھا تو کئی چیٹس اپڈیٹ نہیں ہو رہی تھیں۔ اس لمحے کسی انجان نمبر سے ایک میسج اس کی اسکرین پہ نمودار ہوا۔ اس نے فوراً اسے اوپن کیا اور جلدی جلدی پڑھنے لگی۔

"آپ کا سیل مجھ سے گر گر کے ٹوٹ گیا تھا۔ مجبوراً نیا لینا پڑا۔ اسی ماڈل کا ہے۔ کچھ ڈیٹا اگر مسنگ ہو تو اس کے لیے معذرت لیکن اس میں میرا قصور نہیں۔ آپ کا پرانا موبائل بیکار ہو چکا تھا، واپسی کی حالت میں نہیں تھا۔ اگلی دفعہ احتیاط سے سیڑھیاں چڑھیے گا۔ ضروری نہیں ہر بار آپ کا ڈیٹا محفوظ ہاتھوں میں جائے۔ بائے۔ ڈاکٹر مہریار حیات۔"

اور زمن کی نیند اڑی سو اڑی ہاتھوں کے توتے بھی اڑ گئے تھے۔ وہ فوراً چوکڑی مار کے بیٹھی اور ہاتھ میں تھاما۔

موبائل الٹ پلٹ کے دیکھنے لگی۔۔ اپنی عقل پہ ماتم کرنے لگی کہ موبائل لیتے وقت اسے اندازہ کیوں نہ ہو سکا تھا کہ یہ اس کا نہیں ہے۔ افففففففف! اس نے سر دونوں ہاتھوں میں گرا لیا تھا اور یاد کرنے لگی کہ اس کے موبائل میں کیا کچھ سیو تھا۔ اس کی اور زوہا کی تصویریں۔ امی کی تصویریں۔ اس کے اسکول فنکشنز کی پکچرز۔ اس کے اسکول لیسن پلانز کی اپ ڈیٹس۔ اس کی واٹس ایپ چیٹس میں پرنسپل کے ساتھ ہوئی اس کی وہ چیٹ بھی موجود تھی جس میں وہ ان سے درخواست کر رہی تھی کہ اسے سینئر سیکشنز دے دیے جائیں اور اس کی سیلری بھی امپروو کی جائے۔ جواب میں پرنسپل کی آئیں بائیں شائیں۔ سب ہی کچھ اس میں موجود تھا۔

یا اللہ......! اس کی آنکھیں بھر آئیں۔ کیا سوچتا ہوگا وہ ڈاکٹر کہ کیسے ترلے منتیں کر رہی ہے یہ پرنسپل کے۔ بے بسی، دکھ اور پھر ٹینشن۔ حواس ساتھ چھوڑنے لگے تو اسی لمحے اس نے اس میسج والے نمبر پہ کال بیک کر ڈالی۔ ایک بیل۔ دوسری اور پھر تیسری...... مسلسل بیلوں کے باوجود کسی نے کال پک نہیں کی تھی۔ وہ حیران بھی تھی اور پریشان بھی۔ کس سے بات کرے......؟ کیا آنٹی رباب کو بتانا ٹھیک ہو گا......؟ وہ کیا سوچیں گی کہ اس نے پہلے کیوں نہیں انہیں بتایا کہ وہ ڈاکٹر مہریار کو جانتی ہے، بھلے ٹکراؤ ہی ہوا تھا۔ کیا جواب دے گی وہ انہیں۔ اور کیا پتا آنٹی، ڈاکٹر مہریار سے پوچھ گچھ کر ڈالیں تو وہ آگے سے ہتھے سے اکھڑ جائے۔ زوہا کا علاج سر پر کھڑا تھا۔ وہ سخت پریشان ہو گئی تھی۔ اسے اپنا پرانا سیل فون ہر

صورت واپس چاہیے تھا۔ وہ جانتی تھی کہ کوئی بھی سیل فون ایسے ہی پھینک نہیں دیا کرتا بھلے سے وہ ٹوٹ ہی کیوں نہ جائے۔ تو ڈاکٹر مہریار نے پاس رکھ کے کرنا کیا تھا؟

"مجھے ہر صورت اپنا سیل واپس لینا ہے۔ دیکھتی ہوں کیسے نہیں دیتا ڈاکٹر کا بچہ...... آیا بڑا......!"

وہ بڑبڑاتی رہی۔ اس نے دوبارہ کال ملائی لیکن کسی نے پک نہیں کی تو ہاتھ میں تھامے سیل کو تنفر سے دیکھا اور سائیڈ ٹیبل پہ رکھ دیا۔ اسی کروٹ کے بل لیٹ کے اسے دیکھے گئی۔ عین اسی وقت دوبارہ اسکرین بلنک ہوئی تو اس نے فوراً جھپٹ کے موبائل پکڑا۔ ایک اور میسج آیا ہوا تھا۔

"بیکار میں کالز کر کے اپنا اور میرا وقت ضائع نہ کریں۔ میں انجان کالز اٹینڈ نہیں کرتا...... شکریہ"

زمن کے جسم کا سارا خون سمٹ کے چہرے پہ آ گیا۔ اسے شدید ہتک کا احساس ہوا تھا۔ ایک پل کو دل کیا کہ اس سیل فون کو دیوار پہ دے مارے۔ دو تین لمبے لمبے سانس لے کے خود کو پرسکون کیا اور لیٹ گئی۔

"میں بھی جب تک اپنا سیل تم سے واپس نہیں لے لیتی تمہاری جان نہیں چھوڑنے والی۔ بھلے مجھے اس کا سرمہ بنا ہوا ہی کیوں نہ ملے۔"

وہ تصور میں ڈاکٹر مہریار حیات سے مخاطب ہوئی۔ نیند میں جانے تک وہ یہی سوچتی رہی تھی کہ کل کا سارا دن وہ کتنی بار اور کب کب ڈاکٹر مہریار کے نمبر پہ کال کرے گی۔

☆☆☆

بائیں ہاتھ میں کافی کا مگ تھامے اور دوسرے ہاتھ سے لیپ ٹاپ پہ انگلیاں چلاتے مہریار کے ہونٹوں پہ مبہم سی مسکراہٹ تھی لیکن چہرے کے تاثرات جامد اور سرد تھے۔ اس نے ایک نظر قریب پڑے اپنے موبائل پہ ڈالی جہاں ابھی کچھ دیر پہلے زمن کی کالز نے ادھم مچایا ہوا تھا۔ وہ سکون سے اپنے موبائل کی رنگ ٹون سنتا رہا تھا۔ لیکن کال پک نہیں کی تھی۔ اسے کرنی بھی نہیں تھی۔ وہ لاابالی نوجوان تو تھا نہیں کہ کسی کے بچگانہ سوالوں کے جواب دیتا۔

"میرا سیل کہاں ہے۔ آپ نے کیوں واپس نہیں کیا۔ ٹوٹا ہوا ہی دے دیں۔ مجھے کیسے یقین ہو کہ ٹوٹ گیا ہے۔ وغیرہ وغیرہ۔"

ایسے ہی سوال ہوتے جو زمن اسے کال پک کرنے پہ پوچھتی۔ اور ان سب کا جواب اس کے پاس تھا لیکن وہ زمن کو دینے کے لیے نہیں تھا۔ لہٰذا اس نے کالز پک نہیں کی تھیں اور زمن کو دو ٹوک سا میسج کر کے اس کا دماغ یقیناً تپا ڈالا تھا۔

اس نے مگ سے آخری چند گھونٹ ایک سانس میں ختم کیے کرسی سے کمر ٹیک کے سیدھا ہو بیٹھا۔ نگاہیں لیپ ٹاپ کی روشن اسکرین پہ جمی تھیں لیکن دماغ ماضی کی بلیک اینڈ وائٹ فلم چلا رہا تھا۔ اس کی کنپٹیاں سلگ رہی تھیں۔ سر میں ہلکی ہلکی درد کی ٹیسیں اب شدت اختیار کرنے لگی تھیں۔ وہ جانتا تھا کہ اسے فوری طور پہ اپنا دھیان بٹانا ہوگا ورنہ رات بہت بھاری گزرنے والی تھی اس کے لیے۔

اس نے ہاتھ بڑھا کے ٹیبل کا دراز کھولا اور اس میں سے زمن کا پرانا سیل فون نکالا۔ اس کے اندر اب اس کی اپنی دوسری سم پڑی ہوئی تھی لیکن زمن کا وہ ڈیٹا جو فون کی میموری میں محفوظ تھا جوں کا توں موجود تھا۔ اس نے گیلری اوپن کی۔ تصویروں کا جہان وہاں آباد تھا۔ زمن کی ایک تصویر اوپن کی۔ کچھ پل اسے بغور دیکھا۔ اس کی سفید اجلی رنگت اور کھڑی ناک اور بڑی پلکوں والی آنکھیں دیکھ کے اس کے ماتھے پہ نامحسوس سے بل پڑ گئے۔ آنکھوں کے کنارے سکڑ گئے۔ اس نے اسے زوم کیا تو تیکھی ناک میں موجود چھوٹے سے کالے نگ والی لونگ پہ نگاہ جم گئی۔ چہرہ پہلے سے زیادہ سپاٹ ہو گیا۔ اس نے اس پکچر کو کلوز کیا اور گیلری کو اسکرول کرتا گیا۔ ایک اور تصویر پہ اس کا انگوٹھا رکا اور اسے اوپن کر دیا۔ اس تصویر میں درمیان میں ہاجرہ

تھیں اور دونوں پہلوؤں میں زمن اور زوہا موجود تھیں۔ وہ یک ٹک اس تصویر کو دیکھتا چلا گیا۔

☆☆☆

صبح سے "حیات مینشن" میں ہنگامہ برپا تھا۔ تائی پیاری نے سارے لڑکوں کی مت ماری ہوئی تھی۔ گھر کے پنکھے دیواریں صاف کروا رہی تھیں، وہ بھی گھوڑی پہ چڑھا کے۔ زارون نے سب سے پہلے جالے اتارنے والا ڈنڈا اٹھایا تھا اور بنا کہے شروع ہو گیا تھا۔ یہ نسبتاً آسان کام تھا۔ داور نے دیواریں صاف کرلی تھیں۔ یاور اس کی مدد کو موجود تھا۔ کیونکہ وہ داور کو کبھی اکیلا چھوڑ ہی نہیں سکتا تھا۔ رہ گیا شہریار تو وہ تائی پیاری کے ہاتھ آیا تھا اور انہوں نے اسے گھوڑی پہ چڑھا کے پنکھے صاف کرنے پہ لگا دیا تھا۔ شہریار تو چڑھتے ہوئے ڈولا تھا۔ جب چڑھ گیا تو سر ڈولنا شروع ہو گیا اور اب متلی کی شکایت ہو رہی تھی۔

"تائی پیاری! مجھے اگر الٹی ہوگئی تا تو فضلو سے کہنا فضلہ صاف کردے، پلیز!"

شہریار گھوڑی پہ پیروں کے بل بیٹھا سینہ مسل رہا تھا۔ نیچے گھوڑی کو تھامے فضلو نے ناسمجھی سے سر پہ خارش کی اور منہ اوپر کیے بولا۔

"لیکن آپ نے تو جی الٹی کا کہا۔ آپ کا فضلہ منہ سے۔"

"بکواس بند کر فضلو۔ ورنہ یہ سرف سے بھرا باؤل اوپر سے تیرے حلق میں انڈیلوں گا۔ سارا دن منہ سے بلبلے نکلیں گے۔" شہریار کو ویسے ہی اس پہ غصہ چڑھا ہوا تھا، فضلو نے مزید ہوا دے دی تھی۔

"تائی پیاری! آپ اس سے کیوں نہیں کرواتیں پنکھے صاف...... یہ کیا گھاس کھانے کے لیے رکھا ہوا ہے ہم نے...... نیچے کھڑا میری گھوڑی کو ہچکیے جھٹکے دے رہا ہے بس۔"

"وزن تک (دیکھ) اس کا۔" تائی پیاری نے فضلو کو گھور کے شہریار کو گھورا۔ "اس سانڈ کو اوپر چڑھا دوں تا کہ گھوڑی بچے نہ یہ کھوتا۔ تُو تو چھال مار کے صوفے پہ کود جائے گا، یہ اگر کودا تو صوفہ فرش میں وڑ گھس جائے گا۔ اس لیے چپ کر کے پنکھے صاف کر۔ ابھی اس ہٹلر کے کمرے کا بھی کرنا ہے۔"

"تابابا تا......" شہریار نے گیلا کپڑا سرف سے بھرے باؤل میں پھینکا۔ اس کے چھینٹے نیچے کھڑے فضلو کے منہ پہ گرے۔ "مہرلالہ کا پنکھا صاف کرنے سے بہتر ہے میں اسی سے لٹک کے جان دے دوں۔ پچھلی بار کیا تھا تا تو اس فضلو نے پنکھا چلا دیا تھا۔ میں کسی مسکین کھڑے کے بلب کی طرح جھولتا رہ گیا تھا تائی پیاری۔ سوچیں گول گول گھومتا کیسا لگا ہوں گا۔"

وہ مسلسل پنکھے کو ایک ہی جگہ سے صاف کرتا مبالغے سے کام لے رہا تھا۔ فضلو نے گھوڑی چھوڑ کے دونوں ہاتھ کمر پہ دھرے اور لڑتے کے انداز میں بولا۔

"تا شہری بھائی...... میں نے کب پنکھا چلایا تھا۔ میں تو اندر تھا ہی نہیں آپ کے ساتھ۔ مجھ غریب کی ہی پتلی گردن دکھتی ہے۔ جو چاہے الزام لگا دیتے ہیں۔"

"کس نے کہا تیری گردن پتلی ہے فضلو۔ میرے جیسی چار نکل آئیں گی تیری ایک گردن سے۔" شہریار اپنے دھیان میں پنکھا صاف کر رہا تھا۔ وہ نہیں جانتا تھا کہ فضلو نے گھوڑی چھوڑ رکھی ہے۔ جیسے ہی کپڑا سرف میں بھگونے کے لیے سر نیچے کیا، فضلو کو بے رحمی سے ایک فٹ کے فاصلے پہ کینہ توزی سے خود کو دیکھتا پایا۔ شہریار کے آگے سارا پنکھا چھت سمیت گھوم گیا۔

"فضلو گھوڑی پکڑ۔ پکڑ گرنے لگا ہوں میں۔ او فضلو...... مروائے گا تو...... پکڑ...... میرا ایگزام ہے پرسوں ٹوٹی ٹانگ کے ساتھ جاؤں گا کیا۔ پکڑ فضلو...... کمینے...... حیا کر۔"

جب پتا نہیں تھا تو سکون سے پنکھا صاف کر ڈالا تھا۔ اب جب دیکھ لیا تھا کہ فضلو گھوڑی چھوڑ چکا ہے تو ٹانگیں خود بخود کانپ گئی تھیں نتیجتاً گھوڑی بھی

تھرتھرانے لگی۔ شہریار پیروں کے بل بیٹھ گیا۔ ہاتھ سرف کے باؤل کو لگا وہ لڑھک کے فضلو کے اوپر آ گرا۔

نانی پیاری اس افتاد کو دیکھ کے اونچی اونچی باقی تین کو آوازیں لگانے لگیں۔ "او یاور، داور......او زارون......اندر آؤ منڈیو......شہری نو پھڑو......ڈگن لگا جے تھلے۔"

تینوں بوتل کے جن کی طرح ایک ساتھ ایک دوسرے کو پچھاڑتے اندر داخل ہوئے تھے اور سیدھا گھوڑی کے قریب فرش پہ گرے سرف والے پانی پہ بریک لگایا تھا اور تینوں ایک ساتھ فرش بوس ہو چکے تھے۔ ایک کی ٹانگیں آنکھیں ملتے فضلو کو لگیں اور وہ منہ کے بل انہی تینوں پہ آ رہا۔ باقی سب جھٹکے گھوڑی کو برداشت کرنے پڑے جس کے نتیجے میں وہ الٹ کے جا پڑی تھی۔ نانی پیاری حیران پریشان سی سارے لاؤنج کی ابتر صورت حال دیکھ رہی تھیں۔ ان کو ملال نہیں جا رہا تھا کہ وہ کن کو شہریار کی مدد کے لیے آوازیں دے بیٹھیں۔ وہ تینوں تو ملبے کی طرح فرش پہ بکھرے پڑے تھے جب کہ شہریار کب کا گھوڑی سے سیدھا صوفے پہ چھلانگ لگا کے خود کو محفوظ کر چکا تھا۔ اب صوفے پہ ہی پیروں کے بل بیٹھا ان تینوں کو تاسف سے تک رہا تھا۔

داور اور یاور کے چہرے کے تاثرات خاصے تکلیف دہ تھے کیونکہ ان دونوں کے اوپر فضلو جیسا تنومند گرا ہوا تھا۔ اور سب سے زیادہ بے چاری صورت زارون کی تھی جو ایک ہاتھ میں عینک تھامے تھا اور دوسرے میں اس کی ٹوٹی ٹانگ۔ نانی پیاری کا یہ پہلا تجربہ نہیں تھا۔ جب بھی ان چاروں کو کوئی کام کہا تھا آفتیں ایک ساتھ اتر آئی تھیں لیکن ایسی ابتری دیکھ کے انہوں نے فیصلہ کر لیا تھا کہ یہ تجربہ آخری تھا۔

☆☆☆

سنہری بیگم کا سنہری پاندان چھالیہ سے بھرا ہوا تھا پھر بھی وہ سروتے سے مزید کاٹ کاٹ کے ڈھیرے جا رہی تھیں۔ دھیان مسلسل شہزور اور چوہدری قاسم کی جانب لگا ہوا تھا۔ ایک زمانہ بیت گیا تھا حویلی نے سکون کا ماحول نہیں دیکھا تھا۔ ہر وقت جیسے محاذ کھلے رہا کرتے۔ شہزور کے جوان ہونے کے بعد باپ بیٹے میں بھی ٹھنتی چلی گئی۔ کبھی خیال بھی نہ آیا کہ دونوں یوں آمنے سامنے آن کھڑے ہوں گے۔ وہ بھی کس کے لیے۔ ایک بدذات کے لیے۔ وہی بدذات جس کی وجہ سے ان کی شادی شدہ زندگی ایک ان دیکھے جمود کا شکار رہی۔ ہمیشہ وہی ہر طرف چھائی دکھائی دی۔ ان کی راجدھانی میں ہمیشہ سے ایک گھس بیٹھیا رہا تھا اور وہ نہ اسے کبھی پکڑ پائی تھیں نہ اس پہ تسلط جما پائی تھیں کیونکہ اس کا وجود یہاں موجود نہیں تھا لیکن اس کے وجود کی تاثیر ہمیشہ رہی تھی چہار باغ حویلی میں۔ وہ جا کے بھی کبھی نہیں گئی تھی۔ سروتے پہ غصہ نکال نکال کے تھک گئیں تو اسے پٹخ ڈالا۔ غصے سے ملازمہ کو آواز دی۔ ایک تختی سی درمیانی عمر کی عورت وہاں آن موجود ہوئی۔

"کہاں مری ہوئی ہو۔ ایک سے دوسری آواز بھی کیوں دینی پڑتی ہے تم لوگوں کو کم بختو۔ ہزار بار کہا ہے کہ آس پاس رہا کرو۔ پوری کھیپ ہے حویلی میں لیکن وقت پہ ایک بھی سامنے نہیں دکھتی۔ اب سے جب تک میں یہاں بیٹھوں سایہ بنی کھڑی رہا کر۔ آئی سمجھ!"

ملازمہ نے بے چارگی سے سر ہلا دیا۔ ساری الجھن اور کثافت اس غریب پہ نکال کے سنہری بیگم نے چھالیہ کے دو دانے منہ میں ڈالے اور اس ملازمہ سے بولیں۔

"جاؤ ذرا چپ کر کے دیکھ کے آ کہ باہر شہزور کا ڈرائیور موجود ہے یا نہیں۔ مجھے لگتا آج پھر نکل گیا صبح صبح یہ دوبارہ۔"

ملازمہ سر ہلاتی وہاں سے جانے لگی تو اسی وقت تک سک سے تیار چوہدری شہزور راؤ وہاں داخل ہوا۔ ایک کٹیلی نگاہ ملازمہ پہ ڈالی تو وہ ہوائیاں اڑاتا چہرہ لیے وہاں سے ہوا ہو گئی۔

"کیوں میری جاسوسی کرواتی ہو اماں۔ کیا کر رہا ہے۔ کدھر جا رہا ہے۔ کس سے مل رہا ہے۔ کیوں پتا کرواتی پھرتی ہو۔ وہ بھی ایک ملازمہ سے۔"

شہزور خفا سا اماں کے پاس بیٹھ گیا اور آگے سے پاندان گھسیٹ کے اپنے سامنے کیا۔ دو دانے چھالیہ کے منہ میں ڈالنے کی نیت سے اٹھائے پر پھر واپس چھنک دیے۔ سنہری بیگم نے بھنویں اچکاتے اس کی حرکت ملاحظہ کی اور نرم لہجے میں گویا ہوئیں۔

"میرا لعل ہے تُو۔ میری جان کا ٹکڑا۔ میرا کلیجہ سڑتا ہے جب سارا سارا دن تو تپتی سڑکوں پہ گاڑی دوڑاتا ہے شہزور۔ نہیں ملنے کی وہ تجھے۔ سچ پوچھ تو میں چاہتی ہی نہیں کہ وہ تجھے ملے۔ بہت ہوگئی خواری۔ بس کر اب۔ سیدھے سیدھے پسند بتا ورنہ کرنے لگی ہوں اپنی مرضی سے تیرا رشتہ۔"

"او اماں......" شہزور نے ہاتھ اٹھا کے ماں کو مزید بولنے سے روکا۔ "مجھے جس سے جب شادی کرنی ہوگی نا کھڑے کھڑے دو بول پڑھوا کے لے آؤں گا۔ تُو مفت میں جان نا کھپا۔ بس ویسے کی تیاریاں کر اور رہ گئی میری جاسوسی تو اماں میں جتنا چاہوں گو تجھے پتا لگواؤں گا اپنا ورنہ شہزور راؤ کو کوئی ڈھونڈ نہیں سکتا۔ کہاں جاتا ہوں۔ کس سے ملتا ہوں وہ میں خبر دے دیتا ہوں تا کہ تیری تسلی رہے ورنہ تجھے لگتا ہے کہ یہ حویلی کے گرگے میری گرد بھی پا سکتے ہیں۔"

"شرم کر جا کچھ شہزور۔ اتنا زور آور نہ بن۔ تیرا باپ کوئی نہیں سہہ رہا تجھے اور تُو ہے کہ دماغ کو ستوں آسمان تک پہنچا کے بیٹھا ہوا ہے۔ تیری حرکتیں نہ سدھریں نا، پتر تو اپنے پیو کو جانتا ہے تُو منٹ نہیں لگاتا اس نے عاق کرتے۔"

شہزور راؤ استہزائیہ ہنسا اور گاڑی کی چابی کو لاپروائی سے کان میں پھیرنے لگا۔ سنہری بیگم تاؤ کھا گئیں۔

"ماں کا ادب ہی کر لیا کر پتر۔ تیرے ہی کم آتا ہے۔ تجھے کیا لگتا ہے ایسے کرنے سے تیرے پیو نے تیری بات مان لینی ہے۔ اللہ جانے کس ڈھابے پہ بیٹھ کے پڑھا ہے تو نے۔ ولایت بھیجا تھا کہ عقل سیکھ کے آئے گا۔ پر تُو چھلی بھی گوروں کو دے آیا ہے تُو۔"

"ہاہاہا!!!" شہزور کھل کے ہنسا کہ اس کے خوب صورت دانت دکھائی دینے لگے۔ "ڈگری لی ہے اماں آئی ٹی کی۔ کچی اور پکی۔ لیکن اندر سے دیسی ہوں نا تو خو بو نہیں بدلی۔ اور فطرت تو بدل ہی نہیں سکتی نا اماں۔۔۔ میری چیز گمی ہے اسے ڈھونڈوں گا تو کہیں نا میں، پھر چاہے اپنے ہاتھ سے توڑ کے پھینک دوں۔"

آخری جملہ کہتے شہزور راؤ کا لہجہ پتھریلا ہو گیا تھا۔ سنہری بیگم نے تاسف سے اسے دیکھا اور کچھ کہنا چاہا لیکن شہزور نے ہاتھ کھڑا کر کے خاموش کروا دیا۔

"جا رہا ہوں شہر۔ ایک دو ضروری کام ہیں فیکٹری کے بھی۔ ابا کو بتا دینا۔ صرف سڑکیں نہیں چھانتا کام بھی کرتا ہوں۔ شام تک آ جاؤں گا واپس۔ چلتا ہوں۔ رب راکھا۔"

بنا کوئی جواب سنے ایک ہاتھ سے چادر کا پلو جھٹکتا اور دوسرے سے مونچھوں کو تاؤ دیتا وہ نکلتا چلا گیا۔ سنہری بیگم نے اس کی چوڑی پشت کو دیکھ کے زیر لب کچھ پڑھ کے اس پہ دم کیا اور واپس پاندان اپنے آگے گھسیٹ کے سروتا اٹھا لیا۔ کم از کم چھالیہ کترتے وہ تصور میں کسی کا وجود کترنے کا مزا تو لیتی تھیں۔

☆☆☆

مہریار کسلمندی سے بیڈ کراؤن سے ٹیک لگائے بیٹھا تھا۔ ایک ہاتھ سر کے اوپر سے مسلسل بالوں میں پھر رہا تھا۔ اور دوسرا ہاتھ میں تھامے موبائل کو سکرول کر رہا تھا۔ رات بھی سوئی جاگی کیفیت میں کٹی تھی۔ اب اٹھا تھا تو سر عجیب بھاری ہو رہا تھا۔ کندھوں پہ جیسے بوجھ سا تھا۔ اس نے کبھی سوچا بھی نہ تھا کہ وہ کسی انجان لڑکی کی وجہ سے ایسی ٹینشن میں رات گزارے گا۔ زندگی سے عورت ذات کا پتا

اس نے کتنے سال ہوئے اکھاڑ کے پھینک دیا تھا۔

اب اچانک سے یہ عورت اینٹری اسے جھنجلاہٹ میں مبتلا کر رہی تھی۔ اس نے زمن کے موبائل کا سارا ڈیٹا سیو کر لیا تھا۔ کیوں کیا تھا اس کی وجہ ابھی اسے خود بھی معلوم نہیں تھی۔ اتنا ضرور تھا کہ کبھی نا کبھی وہ اس کے کام آ سکتا تھا یا شاید کبھی بھی نہ آتا۔

منتشر خیالی کے ساتھ اس نے سائیڈ ٹیبل کی دراز کھولی اور برانڈڈ سگریٹ کی ڈبی سے ایک سگریٹ نکال کر لبوں میں پھنسایا۔ وہ اسموکر نہیں تھا لیکن کبھی کبھار ذہنی دباؤ کے زیر اثر یا اعصابی تھکان کی وجہ سے ایک آدھ پی لیا کرتا تھا۔ ایک لمبا کش لے کر اس نے آنکھیں موند لی تھیں۔ فی الحال وہ اپنے دماغ کو پرسکون کرنا چاہتا تھا۔ ابھی اگلے لائحہ عمل کے لیے وہ بالکل تیار نہیں تھا نہ ہی کوئی سرا ہاتھ آتا تھا۔ سگریٹ کی راکھ جھاڑتے ہوئے اس نے زوہا کے آپریشن کے بارے میں سوچنا شروع کیا۔ یوں کچھ دیر کے لیے ہی سہی لیکن اس کا دھیان بٹ گیا تھا۔

زوہا کا آپریشن کوئی آسان ٹاسک نہیں تھا جبکہ خاصی تاخیر بھی ہو چکی تھی۔ لیکن اسے ہر صورت اسے انجام دینا تھا۔ اس کے لیے وہ ہر ممکن اقدامات سوچ چکا تھا۔ جیسے بھی ہو اسے اس آپریشن کو کامیاب بنانا تھا۔ زمن کے گھریلو حالات کا اندازہ ایسے ہی ہو سکتا تھا کہ وہ اس کے قریب ہو جاتا اور قریب ہونے کے لیے اس کے پاس ایک مستند ذریعہ موجود تھا۔

وہ ابھی یہی سب باتیں سوچ رہا تھا کہ اس کے موبائل پہ کال ہوئی۔ اس نے نمبر دیکھا۔ زمن کال کر رہی تھی۔ ایک نگاہ دیوار گیر گھڑی پہ ڈالی۔ صبح کے پونے آٹھ ہو رہے تھے۔ طویل سانس بھر کے اس نے کال اٹینڈ کی تو آگے سے زمن کی تیز تیز لہجے میں بولتی آواز سنائی دی۔

" مجھے میرا موبائل واپس دیں۔۔ جیسا بھی ہے، جو بھی اس کی حالت ہے مجھے واپس کر دیں۔ آپ کا کوئی حق نہیں بنتا کہ میرا موبائل رکھ لیں۔ واپس کریں۔۔ بتائیں کب آؤں لینے۔"

"میرے حق کی بات دوبارہ نہ کیجیے گا مس زمن، کیونکہ میں پرائی چیز پہ استحقاق کبھی نہیں جماتا۔ باقی رہ گئی آپ کے سیل کی واپسی کی بات تو وہ نہیں مل سکتا کیونکہ اس کا نام و نشان بھی مٹ چکا ہے۔ اور جب آپ کا دل کرے آپ آیے۔ گپ شپ کیجیے گا سکون سے۔" وہ متوازن لہجے اور انداز میں کہتا زمن کا دماغ بھک سے اڑا کر کال بند کر گیا تھا۔

دوسری طرف زمن کو اس کی گفتگو کا پہلا جملہ کھٹک گیا تھا۔ میں پرائی چیز پہ استحقاق کبھی نہیں جماتا۔

تو کیا یہ میرا اسیل فون پرایا نہیں تھا کیا؟ عجیب بد دماغ انسان ہے یہ۔ وہ گومگوں کی کیفیت میں تھی۔ کچھ سجھائی نہیں دے رہا تھا کہ آخر وہ ڈاکٹر شہریار کا کیا حشر کر دے۔ اسے سمجھنا دشوار تھا کہ اسے ہتک زیادہ محسوس ہو رہی تھی یا بے بسی۔

☆☆☆

چوہدری حاکم کی لینڈ کروزر حویلی کے گیٹ سے آگے رکی تھی۔ ٹائروں کے چرچرانے سے دھول اڑی تھی جس سے ملازم متوجہ ہوتے فوراً بھاگے آئے تھے۔ چوہدری حیات راؤ صحن میں گاؤں کے مردوں کے ساتھ بیٹھے تھے اور حالات حاضرہ پہ تبصرے جاری تھے۔ چوہدری حاکم کو اندر آتے دیکھا تو سب ہی مرد حضرات اٹھ کھڑے ہوئے سوائے حیات راؤ کے جو چوہدری حاکم کے بالکل قریب آنے پہ خیر مقدمی مسکراہٹ سجائے اپنی جگہ سے اٹھے تھے۔

چوہدری حاکم کسی زمانے میں ان کے قریبی دوستوں میں شمار ہوا کرتے تھے لیکن حالات نے یا مصلحتوں نے دونوں میں تکلف کی دیوار حائل کر دی تھی۔ چوہدری حیات راؤ کو چوہدری حاکم کے اصولوں اور طور طریقوں پہ شروع سے اعتراض ہوتا تھا لیکن کبھی بدمزگی نہیں ہوئی تھی۔۔ پھر حالات نے چکر کھایا اور شہاب الدین راؤ بستر سے جا لگے۔ تمام اختیارات حیات راؤ کے ہاتھ میں آئے تو انہوں نے اپنے

طریقے وضع کیے۔ اپنے اصول وضوابط کے مطابق انتظام سنبھالا اور اس سے بہت سے لوگوں کو اعتراض بھی ہوا اور کئی خیر اندیشوں نے خیر مقدم کیا۔

چوہدری حاکم ان لوگوں میں سے تھے جن کو چوہدری حیات راؤ کے بہت سے اقدامات سے اختلاف پیدا ہوا اور وہ ہوتے ہوتے ایک خلیج کی صورت اختیار کر گیا۔ دونوں کے تعلقات میں وقت کے سرکتے سرد مہری آتی چلی گئی۔

چوہدری شہاب الدین نے شروع سے چاہا تھا کہ مہریار کی شادی چوہدری حاکم کی چھوٹی لڑکی سے ہو لیکن وہ مہریار کے مزاج سے خائف بھی رہا کرتے تھے۔ انہوں نے سوچا تھا وقت آنے پہ یہ معاملہ اٹھا لیں گے لیکن قدرت کو کچھ اور منظور تھا۔ چوہدری شہاب الدین فالج کے باعث لاچار ہو گئے اور مہریار کی زندگی اس دوران اتار چڑھاؤ کا شکار رہی۔ یوں یہ معاملہ اٹھنے سے پہلے ہی دبتا چلا گیا۔ یہ وہ وقت تھا جب چوہدری شہاب الدین معمولی سی جنبش بھی نہیں کر پاتے تھے۔ زبان تک ہلا نہیں سکتے تھے۔ لایعنی آوازیں نکالتے تھے۔ سب ان کی بات اندازے سے سمجھنے کی کوشش کرتے تھے۔ لیکن اب وہ بھلے مکمل طور پر صحت یاب نہیں ہوئے تھے پر اپنی بات سمجھانے پہ قادر تھے۔ لفظ ٹوٹ ٹوٹ کے سہی مگر ادا کرتے تھے۔ اس لیے پرانا جوش و دبدبہ اکثر جھلک دکھلا جاتا تھا۔ اسی دبدبے کے زیر اثر انہوں نے نجانے کس وقت کسی ملازم کے ہاتھوں چوہدری حاکم کو پیغام بھجوا دیا تھا اور چوہدری حاکم نے بنا تاخیر کے عرصے بعد حویلی میں قدم رکھ دیا تھا۔

چوہدری حیات راؤ کو والد کی اس حرکت پہ جی ہی جی میں افسوس ہو رہا تھا کیونکہ وہ اپنی اولاد کو جانتے تھے۔ مہریار کو معلوم ہوتا تو وہ اینٹ سے اینٹ بجا دیتا۔ اور انہوں نے طے کر لیا تھا کہ اس معاملے کی بھنک بھی وہ مہریار کے کانوں تک پہنچنے نہیں دیں گے۔ چوہدری حاکم کو اپنی معیت میں چوہدری شہاب الدین راؤ کے کمرے تک لے جاتے وہ طے کر چکے تھے کہ انہیں کیا کرنا ہے۔

☆☆☆

"حیات مینشن" کے کچن میں تماشا لگا ہوا تھا۔ اتنا بڑا کچن تھا لیکن بقول نانی پیاری کے جب چار ڈشکرے اندر گھس جاتے تھے تو اکھاڑہ بن جایا کرتا تھا۔ فضلو کا دل کرتا تھا چاروں کو باری باری توے پہ سینک دے لیکن بس دل کرتا تھا۔ ورنہ سینکا وہ خود جاتا تھا۔ اسے کچن سمیٹنا اس قدر مشکل نہیں لگا کرتا تھا جتنا ان چاروں کے اندر گھسنے کے بعد انہیں سنبھالنا۔ جیسے اچانک سے خواتین کے ٹولے میں کوئی کاکروچ اچھال دے تو جو حالت ان کی ہوا کرتی ہے ہو بہو فضلو کی کیفیت وہی ہوتی تھی۔ اس کی کوشش ہوتی تھی کہ جیسے بھی ہو چاروں کے یونیورسٹیوں اور کالجوں سے لوٹنے سے پہلے کھانا تیار کر کے رکھ دے۔ کیونکہ ذرا سی دیر سویر ہوتی تو وہ چاروں ایک ساتھ دھاوا بولا کرتے تھے اور پھر کچن میں کبڈی ہوا کرتی تھی۔ کچن کچن نہیں رہتا تھا اور فضلو زبردستی کا لال کپڑا تھامے وہ مریل انسان بن جاتا تھا جو بے تحاشہ بیلوں کے آگے پھینک دیا جائے۔

آدھا گھنٹہ پہلے نانی پیاری نے اس سے ڈھیروں مٹر چھلوائے تھے گوبھی کٹوائی تھی، کریلے چھلوائے تھے اور جب وہ خود بالکل ادھیڑ جیسا ہو گیا تو نانی پیاری کمر سیدھی کرنے لاؤنج میں جا کے لیٹ گئیں اور فضلو کو گھڑی دیکھ کے ہول پڑ گیا۔ محض آدھا گھنٹہ بچا تھا ان طوفانوں کے آنے میں جن کے بعد فضلو کے چراغ گل ہو جانے تھے۔ وہ جلدی جلدی ہاتھ چلا کے اس کوشش میں تھا کہ کیسے بھی ہو سالن تیار ہو جائے۔ لیکن ابھی آٹا بھی گوندھنا تھا۔ اس کا دل کیا کہ وہ کچن کو تالا لگائے اور سوٹا لے کے کھڑا ہو جائے۔ نہ کوئی آئے نہ کوئی جائے لیکن یہ سب وہ سوچ سکتا تھا۔ تھوڑی دیر گزری تو خان ہانپتا ہوا پچھلے دروازے سے اندر داخل ہوا۔ فضلو کے ڈوئی چلاتے ہاتھ تھمے اور ہونق انداز میں اسے دیکھا۔

"آ گیا۔ چاروں پہنچنے والا بس۔ یہ نگر پہ ام

نے ان چاروں کو دیکا اے۔ آج گاڑی میں نہیں آیا تو وہیں سے لڑتا آرہا سب کا سب۔ ایک دوسرے کو نیچے سے پتر (پتھر) اُٹا اُٹا کے ماررا۔ گر (گھر) تک جو بکیر سر پھٹے چاروں پہنچ گیا تو قیمت ہوئے گا۔"

اور فضلو کو جیسے پتنگے لگ گئے۔ پرات میں فٹا فٹ آٹا نکالا۔ چولہا دھیمی آنچ پہ کیا اور سوچا کہ پہلے آٹا گوندھ کے رکھ لے لیکن ابھی پانی ٹھیک سے آٹے میں ڈال بھی نہ پایا تھا کہ چاروں ایک ساتھ کچن میں شور مچاتے وارد ہوئے۔ خان نے بالکل کاؤنٹر کے ساتھ جڑ کے جگہ چھوڑی۔ "فضلو! دماغ بھٹی بنا ہوا ہے۔ کھانا دے دے ورنہ ان تینوں کا کلیجہ کھا جاؤں گا آج۔"

شہریار نے اپنا یونی کا بیگ یاور کے منہ پہ اچھالتے ہوئے کہا جسے اس نے کیچ کر کے آگے خان کو اچھال دیا۔ خان نے فوراً بوچ کے سہولت سے کاؤنٹر پہ رکھ دیا۔

"ہمارا کلیجہ مفت کا ہے کیا جو تم نگل لو گے سستے میں۔ ایک تو سارا رستہ تمہاری بک بک سنی، اب کلیجہ بھی ہم ہی کھلائیں۔ کمال نہیں ہو گیا۔" یاور آستینیں اوپر چڑھاتے ہوئے شہریار پہ غرایا اور آٹا گوندھتے فضلو کے بالکل سامنے اسٹول پہ ٹک گیا۔

"کلیجے کی جگہ پھیپھڑا بہتر ہوتا ہے۔ سنا ہے وہ زیادہ نیوٹریشنس ہوتا ہے۔" زارون نے عینک کو ناک پہ انگلی کی مدد سے ٹکاتے ہوئے کہہ کے ہونٹ سکوڑے۔

باقی تینوں نے روایتی سلو موشن تالیوں سے خراج تحسین پیش کیا۔ اس بار خان کی تالی بھی شامل تھی سو زارون خوش ہو گیا۔ فضلو نے چاروں کو باتوں میں لگا دیکھا تو دوبارہ آٹے کی جانب متوجہ ہوا۔ لیکن داور نے اچانک سے اس کے کندھے کے پیچھے سے اسے پکارا۔

"فضلو! تمہارا تو آٹا بھی گوندھنے والا ہے ابھی۔"

فضلو بوکھلایا تو ہاتھوں کو جھٹکا لگنے سے آٹا اچھل کے بالکل سامنے بیٹھے یاور کے اوپر گرا۔ اس نے کینہ توز نگاہوں سے ایک بار خود کے گریبان میں جھانکا اور دوسری بار فضلو اور داور کو دیکھا۔ داور اور زارون ہنسنے لگے کیونکہ یاور نے نئی نئی شیو بڑھائی تھی تو آٹا اس کی ڈاڑھی کے بالوں میں لگا دکھائی دے رہا تھا۔

"ویسے یاور، تیری جوانی تو تجھ پہ آئی نہیں تو ایسا کر بوڑھا ہو جا۔ اس حالت میں انسان لگتا ہے۔" زارون نے برجستہ کہہ کے اپنے بدلے برابر کرنے کی کوشش کی اور اسے ایسی کوشش مہنگی پڑا کرتی تھی۔

یاور اٹھا اور فضلو کے آگے دھری پرات سے اوک میں آٹا بھرا جو نیم گیلا تھا اور زارون کا نشانہ لیا۔ زارون کی عینک پھسلنے کو تھی، وہ عین وقت پہ جھکا اور آٹا نیم وا آنکھوں سے اکتائے بیٹھے شہریار کے منہ پہ چھپاکے سے لگا۔ اس دوران فضلو بے بسی سے پرات کو گھیرے میں لینے کی کوشش کر رہا تھا۔ شہریار کی آنکھیں چوپٹ کھلیں اور پھر صرف فضلو کے چراغ ہی نہیں سب ہی کے گل ہو گئے۔ زیادہ نہیں بس پانچ دس منٹ ہی لگے تھے اور ہر شے آٹے سے سنی ہوئی تھی۔ کچن میں کبڈی کا میدان سج گیا تھا۔ للکاریں گونجنے لگیں۔ باری باری چاروں اپنی رانوں پہ ہاتھ مارتے اور پرات سے آٹا اٹھائے ایک دوسرے کا نشانہ لیتے۔ جس کا لگ جاتا وہ ہاتھ کی مٹھی بنا کے اس کی پشت منہ سے لگاتا اور اونچی آواز میں للکارتا۔

فضلو بے دم ہو کے خود بھی فرش پہ پھسکڑا مارے بیٹھ چکا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ اب ان چاروں نے رکنا تو نہیں تھا اس لیے جو درگت کچن کی بنی تھی وہ اسے سمیٹنی ہی تھی۔ خان کاؤنٹر کے اوپر چڑھ کے ریفری کے فرائض سرانجام دے رہا تھا۔ اسے یہ میچ دیکھنے کا بہت لطف آرہا تھا کیونکہ پہلی بار لائیو دیکھ رہا تھا جسے اب تک فضلو کی زبانی سنتا آیا تھا۔

"شیری بابا۔ یہ ادر سے پکڑو۔ پیچھے سے آتھ ڈالو بابا پیچھے سے۔ تم کو تو کیلنا ہی نئی آتا۔ زارون بابا تم امارا ٹانگ کس کے پکڑ لو ورنہ تم کو سب سے زادہ

گھسیٹ رہے ہیں۔ تو تھوڑی دیر میں تمہارا کوئی ہڈی وڈی ہاتھ میں ہوئے گا ان کے۔"

وہ سب ایک پل کو رک کے اسے دیکھتے تھے۔ بات سمجھ میں آئی تو اثبات میں سر ہلا دیتے ورنہ دوبارہ پل پڑتے۔ گھمسان کا رن پڑا تھا جب اچانک زوردار دھاڑ نے ان سب کو ساکت کر دیا۔ مہریار کچن کے دروازے میں کھڑا تھا اور کچن کی حالت اس پر بجلی بن کے گری تھی۔ شہریار، داور اور یاور تو فوراً ایک ساتھ الرٹ ہوئے تھے لیکن زارون جس کی عینک آٹے میں پوری طرح لتھڑی ہوئی تھی اسے ٹھیک سے کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ وہ ہاتھ سے آنکھیں ملتا اٹھا تھا۔ اور جب تک کچھ سمجھ میں آتا۔ ہاتھ سے پرات ٹٹولی اور بچا کھچا آٹا اٹھایا۔ سامنے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کے دیکھنے کی ناکام کوشش کی۔ پھر للکار کے بولا۔

"یہ رہا میرا آخری وار۔ تم لوگو کو کیا لگا زارون ایسے ہی جانے دے گا۔ یہ رہی ایک لوہار کی۔ تم سب سناروں کے مقابلے میں۔"

اور وہ لوہار کی چوٹ سیدھی پیچھے کھڑے مہریار کے کندھے اور گردن سے ٹکرائی تھی۔ تینوں کے سانس خشک ہوئے اور زارون فخر سے آنکھیں مسلتا منہ اونچا کیے سامنے دیکھ رہا تھا۔ خان نے ہاتھ جھاڑ کے فضلو کو اٹھنے کا اشارہ کیا اور باہر نکل گیا۔ باقی تینوں بھی یکے بعد دیگرے کھسکنے کی کوشش میں تھے لیکن زوردار دھاڑ نے وہیں کا وہیں جما ڈالا۔

"تم چاروں ابھی کے ابھی میرے کمرے میں آؤ۔ ابھی۔"

اور زارون تب تک تھرتھراتے ہاتھوں سے عینک کو سنک پہ ٹونٹی کے نیچے دھو چکا تھا۔ آنکھوں پہ لگاتے ہی تارے ناچ گئے۔ سب کچھ سیاق و سباق کے ساتھ واضح ہو گیا۔ وہ تینوں اسے خون آشام نگاہوں سے تکتے کسی بھی وقت اس تک رسائی حاصل کر سکتے تھے لہٰذا زارون نے بے بسی سے عینک واپس اتار کے کاؤنٹر پہ رکھی اور دونوں بازو سر کے گرد لپیٹ کے پیروں کے بل فرش پہ بیٹھ گیا تھا۔ وہ پٹنے کے لیے مکمل تیار تھا۔ مہریار کے کمرے میں ہونے والی "دعوت" کا اسٹارٹر اسے یہیں مل چلا تھا۔

☆☆☆

یہ ایک بہت بڑا سا آڈیٹوریم ہال تھا۔ جسے خصوصی طور پہ آج کی تقریب کے لیے تیار کروایا گیا تھا۔ اونچے اسٹیج پہ ایک ترتیب سے کرسیاں لگائی گئی تھیں۔ ایک طرف روسٹرم رکھا تھا جہاں دو مائیکس فٹ تھے۔ پورا ہال کرسیوں سے کھچا کھچ بھرا تھا جو فی الحال خالی تھیں۔ محض انتظامیہ کے افراد دکھائی دیتے تھے جو تقریب شروع ہونے سے پہلے کے آخری انتظامات میں مصروف تھے۔ کچھ وقت جاتا تھا کہ ہال میں گہما گہمی شروع ہوئی اور دیکھتے ہی دیکھتے خالی نشستیں پُر ہونے لگیں۔ یہ ایک سیمینار کی تقریب تھی جس میں اسکول کالج اور یونیورسٹیز کے اساتذہ اور طلبا شرکت کر رہے تھے۔ سیمینار کا موضوع بھی تعلیم کے حوالے سے تھا لہٰذا مہمانانِ خصوصی کی نشستوں پہ وہ افراد براجمان ہوتے جن کا تعلق کسی نہ کسی طرح تعلیم کے شعبے سے جڑا تھا یا پھر ٹرسٹیز کا پینل۔

اور جس وقت اسٹیج پہ بچھی کرسیاں پُر ہوئیں تو انہی میں سے ایک پہ غرور سے تنی ہوئی گردن اور بھینچے جبڑے لیے موجود تھا۔ وہ خوبرو تھا لیکن غضب کا بے نیاز۔ لوگوں کو وہ مغرور لگتا تھا۔ اس وقت بھی اسٹیج کی رونق اسی کا چہرہ تھا۔ ہال میں موجود صنفِ نازک کے دلوں کو دھڑکا رہا تھا۔ ایک عجیب سی کشش اور کٹھور پن اس کی شخصیت پہ نصب تھا۔ سب ہی کی نگاہوں اور ستائشی اشاروں سے لاپرواہ کرسی کی ہتھیوں پہ ایک بازو پھیلائے اور دوسرا کھڑا کیے انگوٹھے سے دونوں بھنوؤں کے بیچ مسلسل نرمی سے لکیر کھینچ رہا تھا۔ یہ اس کا بے اختیاری عمل تھا۔ دھیان کی ڈور کھنچ کے کہیں اور پہنچی ہوئی تھی اور نگاہیں ہال میں بیٹھے حاضرین کے چہروں کو بے دھیانی سے ٹٹول رہی تھیں۔ روسٹرم پہ موجود ایک ادھیڑ عمر خاتون

ایجنڈے پہ بات کر رہی تھیں۔ یہ تقریب بور ترین تقریب تھی لیکن وہ پھر بھی یہاں تھا کیونکہ اسے کسی کی تلاش کھینچ لائی تھی۔ ہر جگہ وہ بصد شوق چلا جایا کرتا تھا کہ شاید وہ اسے دکھائی دے جائے۔

یہ معمول اس کا عرصے سے تھا اور آج بالآخر قسمت اس پہ مہربان ہو گئی تھی۔ اس کی نگاہوں کے عین سامنے وہ ہال کی ڈھلان اترتی سر جھکائے آگے کی نشستوں کی جانب بڑھ رہی تھی۔ سیاہ سادی قمیص جس پہ محض چاندی کے بٹن لگا کے اسے مزین کیا گیا تھا اور سیاہ ہی چوڑی دار پاجامہ اور سیاہ کھسہ۔ اس کے ساتھ سفید دوپٹا۔ وہ حسین نہیں حسین تر لگ رہی تھی۔ ہال میں موجود کئی افراد کی نگاہوں نے اس کا پیچھا کیا تھا جن سے بے نیاز وہ اپنی ہی رو میں چلتی آرہی تھی۔

شہزور ٹھٹکا۔ اسے شدید جھٹکا لگا تھا۔ کتنے پل آنکھوں کو یقین نہیں آیا تھا کہ آیا وہ اسے ہی دیکھ رہا تھا جس کی تلاش میں ایک مدت سے خوار ہو رہا ہے۔ اس سے پہلے کہ وہ جذباتی ہو کے اٹھ کھڑا ہوتا فوری طور پہ خود کو کنٹرول کرتا لمبے لمبے سانس لینے لگا۔ وہ اس لڑکی کے نشست پہ بیٹھنے کا منتظر تھا کیونکہ اس طرح سے وہ اس تک باآسانی رسائی حاصل کر لیتا بصورت دیگر ہڑبونگ مچتی اور وہ بھاگ جاتی لیکن قسمت کی یاوری بس یہیں تک تھی۔ اس لڑکی نے نشست پہ بیٹھنے سے پہلے نگاہ اٹھائی تھی اور جیسے پل بھر کو پتھر ہو گئی تھی۔ دوسرا پل اس نے برباد نہیں کیا تھا بلکہ بنا سانس لیے پلیٹ کے ہال کے داخلی دروازے کی جانب دوڑ لگا دی تھی۔

شہزور راؤ نے کرسی کی ہتھی پہ مکا مارا اور ایک جھٹکے سے اپنی جگہ سے اٹھ کے اس کے پیچھے بھاگا۔ ہال میں ہلچل مچی۔ لوگ اپنی جگہوں پہ بے چین ہوئے اور کچھ خواتین کی آواز اونچی ہو کے سارے میں پھیل گئی۔ شہزور کے گارڈز جو دروازے پہ موجود تھے فوراً الرٹ پوزیشن میں آگئے۔ خواتین کی آوازیں چیخوں میں تبدیل ہوئیں اور کچھ ڈر کے مارے اپنی نشستیں چھوڑتی باہر کی جانب لپکیں تو قدرتی طور پہ شہزور کے رستے میں حائل ہو گئیں۔ وہ انہیں درشتی سے پیچھے ہٹنے کا کہتا حتی الامکان تیزی سے باہر کو لپک رہا تھا لیکن اس ہڑبونگ اور ہلچل نے اس کی راہ میں رکاوٹ کھڑی کر دی تھی۔ اور جس وقت وہ ہال سے باہر آیا تو وہاں بس اس کے گارڈز کھڑے تھے۔ اس لڑکی کا دور دور تک کہیں نام و نشان نہیں تھا۔ شہزور راؤ نے مٹھیاں بھینچ لیں اور پوری قوت سے چہرہ اونچا کیے دھاڑا۔ یہاں تک کہ اس کی گردن کی نسیں پھول کے اس کے غیض کا پتا دیتی تھیں۔

☆☆☆

چوہدری شہاب الدین راؤ کے کشادہ اور وسیع کمرے میں بیزار کن ماحول تھا۔ چوہدری حاکم ان کے دائیں طرف رکھے صوفے پہ ٹانگ پہ ٹانگ چڑھائے پورے کروفر سے بیٹھے تھے۔ جب کہ کاؤچ پہ حیات راؤ اور کشور بی بی بیٹھی تھیں۔ حیات راؤ کے چہرے پہ بلا کی سنجیدگی تھی۔ وہ والد کی اس حرکت پہ متاسف تھے کیونکہ انہیں اندازہ نہیں تھا کہ اگر مہر یار کو اس سب کے بارے پتا چلا تو وہ کیا قیامت اٹھائے گا۔ پہلے ہی محض انہی کی وجہ سے وہ گاؤں بہت کم آتا تھا، پھر اس کے پیشے کا تقاضا تھا۔

"بہت وقفے بعد آنا ہوا!!! ہے خیریت تمہارا حاکم۔"

چوہدری شہاب الدین نے چوہدری حاکم سے استفسار کیا تو چوہدری حاکم کی گردن میں تناؤ بڑھ گیا۔

"بس جی چوہدری صاحب۔ زمینوں کے رولے ہی نہیں مکتے۔ جب سے پتر ساتھ رلے ہیں میرے سمجھیں جیسے زمینوں نے ہمارے کھاتوں کا منہ دیکھ لیا ہے۔ ہر دوسرے دن تو کوئی زمین خرید لیتے ہیں۔ اب تو جی مجھے لگتا ہے سرگی ویلے شروع کروں پھیرا تو اگلی سرگی پہ بھی زمین نا مکے۔ پتر ہوں تو ایسے ہوں نا جی۔ ایسے پتروں کو کہہ گئے ہیں وڈے وڈیرے باواں۔ (بازو)..!" چوہدری حاکم پُر غرور

لہجے میں کہہ کر اپنی بات پہ خود ہی ہنسے تھے۔ انہوں نے حیات راؤ پہ چوٹ کی تھی لیکن حیات راؤ مسکراتے رہے تھے۔ کشور بی بی کے چہرے پہ البتہ غصیلے سے تاثرات دکھائی دے رہے تھے۔ چوہدری شہاب الدین نے لیٹے لیٹے چہرہ موڑ کر بیٹے کو استہزائیہ دیکھا اور پھر چوہدری حاکم سے مخاطب ہوئے۔

"تتت۔ تم ٹھٹھٹھ۔ ٹھیک کہتے ہوووو۔ پپپ۔ پتر ہونے کا کیا فففف۔ فائدہ جب زمین ہی نا بیب۔ بڑھے۔ میں نے آآآآ۔ آج تتت تمہیں اس لیے بیب۔ بلایا تھا تا کہ ممم۔ میں تم سے ممم۔ مہریار کے ررررر۔ رشتے کی بات کککک۔ کرسکوں۔ تتت۔ تمہاری وددد۔ دھی رانی سنا ہے بیب۔ بارہ پپپ۔ پڑھ بھی ہے۔؟" چوہدری شہاب الدین نے بدقت اپنی بات پوری کر کے چوہدری حاکم کو دیکھا جو مزید اکڑ کے ساتھ آگے ہوتے ہوئے جواب دینے لگے۔

"جی چوہدری جی۔ بارہ کر لی ہیں جماعتیں پوری۔ اور ہر طرف جی اس کی لائقی کے چرچے ہیں۔ بس جی اس سال سردی میں ویاہ کر دینا ہے اس کا۔ دھیاں جتنی جلدی گھروں کی ہو جائیں چنگی گل ہوتی ہے جی۔"

"تتت۔ تو پھر ممم۔ میں تجھ سے تتت۔ تیری دھی کا ررررر۔ رشتہ اپنے پپپ۔ پوتے مہر کے لیے۔ مانگتا۔"

"نہیں۔ بالکل نہیں ابا جی۔ مہر کا رشتہ ایسے طے نہیں کیا جا سکتا۔ نہ میں اس کی اجازت دوں گا۔"

چوہدری حیات راؤ اچانک سے بیچ میں بولے تھے۔ انہوں نے شہاب الدین راؤ کو بات مکمل نہیں کرنے دی تھی۔ چوہدری حاکم کے چہرے کی رنگت متغیر ہوئی تھی جبکہ چوہدری شہاب الدین کا چہرہ غصے سے تمتما اٹھا تھا۔ بیٹے نے آخر جرات کا مظاہرہ کیا تھا اور یہ ان کے لیے خاصا اچنبھے کا باعث تھا۔ حیات راؤ والد کی بات کو کبھی اس طرح کھل کے اب بھی رد نہیں کرتے تھے لیکن آج معاملہ مہریار کا تھا۔ وہ مہریار جس کی نگاہوں میں ایک ان دیکھی نفرت ڈیرا ڈالے رکھتی تھی۔ ایک ان سنا راز ہلکورے لیا کرتا تھا اور یہ تاثرات تب ابھر کے سامنے آتے تھے جب وہ اپنے دادا کے روبرو ہوا کرتا۔

"چوہدری جی! مجھے بلا کے بے عزت کرنے کا کیا مطلب سمجھوں میں۔ آپ نے کامے کے ہتھ پیغام بھیجا تھا، مجھے تو ہی میں آیا۔ دھی والا ہوں ذلیل ہونا منظور نہیں مجھے۔ آپ کی چلتی نہیں تھی تو سنائی کیوں۔"

چوہدری حاکم تنفر اور طیش کی کیفیت چہرے پہ لیے اٹھ کھڑے ہوئے تھے۔ ان کے تیور بتاتے تھے کہ وہ اس معاملے کو ہلکے میں نہیں لیں گے۔ جیسے وہ دشمنی کی شروعات کا سرا ڈھونڈتے ہوں اور انہیں مل گیا ہو۔

"چلتی ہے حاکم۔ ابا جی کی ابھی بھی چلتی ہے۔" حیات راؤ ایک دم سے اٹھ کھڑے ہوئے۔ ان کے چہرے کے عضلات تن گئے تھے۔ کشور بی بی بھی گھبرا کے اٹھ کھڑی ہوئیں۔ نامحسوس انداز میں شوہر کا بازو نرمی سے دبایا لیکن حیات راؤ کو غصہ آچکا تھا اور اس کا اظہار بروقت وہ لازمی سمجھتے تھے۔

"ابا جی کی مرضی ہی چلی ہے آج تک اور جب تک وہ حیات ہیں ان کی مرضی کو مقدم سمجھا جائے گا۔ ان کے بیٹے ان کی ہر بات مانتے رہیں گے لیکن یہ میرے بیٹے مہریار کی زندگی کا معاملہ ہے۔ اور میں اپنی اولاد کی مرضی کو مقدم سمجھتا ہوں۔ میں مہریار کی منشاء کے بنا اس کا رشتہ طے نہیں کر سکتا جب کہ میں جانتا ہوں کہ وہ کس مشکل وقت سے گزر چکا ہے۔ دیکھو حاکم، میرا تمہارا تعلق دوستی کا ہے اور میں اسے رشتے داری میں بدلنے کے حق میں نہیں ہوں۔ اللہ تمہاری بچی کے نصیب اونچے کرے۔ بیٹی ہے وہ میری لیکن رشتے کے لیے کوئی آس دل میں نہ لانا

کیونکہ اپنے بچوں کے جیون ساتھی چننے کا اختیار میں نے انہی کو دے رکھا ہے۔ امید ہے کہ تم۔ دل میں ملال نہیں لاؤ گے۔"

چوہدری حیات راؤ کے دوٹوک جواب نے جہاں کشور بی بی کا سانس خشک کیا تھا وہیں چوہدری شہاب الدین کا فشار خون بلند ہو گیا تھا۔ چوہدری حاکم نے اپنی چادر کا پلو بہت زور سے جھٹکا تھا۔ ان کے تیور اچھے نہیں تھے۔ وہ حیات راؤ کو بغور دیکھتے کمرے سے نکل گئے تھے۔ پیچھے خوف ناک خاموشی چھا گئی تھی اور جب تک چوہدری حاکم کی پجیرو کے ٹائر چرچرانے کی آواز نہیں آ گئی تب تک چھائی رہی تھی۔

"تتت...... تم نکل ججج...... جاؤ میرے کککک...... کمرے سے ممم...... میں تمہیں کبھی ممم...... معاف نہیں ککک...... کروں گا...... تتت...... تم نے ممم...... میری بات رد کککک...... کی ہے...... ممم...... نکل جاؤ...... ددددد...... دور ہو جاؤ ممم...... میری نظروں سسسس...... سے...... ددددد...... دفع ہو جاؤ۔"

اور حیات راؤ نے بنا کوئی جواب دیے ادب کو ملحوظ خاطر رکھتے بیوی کو نکلنے کا اشارہ کیا اور خود بھی ان کے پیچھے کمرے سے نکل گئے۔ باہر جا کر انہوں نے چوہدری شہاب الدین کے خاص ملازم شریف کو اندر بھیج دیا تھا تا کہ وہ انہیں سنبھال لے۔ کچھ ہی دیر میں اندر سے چیزیں پھینکے جانے کی اور ٹوٹی پھوٹی آواز میں شور مچانے کی آوازیں باہر سنائی دینے لگیں تھیں۔ کبھی اس حویلی میں یہ آواز قہر بن کے ٹوٹا کرتی تھی اور دل توڑ دیا کرتی تھی۔ آج اس آواز میں پڑی دراڑیں کسی کی بے بسی کا نوحہ سنانی تھیں۔

☆☆☆

مہریار نے چاروں کو اپنے کمرے میں بلا کر دوبارہ واپس لاؤنج میں بھیج دیا تھا۔ وہ چاروں اس قدر بھدے لگ رہے تھے کہ وہ اپنے کمرے میں ان کے جسموں سے جھڑتا آٹا برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ اب وہ سب لاؤنج میں بھوت بنے اس کا صبر آزما رہے تھے۔ مہریار شرٹ کے کف فولڈ کرتا کاؤچ پہ بیٹھ گیا۔ جس کے ایک سرے پہ نانی پیاری ابھی ابھی نیند سے جاگی سوئی کیفیت میں معاملہ سمجھنے کی کوشش کر رہی تھیں۔

"فیر کھول دیا نا کوئی کھاتا تم چاروں نے۔ جتیاں پین تے ٹھیک رہندے او۔"

مہریار نے چاروں کو سر سے لے کر پیروں تک یوں دیکھا جیسے لاعلاج مریض کو دیکھتے ہیں۔ وہ تینوں واقعی لاعلاج تھے، اس کی نظر میں۔ شہریار ڈھیلے اوپر کیے اپنے بالوں کی نوک پلک سے آٹے کے ذرات نکال رہا تھا اسی کو گھورتے ہوئے مہریار مخاطب ہوا۔

"کل سے تم چاروں میں سے کوئی بھی مجھے کچن میں دکھائی دیا تو اس کا کھانا پینا بند کر دوں گا۔ جو فضلو پکائے گا وہی کھانا پڑے گا۔ اگر اس کے کام میں مداخلت کی یا بکھیرا کیا تو یقین مانو تم چاروں کو گاؤں بھیج دوں گا اور اس بار مجھ سے لحاظ کی توقع مت کرنا۔ میں سارا دن ہاسپٹل میں لگا کے آتا ہوں۔ تھکا ہوا ذہن لیے گھر میں داخل ہوتا ہوں اس لیے نہیں کہ آگے سرکس لگا ہو۔ جہاں بندر بنے سب ناچ رہے ہوں۔ جا کے دیکھو ذرا شکلیں کیسی دکھ رہی ہیں۔ گھر کو کباڑ بنا ڈالا ہوا ہے۔"

"لالہ! آپ فضلو کو بھی تو سمجھائیں نا، کبھی کچھ بچ کا بنا دیا کرے۔ اول تو یونی سے تھکے ہوئے آؤ تو کھانا انڈر پراسس ہوتا ہے اور پھر جو ٹیبل پہ ہوتا ہے اس کو کھانا بہت مشکل ہوتا ہے اور جو کھا لو تو ہضم کرتے نانی پیاری یاد آ جاتی ہیں۔ پھکی کھانا تو کھانے کے بعد کا لازمی جزو بن چکا ہے۔ پھر بندہ لاسٹ آپشن کے طور پر سلائس میں شامی کباب لگا کے ہی کھانا بہتر سمجھے گا نا۔" شہریار بالوں کو مسلسل جھاڑتا بولے جا رہا تھا اور مہریار فرش پہ گرتے آٹے کے ذرات کو دیکھ رہا تھا۔

"تو کیا یہ سلائس یہ شامی کباب لگ رہا تھا کچن میں ۔ ایسے لگتا ہے ۔؟ کچن کی حالت دیکھو جیسے وہاں سفیدی ہو رہی ہو ۔ تم لوگو کی وجہ سے کوئی ملازمہ تو ٹکتی نہیں ایک یہ فضلو کا آسرا ہے ۔۔ چلا گیا نا تو کرنا سب ہی کام خود ۔ کیونکہ میں تو تنگ آ گیا ہوں تم لوگو کے ان تماشوں سے ۔"

"میں تو کہتی ہوں منڈیا ویاہ کراتے وو وہٹی گھر لیا ۔ ویکھ سب کیسے سوتر ہوتے ۔"

نانی پیاری نے اپنا راگ الاپنا لازم سمجھا ۔ جسے مہریار کے سوا ان چاروں نے خشوع و خضوع سے سنا تھا ۔

"لالہ ! یہ تماشا شیری نے شروع کیا تھا اور زاروں نے ختم کیا تھا ۔ ہم تو بیچ میں ایویں ، ایویں ، ایویں لٹ گئے ۔" داور نے کچھ یوں ایک ہاتھ کو دوسرے پہ آری چلانے کے انداز میں کہا کہ وہاں موجود سب ہی کی ہنسی لبوں کا دہانہ پار کرتی ابلنے کو تھی ۔ زاروں جو ابھی کچن سے پٹ کے آیا تھا اپنا جبڑا پکڑے ہنستا کم اور روتا زیادہ دکھائی دیا ۔ نانی پیاری نے دوپٹے کا پلو منہ پہ ڈال کے ہنسی چھپائی ۔ مہریار سر پکڑ کے بیٹھ گیا ۔ پھر آنکھیں مسل کے لمبا سانس کھینچا اور چاروں کو دیکھتے ہوئے تحمل سے بولا ۔

"یہ میری لاسٹ وارننگ ہے ۔ کل سے تم چاروں مجھے کچن میں نہ دکھائی دو ۔ میں آ کے فضلو سے پوری رپورٹ لوں گا ۔ اور تم لوگ ذرا یہ اپنی چائے پینے کی بلاوجہ کی عادت کو کم کرو ۔ صبح دودھ پی کے جایا کرو ۔ چائے اچھی نہیں ہوتی صبح کے وقت اور شام کو بھی چائے کی جگہ جوس لیا کرو اور یہ جو رات میں بیماری ہے نا چائے پی کے سونے کی تو اس پہ قابو پاؤ ۔ ضرورت کیا ہے بلاوجہ چائے پینے کی ۔ اس سے اچھا دودھ لو ۔ ختم کرو یہ دن میں دس کپ چائے ۔ جب دیکھو چائے چائے چائے ۔"

وہ چاروں چائے کے رسیا تھے اور فضلو ان کی وجہ سے چائے چولہے پہ چڑھائے رکھتا تھا ۔ ہر وقت چائے کی پکار پڑتی رہتی تھی اور نانی پیاری بھی اس سب میں شامل تھی ۔

"سمجھ میں آیا تم لوگوں کو کہ نہیں ؟"

"آ گیا لالہ ..... بالکل آ گیا ۔ بس یہ بتا دیں کہ نس کہاں جا کے کاٹیں ۔ !" شہریار نے کلائی پہ ہاتھ پھیرتے ہوئے تفکر سے پوچھا ۔

"کیا بکواس ہے ۔ کیا مطلب اس بات کا ۔" مہریار نے تیوریاں چڑھائیں ۔

"مطلب یہ کہ لالہ چائے بالکل ہی بند کر دی ۔ جینے کی کوئی وجہ تو چھوڑی نہیں آپ نے تو مر ہی جائیں نا ۔"

"نکل جاؤ تم سب ۔ دفع ہو جاؤ میری نظروں کے سامنے سے ۔ مجھے کوئی ایک بھی کمرے سے باہر دکھائی دیا تو ٹانگیں توڑ دوں گا ۔" مہریار اٹھ کھڑا ہوا اور اس سے پہلے کہ وہ بیچ میں جوتا پکڑ لیتا ان چاروں نے اپنے اپنے بلوں میں چھپنے میں ہی عافیت جانی ۔

مہریار واپس دھپ سے صوفے پہ بیٹھا تھا ۔ اور سر پیچھے گرا کر آنکھیں موندے اپنے اعصاب پرسکون کرنے لگا ۔ ابھی اسے واپس ہاسپٹل بھی جانا تھا ۔ نانی پیاری بھی اپنی جگہ سے اٹھیں اور دھیمے لہجے میں بولیں ۔

"اسی لیے کہتی ہوں وہٹی لے آ ۔ اپنی جان تو ہلکان نہ ہو گی نا ۔ دیکھ سب سنبھال لے گی وہ ۔ ان مشٹنڈوں کا کھانا پینا چائے پانی سب کچھ دو دنوں میں ۔"

"نانی .....!" مہریار نے بے بسی سے بال مٹھیوں میں جکڑ کر انہیں چپ کروایا ۔ نانی پیاری ہنکارا بھرتی وہاں سے چلی گئیں اور مہریار واپس صوفے کی پشت سے سر ٹیک گیا ۔ آنکھیں موندتے ہی ایک چہرہ نگاہوں کے پردے پہ ابھرا اور مہریار نے اس تصور کو جھٹکنے کی کوشش نہیں کی تھی ۔

☆☆☆

ہاجرہ برآمدے میں بیٹھے ہوئے چاول چن رہی تھیں ۔ زمن کے آنے سے پہلے وہ سبزی ترکاری بنا لیا کرتی تھیں یا چاول دال چننے والی ہوتی تو صاف

کر کے رکھ لیتی تھیں۔ باقی سب کام زمن آ کے دیکھا کرتی تھی۔ وہ ہاجرہ کو سختی سے کھانا بنانے سے منع کیا کرتی تھی کہ یہ کام اس کے سر رہنے دیں۔۔ ویسے بھی ہاجرہ گھر کی صفائی خود کیا کرتی تھیں تو زمن کو ان کی تھکاوٹ کا احساس رہا کرتا تھا۔ زوہا کو سنبھالنا بھی بہت مشکل عمل تھا۔ جو خود کا وزن اٹھانے سے بھی قاصر تھی۔ زمن گھر آتی تو ساتھ ساتھ باتیں کرتی رہتی اور کچن میں کھانا بنانا بھی چلتا رہتا۔

ہاجرہ چاولوں کا تھال گود میں لیے زندگی کے نشیب و فراز میں الجھی ہوئی تھیں۔ زندگی کی کٹھنائیوں نے انہیں بے رنگ کر دیا تھا۔ ان کی خوب صورتی دھندلا چکی تھی۔ وہ بھی جو بے حد حسین اور دلکش تھیں اب محض اس کا عکس بچی تھیں۔ ان کی آنکھیں بوجھل بوجھل رہا کرتی تھیں کیونکہ بھولے بسرے وقت کی گرداب بھی ان کی پلکوں پہ ڈیرا جمائے ہوئے تھی جو جھڑ جھڑ کے آنکھیں سلگائی تھی۔

وہ ایک سرد آہ بھرتی اپنی جگہ سے اٹھی تھیں کہ یکدم دروازہ زوردار آواز کے ساتھ دھڑ دھڑایا جانے لگا۔ ان کا دل اچھل کے حلق میں آ گیا تھا۔ زمن کے آنے کا وقت تھا، وہ گھبراہٹ میں تھال رکھ کے تیزی سے دروازے کی اور بڑھیں اور لاک کھولا ہی تھا کہ زمن تیر کی تیزی سے اندر داخل ہوئی اور لاک لگا کے دروازے کے ساتھ پشت ٹیک کر لمبے لمبے سانس لینے لگی۔ اس کی رنگت فق اور ہوش اڑے ہوئے تھے۔ ہاجرہ گھبرا گئیں اور فوراً اسے دونوں بازوؤں سے پکڑ کر جھنجوڑا۔

"زمن! کیا ہوا ہے بچی۔ کیا ہوا۔ اس طرح سے کیوں ہانپ رہی ہو۔ کہاں سے بھاگتی آ رہی ہو۔ بتاؤ زمن۔ کچھ بولو...... زمن......!" وہ پریشانی میں مسلسل پوچھ رہی تھیں اور زمن ہاتھ کے اشارے سے انہیں رکنے کا کہہ رہی تھی۔

ہاجرہ واپس مڑیں اور جلدی سے کچن سے پانی لیے چلی آئیں۔ تب تک زمن کسی نہ کسی طرح برآمدے میں بچھے تخت تک پہنچ گئی تھی۔ ہاجرہ سے پانی کا گلاس لے کر وہ ایک ہی سانس میں چڑھا گئی۔ موسم ابھی اچھا تھا لیکن اس کے ماتھے پہ پسینہ چمک رہا تھا۔

"زمن! اب تو بولو نا کچھ، ہوا کیا ہے۔ کیوں ماں کی جان ہلکان کر رہی ہو۔؟"

"کچھ نہیں۔ بس ایسے ہی۔" وہ بمشکل سانس بحال کرتی بولی۔

"کیا ایسے ہی۔؟ ایسے ہی سانس پھول گیا تمہارا۔ مجھے سچ سچ بتاؤ زمن کیا ہوا ہے۔ رکو میں خود دیکھتی ہوں بیٹھو یہاں۔" وہ اٹھنے لگیں تو زمن یکدم ان کا ہاتھ پکڑتے ہوئے بولی۔

"کتے۔ باہر کتے ہیں امی۔ ساتھ والے محلے سے پیچھا کرنا شروع کیا انہوں نے میرا۔ اور یہاں تک پہنچایا ہے۔ ایک منٹ اور گزرتا تو بس ہمارے گھر تک آ گئے تھے۔"

"اف میرے خدا! زمن۔ حد کرتی ہو بچی۔"

ہاجرہ یکدم اعصاب ڈھیلے چھوڑتے ہوئے تخت پہ بیٹھ گئیں۔ "میری جان نکال دی تم نے۔ ہزار بار تو کہا ہے کہ یہ نامراد دکھائی دیں تو ساتھ والی گلی میں جو بشیر کریانے والا ہے اس بھلے آدمی کو کہا کرو تمہیں گھر تک چھوڑ جایا کرے۔ بیٹیوں کی طرح خیال کرتا ہے وہ۔ یوں بیٹا گلیوں میں جوان بچی بھاگتی اچھی لگتی ہے کیا۔ کسی نے دیکھا ہوگا تو کیا سوچا ہوگا۔؟"

"امی! چاچا بشیر وہاں ہوتے تو بھلا آنے دیتے مجھے ایسے۔ نہیں تھے نا تب ہی تو اکیلی آئی۔۔ خیر آپ کچھ کھانے کو دیں مجھے۔ میں فریش ہو کے زوہا کے پاس جا رہی ہوں۔ وہیں لا دیجیے۔ تھوڑا آرام کر کے پھر کچن دیکھوں گی۔" زمن نگاہیں چراتی اٹھ کھڑی ہوئی اور جلدی جلدی کہتی اندر کی جانب بڑھ گئی۔

ہاجرہ ناسمجھی سے اس کی پشت تک رہی تھیں۔ زمن کا رویہ عجیب سا تھا۔ ان کے دل میں وسوسوں نے سر سرانا شروع کر دیا تھا۔

☆☆☆

حیات راؤ اپنے کشادہ کمرے میں بیڈ کے سامنے آراستہ تھری سیٹر نفیس صوفے پہ براجمان ضروری کاغذات سینٹرل ٹیبل پہ دھرے ان پہ جھکے ہوئے تھے۔ ان کی پیشانی پہ تفکر کی لکیریں تھیں۔ صاف پتا چلتا تھا کہ ذہن کہیں اور الجھا ہوا ہے اور بظاہر وہ کام کرتے دکھائی دیتے تھے۔ کشور بی بی بیڈ پہ بیٹھتے ہوئے پھولے منہ سے دھلے کپڑوں کو تہہ لگا رہی تھیں جو ملازمہ رکھ کے گئی تھی۔ حویلی میں کام کرنے والیوں کی کمی نہیں تھی لیکن کشور بی بی کو فالتو میں حکم چلانا بھی پسند نہیں تھا۔ وہ مل بانٹ کے کام کرتی آئی تھیں۔ اور حویلی میں تو انہیں جیسے کرنے کو کچھ ملتا ہی نہیں تھا۔ ساری اولاد تو شہر میں تھی۔ یہاں دو دن کے لیے آتے تھے تو اتنے کام جمع ہو جاتے کہ کشور بی بی سارا دن مسرور سی انہیں نپٹاتی رہتیں۔ جب ان کے چلے جاتے تو وہی دن رات کی خاموشی اور روٹین انہیں بیزار کیے رکھتی۔ حیات راؤ کے اپنے معمولات تھے جن میں وہ مشغول رہا کرتے۔ کشور بی بی اسی لیے شادی کروانا چاہتی تھیں مہریار کی۔ وہ تو شہریار کی بھی کرنے کو تیار تھیں لیکن مہریار اس کی پڑھائی پوری ہونے سے پہلے ایسا کبھی نہ ہونے دیتا۔

"کیا تھا جو حاکم کی بات تسلی اور سکون سے سن لیتے۔ دیکھ رکھی ہے اس کی لڑکی میں نے۔۔۔ اچھی پیاری بچی ہے۔ مہریار کو میں راضی کر لیتی چوہدری صاحب۔"

ہاتھ میں تھامے کرتے کو زوردار آواز کے ساتھ جھٹک کے تہہ لگاتے ہوئے کشور بی بی روٹھے سے لہجے میں شوہر سے مخاطب تھیں۔ حیات راؤ نے عینک کے اوپر سے انہیں دیکھا اور ان کے بجھے چہرے سے بھانپ گئے کہ موڈ آف تھا۔ عینک اتار کر رکھتے ہوئے انہوں نے پشت صوفے سے ٹکی اور محبت سے بیوی کو دیکھتے ہوئے بولے۔

"تم کب سمجھو گی مہر کی تکلیف کو کشور۔ وہ ہماری بڑی اولاد ہے۔ آٹھ سال اس اکیلے نے ہماری محبت پہ قبضہ کیے رکھا تھا۔ وہ بگڑ سکتا تھا۔ ضدی اور خودسر ہو سکتا تھا۔ اباجی نے تو اسے بگاڑنے میں کوئی کسر چھوڑی بھی نہیں تھی۔ لیکن کیا کبھی اس نے ہمیں شکایت کا موقع دیا۔ آج میں شہر جاتا ہوں تو اس کی عزت اور شہرت دیکھ کے میرا سیروں خون بڑھ جاتا ہے۔ لوگوں کی اولاد ان کے حوالے سے پہچانی جاتی ہے کشور، لیکن جب مجھے سب اس کے حوالے سے پہچان دیتے ہیں تو میری چھاتی چوڑی ہو جاتی ہے۔ میرا دل کرتا ہے کہ میں چیخ چیخ کے سب سے کہوں کہ میں نیورو سرجن مہریار راؤ کا باپ ہوں۔ تو کیا ایسے بیٹے کی زندگی کو کھلونا بنا دوں۔ شادی کوئی دو گھنٹوں کی فلم تو ہے نہیں کہ دیکھی اور اٹھ گئے۔ کم از کم میں اس کی مرضی کے بنا اس کی زندگی کا یہ فیصلہ کرنے کا اختیار کسی کو نہیں دوں گا کشور۔ اباجی کا غصہ وقتی ہے میں سمجھا لوں گا انہیں۔ باقی چوہدری حاکم کی طرف سے تھوڑی پریشانی لگ گئی ہے کیونکہ وہ کینہ پرور ہے۔ اور اسے اباجی نے چھیڑ دیا ہے۔ اب دیکھو کون سا تماشا لگاتا ہے۔ سچ پوچھو تو اگر مہریار راضی بھی ہو جائے نا تب بھی میں حاکم سے رشتے داری نہ کرتا۔ مفاد پرست لوگ کسی کے سگے نہیں ہوتے۔ اور میں اپنے بیٹے کی زندگی جھمیلوں کی نذر نہیں کر سکتا۔"

"ہاں جیسے اس نے پہلے تو جھیلا نہیں پالا تھا نا اپنی زندگی میں۔ چوہدری صاحب آپ کے لاڈلے نے اپنی زندگی کا اختیار دیا ہی کب ہے ہمارے ہاتھ میں۔ پہلے بھی اپنی مرضی کر کے دیکھ چکا ہے کیا پایا۔ ؟ چلیں جی اس معاملے میں بھی کر لے۔ ماں جائے بھاڑ میں۔ کسی کو کیا۔ آپ کو بھی کیا۔"

کشور بی بی پوری ناراضی کے ساتھ مسلسل بولتے ہوئے تیز تیز ہاتھ چلاتے کپڑے پٹخ رہی تھیں۔ وہ اب کافی دیر تک بڑبڑانے والی تھیں اور حیات راؤ نے مسکراتے ہوئے عینک واپس لگائی اور کاغذات پہ جھک گئے۔ پر ذہن پھر بھٹک کے چوہدری حاکم کی جانب چلا گیا۔ چوہدری شہاب راؤ

نے ایک نئی مصیبت کو دعوت دے دی تھی۔ وہ دل میں دعا کر رہے تھے کہ چوہدری حاکم اس معاملے کو انا کا مسئلہ نہ بنائے۔

☆☆☆

آج چار باغ حویلی میں صبح خوب رونقیں بکھیرتی اتری تھی۔ سنہری بیگم کی بھانجی ولایت سے آ رہی تھی اور ان کی خوشی کا ٹھکانہ نہیں تھا۔ سارا دن مردہ بیمار کی طرح پڑی حویلی جاگ اٹھی تھی جیسے۔ شہزور حویلی کی اکلوتی اولاد تھا اور وہی حویلی میں ٹکتا نہیں تھا۔ چوہدری قاسم کا بھی ہونا نا ہونا برابر تھا۔ سارا سارا دن مردانے میں گزر جاتا تھا۔ اندر آتے بھی تو شہزور کا کوئی نیا کارنامہ سنہری بیگم کے متھے مارنے کے لیے آتے تھے کیونکہ ان کے بقول شہزور کو بگاڑنے میں سارا کمال سنہری بیگم کا تھا۔ سنہری بیگم باپ بیٹے کے بیچ پس کر رہتی تھیں۔ اور اب جیسے حویلی کا جمود ٹوٹا تھا۔ سنہری بیگم کی بھانجی وریشہ یو کے سے آ رہی تھی۔ وریشہ ماں باپ کی اکلوتی اولاد نہیں تھی لیکن اکلوتی بیٹی ضرور تھی اور بے حد لاڈلی بھی تھی۔ سنہری بیگم کو وہ بچپن سے ہی بے حد پسند تھی۔ ایک وقت تھا جب انہوں نے سوچ رکھا تھا کہ اسے اپنی بہو بنائیں گی لیکن پھر حالات نے ایسا پلٹا کھایا کہ ان کا یہ خواب پورا نہیں ہو سکا تھا۔ وریشہ ڈاکٹر تھی اس لیے بھی انہیں شہزور کے لیے بے حد بھاتی تھی لیکن شہزور کون سا پروں پہ پانی پڑنے دیتا تھا۔ اس کے سر پہ چڑھا جنون اسے کہیں دیکھنے کب دیتا تھا۔ وریشہ کے پاکستان آنے کو سنہری بیگم اچھا شگون مان رہی تھیں ان کا دل کہتا تھا کہ شہزور کو وریشہ ہی قابو میں کر سکتی تھی اور اس بار وہ پوری طرح تیار تھیں کہ شہزور کو وریشہ سے شادی کے لیے منا لیں گی۔ بھلے انہیں کچھ بھی کرنا پڑتا۔

بڑے سے سجے سجائے ہال کمرے میں چاروں اور ملازمائیں دوڑ رہی تھیں۔ نئے پردے لگ رہے تھے۔ پنکھے جالے صاف ہو رہے تھے۔ سارا فرنیچر چمکایا جا رہا تھا حتیٰ کہ کرسٹل کے نازک چھوٹے چھوٹے ڈیکوریشن پیسز بھی رگڑوا رہی تھیں سنہری بیگم اور یہ تمام تیاری محض ایک بندے لیے تھی۔ ڈاکٹر وریشہ آفتاب۔

"اے کلموہی۔ اندھی ہے کیا۔ ابھی چھوٹتا نا تیرے ہتھ سے تو اس کی قیمت چکاتے تیری پوری نسل گزر جاتی۔" ملازمہ کے ہاتھ سے کرسٹل کا واز چھوٹتے چھوٹتے بچا تھا اور سنہری بیگم نے اسے فوراً سے پیشتر لتاڑ دیا تھا۔ وہ بے چاری پوری جان سے کانپ اٹھی تھی۔ جانتی تھی کہ اگر سنہری بیگم کہہ رہی ہیں تو واقعی اس کی پوری نسل اس کانچ کے ٹوٹنے کی قیمت چکاتی۔

"واہ اماں۔ یعنی سے دیکھ لو کہ کیا دیتی ہو ان لوگوں کو۔ ایک چار ہزار کے واز کا خراج اس کی پوری نسل چکاتی لیکن یہ چار ہزار پورے ہی نہ ہوتے۔ واہ۔ اور بھاشن تم ایسے دیتی ہو اماں جیسے بہت بڑی مبلغہ ہو۔"

شہزور تک سک سے تیار خوشبوئیں بکھیرتا وہیں آ گیا تھا۔ سب کی سب ملازمائیں کام کرتا چھوڑ کر وہاں سے نکل گئیں کیونکہ شہزور کو اپنی موجودگی میں کسی بھی ملازمہ کا آس پاس ہونا نہیں بھاتا تھا۔

"کبھی تو باز آ جایا کر ماں کے منہ لگنے سے شہزور پتر۔ کمینوں کے سامنے سب کہہ دیے جاتا ہے۔ جیسا پیو ویسا پتر۔ ہونہہ۔" سنہری بیگم اپنے کاؤچ پہ بیٹھ کے پاندان گھسیٹتے ہوئے بیزاری سے بولیں۔ جواباً شہزور زور سے ہنسا اور سر پیچھے صوفے کی پشت سے ٹکتے ہوئے بولا۔

"خود ہی میرے ایسا ہونے کی وجہ بتا دی اماں۔ اب بتاؤ میرا قصور کیا ہوا بھلا۔ اباجی ایسے ہیں تو میری کہاں غلطی نکلتی ہے۔" کہہ کر سیدھا ہوا اور جیب سے موبائل نکال کے ہاتھ میں پکڑا۔ "ویسے کس لیے یہ صبح صبح صفائیاں ہو رہی ہیں۔ سوکن لا رہی ہو کیا ابا کی۔؟"

"کبھی تو چج کی بات نکال لیا کر منہ سے شہزور۔ ماں کا تو دشمن ہی بنا رہتا ہے ہر وقت۔۔۔!"

"اباجی اگر دوسری شادی کر لیتے ہیں تو ان کا شرعی حق ہے۔ اس میں بھلا دشمنی کیسی ہوئی تم سے۔ لوگ یہاں بسے بسائے گھر اجڑوا دیتے ہیں میں تو بس سوکن کا نام لیا تو تمہیں تپ چڑھ گئی۔ کمال ہو اماں تم بھی۔"

سنہری بیگم خون کے گھونٹ پی کر رہ گئیں۔ شہزور سے بحث مشکل نہیں ناممکن تھی۔ وہ بھی جواب دینے سے چوکتا نہیں تھا۔

"دیکھ شہزور، پردیس سے وریشہ آ رہی ہے۔ اسی کے لیے کر رہی ہوں ساری تیاریاں۔ اور تو میرا پتر دھیان سے سن لے، جس دھندے سے لگا ہوا ہے نا اس سے باز آ جا۔ چوہدری جی کو پتا چلا نا تو مجھ سے مت کہنا کہ شکایت کیوں کر دی۔ میں ویسے بھی تیرے ویاہ کے چکر میں ہوں۔ مجھ سے نہیں سنبھالی جاتی حویلی اب۔ تیری بیوی آئے گی تو سکون ملے گا مجھے بھی۔ اس لیے آوارگیاں چھوڑ اور وریشہ کے بارے میں سوچ۔ سمجھا۔"

سنہری بیگم نے دوٹوک معاملہ اس کے آگے رکھ دیا تھا۔ بنا لگی لپٹی۔ لیکن مقابل بھی شہزور تھا۔

"اماں! میری شادی ہے نا تو فکر بھی میں کرلوں گا۔ مجھے مت بتاؤ کہ کون آ رہا ہے کون نہیں۔ تمہاری بھانجی ہے سو دفعہ آئے لیکن جو کچھ تم سوچ رہی ہو ویسا کرنے کی مت سوچنا بس ورنہ میں عین وقت پہ رسا تڑوانے والوں میں سے ہوں۔ مفت میں بے عزتی ہوگی۔"

"وہ تو دیکھی جائے گی۔ آ تو لینے دے وریشہ کو۔ دیکھتی ہوں کیسے رسا تڑوا کے جاتا ہے۔ بد لحاظ تو تُو سدا سے ہے شہزور۔ ماں کی پروا کہاں ہوتی ہے جب ادب نہیں تو۔ اکو اک اولاد ہے تُو میری لیکن مجال ہے کہ کبھی میرا دکھ درد پوچھا ہو۔ الٹا جب بیٹھے گا پاس کچو کے لگا جائے گا۔ ہونہہ گندی اولاد۔"

اور شہزور قہقہہ مار کے زور سے ہنسا تھا۔ ایسے نا جانے کون کون سی باتیں یاد آ کے ہنسایا کرتی تھیں اور سنہری بیگم نے کبھی کرید نہیں کی تھی کہ وہ اس طرح بے لاگ قہقہے کیوں لگاتا ہے۔ وہ کرنا ہی نہیں چاہتی تھیں۔ ابھی بھی نگاہ چرا کے پاندان ٹٹولنے لگی تھیں بلا مقصد۔ شہزور اٹھا اور زوردار انگڑائی لے کر بدن چست کیا اور گاڑی کی چابیاں انگلی پہ گھماتا باہر کی جانب بڑھ گیا۔ دروازے تک پہنچ کے ایک ایڑی کے بل تھوڑا سا مڑا اور ماں کو مخاطب کیا۔

"اماں۔ او اماں۔" انداز چھیڑنے والا تھا۔ "رات کو وریشہ کی کال آئی تھی۔ اس کے آنے کا پروگرام ڈیڑھ ماہ آگے ہو گیا ہے۔ دو تین سیمینار ہیں جن کی وجہ سے اسے پوسٹ پون کرنا پڑ رہا ہے۔ سوچا تمہیں بتاتا جاؤں کہیں حلوائی ہی نا بٹھا لو حویلی میں، اپنی بھانجی کے آنے کی خوشی میں۔"

شہزور کہہ کے چٹخارا سا بھرتا مزے سے نکل گیا تھا۔ اور سنہری بیگم جو حسب معمول اس پہ آیت الکرسی دم کر کے حصار باندھنے کے قریب تھیں یکدم آواز کے ساتھ زوردار پھونک مارتے ہوئے انتہائی کوفت سے اونچا اونچا بڑبڑانے لگیں۔

"لے بھلا بتا۔ ایک فون ماسی کو نہ ہو سکا اس کمی سے۔ پندرہ دن ہو گئے تیاریاں کرتے اور یہ نواب کی بچی اوی رانی بتا رہی کہ نہیں آنا۔ ستیاناس جائے تیرا وریشہ۔ لک ٹٹ گئے تیرے لیے حویلی چمکاتے۔ فتنی منی۔"

سنہری بیگم نے کاؤچ پہ سلیقے سے دھرے کشن نیچے فرش پہ پٹخے۔ ہال کے اونچے روشن دانوں سے آتی ہواؤں میں تھکے ہوئے اور بیتے وقت کی باس اندر آ گھسی تھی۔ اور چمکتی دیواروں نے اسے ہر بار کی طرح چوس لیا تھا۔

☆☆☆

مہریار اس وقت آنٹی رباب کے لاؤنج میں بیٹھا چائے پی رہا تھا۔ ان کے شوہر بھی وہیں موجود تھے اور چونکہ مہریار کے استاد رہ چکے تھے تو ان سے اچھی بات چیت رہا کرتی تھی۔ وہ بے حد شگفتہ مزاج اور ہنسوڑ تھے۔ اور رباب آنٹی کے شوہر کے معیار پہ پورے اترتے تھے۔ دونوں کی ایک دوسرے سے

انڈر اسٹینڈنگ غضب کی تھی۔ فکر فاقہ نہیں پالتے تھے نہ بلاوجہ کی تام جھام کے قائل تھے۔ بیٹے کو بھی الگ سیٹل کیا تھا تا کہ سب اپنی اپنی لائف انجوائے کر سکیں مکمل پرائیویسی کے ساتھ۔ چھوٹا سا خوب صورت ویل فرنشڈ گھر تھا جو بے حد سلیقے اور طریقے سے سیٹ کر رکھا تھا۔ زیادہ بڑے گھر کے دونوں میاں بیوی حق میں نہیں تھے۔ تین مستقل ملازم تھے جو سارا گھر سنبھالتے تھے۔ ایک شیف اور دوسرا چوکیدار اور ایک کل وقتی ملازمہ جو شیف کی بیوی تھی۔ یوں خاصی سہولت سے سب سلسلے چل رہے تھے۔

"مہریار! بیٹا کھانا کھا کے جانا۔ بس پلاؤ دم پہ دیا ہے۔ ابھی تیار ہو جائے گا۔"

کچن سے رباب آنٹی کی آواز ابھری تھی۔ ویک اینڈ پہ وہ اکثر کچھ نہ کچھ شوقیہ بنایا کرتی تھیں اور اسے محض ان کے میاں ہی کھایا کرتے تھے۔

ابھی بھی تھوڑا آگے جھک کے دھیمی آواز میں بولے۔ "کھا لینا چپ کر کے۔ نہ کھایا تو بھی مصیبت میں پڑ جاؤ گے اور کھا لیا تو تھوڑی سی زیادہ میں۔ لیکن کوئی بات نہیں میں نے دوسری والی سے نجات کے لیے چورن رکھا ہوا ہے پر پہلی والی کے ذمہ دار تم خود ہو گے۔" کہہ کر ایک زوردار قہقہہ ان کے حلق سے برآمد ہوا تھا اور مہریار بھی بے ساختہ ہنس دیا تھا۔ کچن سے دوبارہ رباب آنٹی کی آواز آئی۔

"کہہ لیں، کہہ لیں خان صاحب جو بھی کہنا ہے کہہ لیں۔ سب چورن پھکیاں جانتی ہوں آپ کی۔ اور مہریار تم ان کی باتوں میں مت آنا یہ چاہتے ہی نہیں کہ کوئی کچھ ڈھنگ کا کھا سکے۔"

"لو دیکھو۔ بس الف سے ے تک زبردستی ہے صاحب۔ آؤ بھی، کھاؤ بھی، اور پھر کھا کے واؤ واؤ بھی کر کے جانا پڑے گا تمہیں۔ مجھے بھی تعریف کرنی ہی پڑتی ہے نہ کروں تو اگلے دو دن اپنے ہاتھ کا کھلاتی ہیں۔ اور اس سے بچنے کے لیے میں اتنی تعریف کرتا ہوں کہ ساتھ ملازموں کو بھی کھلا کے سب ہی چٹ کروا دیتا ہوں۔ ورنہ اس پاپی پیٹ کے پاپوں میں اضافہ ہو جاتا ہے۔"

اب کے مہریار کو اپنا چائے کا کپ ٹیبل پہ رکھنا پڑا تھا۔ ہنسی اس قدر بے ساختہ تھی کہ اگر نہ رکھتا تو چھلک جاتا۔

"آپ بھی کمال ہیں سر۔ کبھی نہیں بدلیں گے۔ اتنا تو اچھا پکاتی ہیں آنٹی۔ قدر کیجیے کہ ایسی خاتون خانہ ملیں ہیں آپ کو۔"

مہریار کی خاصی بے تکلفی تھی ڈاکٹر خان سے اور وہ اکثر ہلکے پھلکے مذاق بھی کر لیا کرتا تھا۔ رباب آنٹی ایپرن اتارتی وہیں چلی آئیں اور میاں کے ساتھ بیٹھ کے انہیں تیکھے چتونوں سے گھورتے ہوئے بولیں۔

"بہت جھوٹے ہیں خان صاحب آپ۔ مجھے تو کہتے ہیں کہ اتنا اچھا پکاتی ہو کہ ہاتھ چومنے کو دل کرتا ہے اور پیٹھ پیچھے بدخوئیاں کر رہے ہیں۔"

"ہاں تو اسی لیے کہتا ہوں نا ورنہ الٹ بول دوں تو وہی ہاتھ گال پہ چھاپ دو۔" پھر قہقہہ۔

رباب آنٹی نے ماتھے پہ ہاتھ لے جا کے جھٹکا جیسے تھکی ہوں "لگے رہیے۔"

پھر مہریار سے مخاطب ہوئیں۔

"مہر۔ زوہا کے آپریشن کا کیا کر رہے ہو ابھی۔ مزید دیر نہ ہونے دو بیٹا۔ ان کی پریشانی معمولی نہیں ہے۔ عمر گزر گئی ان ماں بیٹی کی تکلیفیں کاٹتے ہوئے۔ اب کم از کم زوہا کا آپریشن ہو جائے تو کسی طرف سے تو سکون ہو گا انہیں۔"

"دیکھو مہریار۔" ڈاکٹر خان سنجیدگی سے بیچ میں بولے "تم ڈاکٹر قریشی اور ڈاکٹر چیمہ سے کیس ڈسکس کرو۔ میں نے ان سے ذکر کر دیا تھا۔ وہ دونوں تمہارے لیے ہیلپ فل ثابت ہوں گے۔ اور پھر اس کے بعد جیسے چاہو ہینڈل کر لو۔ آئی بلیو کہ تم ان شاء اللہ سکسیس فل رہو گے۔"

ڈاکٹر خان کو مہریار کی قابلیت پہ پورا بھروسا تھا۔ وہ ان کے قابل ترین شاگردوں میں سے تھا۔ مہریار نے اثبات میں سر ہلایا اور رباب آنٹی کو دیکھتے

ہوئے بولا۔

"آپ بالکل فکر نا کریں۔ اسی ویک کے اینڈ پہ آپ لے آیئے گا زوہا کو۔ ڈاکٹرز کا پینل بیٹھے گا اور سارا کیس ایک بار تھارولی ڈسکس ہو جائے گا اور چند ضروری ٹیسٹ بھی کروانے ہوں گے۔ جیسے ہی رپورٹس ملیں گی اس کے بعد ان شاءاللہ چار پانچ دن میں آپریشن کی ڈیٹ دے دوں گا۔ باقی جو اللہ کو منظور۔"

"شکریہ بیٹا۔ تم بہترین انسان ہو۔ اپنے ماں باپ کی اچھی تربیت کا ثبوت ہو۔ لیکن......" رباب آنٹی متذبذب انداز میں اسے اور شوہر کو دیکھا۔ "میں چاہتی ہوں ایک بار کسی بہانے سے میں تمہیں زمن کے گھر لے جاؤں۔ کیا کہتے ہو۔؟"

مہریار چند پل کچھ سوچتا رہا اور پھر کھڑا ہوتے ہوئے بولا۔

"میں تیار ہوں۔ جب آپ لے جانا چاہیں۔"

"ٹھیک ہے۔ میں تمہیں کال کر دوں گی۔ مجھے پک کر لینا اور چلے چلنا۔" رباب آنٹی جوش سے کہتی ساتھ ہی اٹھ کھڑی ہوئیں۔ ڈاکٹر خان نے لقمہ دیا۔

"بیگم صاحبہ! دھیان سے۔ لینے کے دینے نہ پڑ جائیں۔ وہ لوگ پہلے ہی مستقل حالات کی ستم ظریفی کا شکار رہے ہیں۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ بدگمانی پیدا ہو جائے۔"

"فکر نہ کریں۔ کچھ نہ ہو گا۔ سب ان شاءاللہ بہتر ہی ہو گا۔"

رباب آنٹی نے مہریار کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے پرامید لہجے میں کہا تو وہ محض تسلی آمیز نگاہوں سے دیکھ کر رہ گیا تھا۔

☆☆☆

چوہدری حیات راؤ شہر جا رہے تھے۔ بہت دن سے کشور بی بی نے پنڈ کی سوغاتیں جوڑ رکھی تھیں۔ بیٹے سب ہی دیسی خوراکوں کے شوقین تھے سوائے مہریار کے جو اپنی خوراک میں کولیسٹرول کا خصوصی خیال رکھتا تھا۔ کشور بی بی کے لیے یہی کافی تھا کہ وہاں شہر میں ان کی اولاد دیسی گھی اور پنجیریوں حلووں کو ترستی نہیں۔ نانی پیاری میں اب اتنی ہمت ہی کہاں تھی کہ وہ کچن میں کھڑی ہو کے حلوے پنجیریاں بنا سکیں۔ اس لیے گاؤں سے ان نعمتوں کا آنا ان کے لیے بھی مقام شکر تھا۔ چوہدری حیات راؤ مہینے میں دو تین بار چکر لگا لیا کرتے تھے لیکن اس بار انہیں دیر ہو گئی تھی۔ اسی لیے ڈرائیور ساتھ لائے تھے تا کہ حیات مینشن سے ہو کے وہ شہر میں دوسرے کام بھی نمٹا سکیں۔ مہریار سے وہ اس کے ہسپتال مل لیا کرتے تھے۔ انہیں اچھا لگتا تھا جب وہ اس کے ہسپتال جاتے اور وہاں اسے مصروف سا ادھر سے ادھر آتا جاتا دیکھا کرتے۔ مہریار ان کا فخر تھا، مان تھا، بھروسا تھا۔ وہ اس کی خاطر سب سے ٹکر لے سکتے تھے۔ ان ہی سوچوں میں غلطاں وہ شیشے سے باہر دوڑتی کبھی کبھی دیکھ رہے تھے جب اچانک ڈرائیور نے زوردار بریک لگا کے گاڑی روک دی تھی۔

"او یار اللہ داد! کیا ہو گیا تجھے۔ ہولا رکھ ہتھ۔ کیوں لگایا ہے اس طرح بریک۔؟"

"وہ جی چوہدری جی اک کڑی آ گئی سے جی۔ اچانک آئی ہے تو بریک بھی اچانک ہی لگنی سی نا جی۔"

ڈرائیور اللہ داد نے ذرا سا رخ موڑ کے حیات راؤ سے کہا جو پہلے ہی تشویش سے آگے ہو کے فرنٹ اسکرین سے باہر کا منظر دیکھ رہے تھے۔ ایک سیاہ چادر میں لپٹی لڑکی ان کی گاڑی کے آگے جھکی نیچے سے کچھ اٹھا رہی تھی۔ جب وہ سیدھی ہوئی تو اس کے ہاتھ میں بلی کا چھوٹا سا بھورا اور سفید خوب صورت سا بچہ تھا۔ اسے سہلاتی ہوئی وہ واپس ہونے لگی تو پل بھر کو رک کے کچھ سوچتی حیات راؤ کی طرف والے دروازے کی جانب آئی۔ جو اب اسے مسکراتی نظروں اور نرم تاثرات سے دیکھ رہے تھے۔ اس کے قریب آنے پہ انہوں نے شیشہ فوراً نیچے کیا اور متوجہ

ہوئے۔

"معذرت چاہتی ہوں انکل۔ آپ کو پریشانی ہوئی۔ اصل میں یہ بلی کا بچہ آپ کی گاڑی کے نیچے آ جاتا اگر میں فوراً اسے پکڑتی ناتو۔"

"تو بیٹا خدانا خواستہ آپ کو کچھ ہو جاتا تو۔"

"اگر تقدیر میں ہوتا تو ہو بھی جاتا۔ لیکن بلی کا بچہ تو بچ گیا نا۔" اس کے بے ساختہ جواب پہ حیات راؤ مسکرائے اور اثبات میں سر ہلایا۔ وہ لڑکی واپس پلٹ کے جانے لگی تو انہوں نے اسے مخاطب کیا۔

"کہاں جانا ہے بیٹا آپ کو۔ میں چھوڑ دیتا ہوں۔"

"نہیں نہیں۔ کوئی بات نہیں۔ میں رکشا لوں گی۔ آپ زحمت نا کریں۔"

"مجھے زحمت نہیں ہوگی۔ آپ کے والد کی عمر کا ہوں بیٹا۔ آپ مجھ پہ بھروسہ کر سکتی ہو۔ آجاؤ۔ جہاں جانا ہے وہاں چھوڑ دیتا ہوں۔ آجاؤ۔ اللہ داد دروازہ کھولو۔"

حیات راؤ کو نجانے کیسی انسیت سی محسوس ہو رہی تھی اس سے جو اصرار کے ساتھ اسے گاڑی میں بیٹھنے کی دعوت دے رہے تھے۔ وہ لڑکی شش وپنج میں مبتلا چند پل کچھ سوچتی رہی۔ پھر ایک گہری سانس بھرتے ہلکا سا سر ہلاتی دوسری جانب آئی جہاں اللہ داد دروازہ کھولے کھڑا تھا۔ گاڑی میں بیٹھ کے بلی کا بچہ اس نے گود میں رکھا اور اپنا بیگ پہلو میں رکھ لیا۔ حیات راؤ محویت سے اس کی حرکات وسکنات کا جائزہ لے رہے تھے۔ پھر انہوں نے اللہ داد کو گاڑی چلانے کا کہہ کر دوبارہ اس کی طرف متوجہ ہوتے ہوئے پوچھا۔

"کہاں رہتی ہو آپ بیٹا؟"

"جی یہاں سے دس منٹ کی ڈرائیو ہے۔ اس روڈ پہ سیدھا جانا ہے آگے سے میں بتا دیتی ہوں۔" وہ متانت سے بولی۔

حیات راؤ اس کی اونچی روشن پیشانی اور کھڑے نقوش دیکھ رہے تھے۔ مڑی ہوئی پلکیں جو انہیں کسی کی یاد دلا رہی تھیں۔ سپید اور گلابی رنگت اور سادہ چہرہ۔ انہوں نے سر جھٹکا اور رخ پھیر کے باہر نگاہ دوڑاتے ہوئے پوچھا۔

"والد کیا کرتے ہیں بیٹا آپ کے۔"

"ان کی ڈیتھ ہو چکی ہے۔ بہت چھوٹی تھی میں تب۔" وہ سبھاؤ سے جواب دیتی بلی کے بچے کو سہلا رہی تھی۔

"اوہ۔۔ افسوس ہوا۔ تو والدہ ہیں۔۔۔؟"

"جی الحمدللہ ہیں۔ اور ایک چھو......"

"چوہدری صاب، ہسپتال آگیا ہے جی۔"

اس کی بات مکمل ہونے سے پہلے ڈرائیور بول پڑا۔ وہ خاموش ہو کر اچنبھے سے حیات راؤ کو دیکھنے لگی۔

"بس بیٹا دو منٹ کا کام ہے یہاں۔ آپ کے گھر کے رستے میں پڑتا تھا تو سوچا نمٹاتا جاؤں۔ آؤ آپ بھی اندر چلو میرے ساتھ۔ زیادہ دیر نہیں لگے گی۔ بے فکر ہو کر آؤ۔"

ہسپتال کی عالیشان عمارت کو دیکھتی وہ سوچ میں پڑ گئی تھی آیا کیا کرے۔ حیات راؤ گاڑی سے اترنے لگے تو پل بھر کو رک کے اس کی جانب شفقت سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"آپ نے اپنا نام تو بتایا نہیں بیٹا۔ کیا نام ہے آپ کا۔؟"

"جی۔۔ میرا نام زمن ہے۔"

"ماشاءاللہ بہت پیارا نام ہے۔ آؤ بیٹا جی اترو پھر۔ پانچ دس منٹ لگیں گے بس۔ آجاؤ پھر آپ کے گھر چھوڑ دیتا ہوں آپ کو۔"

چوہدری حیات راؤ تو اتر گئے اور ہاسپٹل کو دیکھتے ہوئے زمن کے تصور میں ڈاکٹر مہریار کا چہرہ اتر آیا۔

"لو بلاوجہ اس کھڑوس سے سامنا ہو گیا تو۔ میرا موبائل پہلے ہی ہتھیا کے بیٹھ گیا۔ خواہ مخواہ کو بدمزگی نہ ہو زوہا کے آپریشن سے پہلے۔"

وہ دل میں بڑبڑاتی دروازہ کھول کے نیچے اتر

آئی۔ اترتے ساتھ ہی اس نے ہاتھ میں تھاما بلی کا بچہ نیچے رکھا تو وہ جیسے قید سے چھوٹا تھا۔ سرپٹ ایک طرف کو بھاگ گیا۔ وہاں قریب ہی کوڑے کے ڈرم کے پاس ایک دو بلیاں موجود تھیں۔۔ وہ سیدھا اسی جانب گیا تھا۔ زمن مرے مرے قدموں سے چوہدری حیات راؤ کے پیچھے چلنے لگی۔

☆☆☆

چھوٹے سے گھر کا چھوٹا سا کمرا اس وقت زوہا کی ہذیانی چیخوں سے گونج رہا تھا۔ ہاجرہ اس کے پاس موجود تھیں اور اسے سنبھالنے میں ناکام ہو رہی تھیں۔ وہ بھلے سے ہل جل نہیں سکتی تھی لیکن اس کے بازوؤں کی طاقت ہی ہاجرہ کو زیر کر دیا کرتی تھی۔ ایسا دورہ اسے اکثر پڑا کرتا جب وہ اپنی حالت اور معذوری سے بیزار ہو جاتی۔ پہلے وہ سسکنا شروع کرتی اور پھر اپنی مٹھیاں بھینچ کے خود کو پیٹنے لگتی۔ اپنی ٹانگوں اور کمر کے حصوں پہ مکے برساتی۔ ہاجرہ اس کی ذہنی حالت سمجھتی تھیں لیکن بے بس تھیں۔ زمن گھر ہوتی تو ان سے بہتر وہ زوہا کو سنبھال لیا کرتی تھی۔ لیکن آج چونکہ وہ اکیلی تھیں تو یہ آفت انہی کے سر پڑی تھی۔

زوہا کی چیخیں جب چھت پھاڑنے لگیں تو ہاجرہ فوراً باہری دروازے بند کرنے بھاگیں تاکہ آواز گھر سے باہر نہ جائے۔ کئی بار ایسا ہوتا تھا کہ زوہا کی چیخیں سن کر محلے کی عورتیں چلی آتی تھیں۔ ان کا رحم اور ترس زوہا کو مزید پاگل کرنے کا سبب بنتا۔ وہ خود بھی زوہا کے لیے ایسی نگاہیں سہہ نہیں پاتی تھیں۔ اسی لیے اب فوری طور پر کھڑکیاں دروازے بند کر دیا کرتی تھیں۔ وہ زوہا کے قریب بیٹھ کے اسے خود میں بھینچے ہوئے تھیں۔ زوہا بے خودی اب اپنے بجائے ماں کو پیٹ رہی تھی۔ ہاجرہ اس کے مکے سہہ رہی تھیں اور آنسو پی رہی تھیں۔

قسمت نے انہیں کیا دن دکھائے تھے۔ ان کی جوان اور خوب صورت بیٹی محض چھوٹے سے حادثے کے باعث کئی ماہ سے بستر کی نذر ہوئی پڑی تھی۔

"کاش ان کے پاس ڈھیروں روپے ہوتے۔"

ایک بار پھر اس سوچ کے آتے ہی ان کی آنکھوں کے ساتھ دل بھی جلنے لگا۔ انہوں نے اپنی عمر کے کئی سال کسمپرسی میں کاٹ لیے تھے لیکن اب یہ تنگ دستی ان کی زوہا کی صحت کے آڑے آ چکی تھی۔ اگر ان کے پاس وسائل ہوتے تو زوہا اپنے پیروں پہ کب کی کھڑی ہو چکی ہوتی۔ ایک آپریشن کی دوری پہ زوہا کی ہنستی کھیلتی زندگی تھی لیکن اس دوری کو پاٹنے کے لیے خطیر رقم کی ضرورت تھی۔

زوہا کا ہاتھ سائیڈ ٹیبل پہ رکھے اسٹیل کے جگ اور گلاس کو لگا تھا اور زوردار کان پھاڑتی آواز کے ساتھ وہ چیزیں زمین بوس ہو چکی تھیں۔ ہاجرہ ایک تکلیف دہ سانس اندر کھینچ کر اپنی جگہ سے اٹھیں اور موبائل ڈھونڈنے لگیں۔ اس وقت بس زمن ہی آ کر زوہا کو سنبھال سکتی تھی اور آج اسے روٹین سے کچھ تاخیر بھی ہو چکی تھی۔ کمرے میں موبائل نہ پا کر انہوں نے روتی چیختی زوہا پہ ایک افسردہ نگاہ ڈالی۔ موبائل یقیناً لاؤنج میں تھا۔ وہ دوپٹے کے پلو سے آنکھیں خشک کرتیں دروازے بھیڑ کر باہر نکل گئیں۔

☆☆☆

حیات راؤ کے پیچھے پیچھے چلتی زمن نے کلائی میں بندھی گھڑی دیکھ کر وقت دیکھا۔ اسے گھر پہنچنے میں دیر ہو رہی تھی لیکن وہ حیات راؤ کے پرشفقت رویے سے اتنی متاثر ہوئی تھی کہ انہیں ٹوکنے کی ہمت نہیں کر پا رہی تھی۔ اب جب دیر ہو ہی گئی تھی تو دس پندرہ منٹ اور سہی۔ حیات راؤ جس جانب جا رہے تھے یہ سب کاریڈورز اور لابیز اس کی دیکھی بھالی تھیں۔ رباب آنٹی کے ساتھ وہ ڈاکٹر مہر یار کو ملنے یہیں تو آئی تھی۔ اس نے ایک پل کو سوچا کہ وہ حیات راؤ سے پوچھے کہ وہ یہاں کس سلسلے میں آئے ہیں لیکن خاموش رہی۔ اگلے دو منٹ میں اس کی نگاہوں کے سامنے جس آفس کی نیم پلیٹ تھی اس پہ جلی حروف سے "نیوروسرجن ڈاکٹر مہر یار راؤ" چمک رہا تھا۔ اس کی نگاہوں کے سامنے جیسا سب ہی کچھ گھوم گیا۔ وہ ایک نظر حیات راؤ پہ ڈال رہی تھی تو دوسری نیم پلیٹ پہ۔ ایک دم جیسے جھماکا سا ہوا۔

''اچھا تو یہ اس سڑیل کے والد ہیں۔ اور یہ کھڑوس تو بالکل ان انکل کی جوانی ہے۔ لو بھلا بتاؤ۔ مجھے راستے میں ہی کچھ جانا چاہیے تھا۔'' وہ دل میں اپنی عقل پہ افسوس کرتی خود کو کوس رہی تھی۔ واپس ہو نہیں سکتی تھی کہ وجہ کیا بتاتی اور مہر یار کا سامنا کرنا نہیں چاہتی تھی فی الحال کہ ابھی موبائل کا غصہ تازہ تھا۔

چوہدری حیات راؤ نے ہلکا سا ناک کر کے استحقاق کے ساتھ دروازہ کھولا اور اسے سر کے اشارے سے اندر آنے کا کہہ کر خود اندر داخل ہو گئے۔ زمن ہونٹ بھینچتی اپنا بیگ مضبوطی سے تھامتی ان کے پیچھے پیچھے چھپتی اندر داخل ہو گئی۔ سامنے مہر یار اپنی ریوالونگ چیئر کا رخ دوسری جانب کیے کچھ رپورٹس دیکھ رہا تھا۔ حیات راؤ نے گلا کھنکار کے اسے اپنی جانب متوجہ کیا تو وہ تیر کی سی تیزی سے سیدھا ہوا اور یکدم جگہ چھوڑتا گرم جوشی سے باپ کی جانب بڑھا۔

''اباجی! واٹ اے پلیزنٹ سرپرائز۔ ہر بار کی طرح حیران ہی کیا آپ نے۔''

مہر یار راؤ باپ کے گلے لگ گیا۔ حیات راؤ نے محبت اور شفقت سے اسے بھینچ لیا۔ تب ہی ان کے کندھے کے اوپر سے مہر یار کی نگاہ اس پہ پڑی تو وہ ادھر ادھر دیکھتی خود کو لاتعلق ظاہر کروانے لگی۔ مہر یار نے نظر کی عینک لگا رکھی تھی جس کے اوپر سے وہ اسے اچھے سے جانچ رہا تھا۔

''بدتمیز۔ کون کہے گا اسے ڈاکٹر۔ ہر چیز کا معائنہ کرنے لگ جاتا ہے۔ آنکھیں دیکھو ذرا اس کی جیسے اندر تک اترتی ہوں۔ عینک تنی سوٹ کر رہی اسے ویسے۔ اس کے اباجی نہ موجود ہوتے تو لگا دیتی اسے۔'' وہ حسب معمول دل ہی دل میں شیر بنی اسے لتاڑ رہی تھی۔ مہر یار سیدھا ہوا اور عینک اتار کے ہاتھ میں پکڑتا حیات راؤ سے استفسار کرنے لگا۔

''ان کو جانتے ہیں کیا آپ اباجی۔ یہ کیسے آپ کے ساتھ آ گئیں۔ کہاں ملیں آپ کو۔؟''

اس کے لہجے کی کرید نے زمن کو ٹھٹکا دیا۔ ایک عجیب سی سبکی کا احساس اس کے چہرے پہ سرخی بن کے دوڑا لیکن اس نے رخ پھیر کے چھپا لیا۔ حیات راؤ کرسی پہ بیٹھ گئے اور زمن سے مخاطب ہوئے۔

''بیٹا! آؤ نا، بیٹھو۔ یہ میرا بیٹا ہے۔ بس اسی سے ملنے کے لیے رکا ہوں۔ تسلی سے بیٹھو بس ابھی چلتے ہیں۔''

''جی۔ وہ انکل اکیڈمی میں خود سے چلی جاتی ہوں۔ امی پریشان ہو رہی ہوں گی۔ پہلے ہی کافی لیٹ ہو چکی ہوں۔''

وہ بیٹھنے کے بجائے وہاں سے نکلنے کے پر تولنے کو تھی جب مہر یار کی سرد اور بھاری آواز اس کے کانوں سے ٹکرائی۔

''بیٹھ جائیں۔ بزرگوں کا کہا نہیں ٹالا کرتے اس میں بہتری ہوتی ہے۔ بیٹھیں۔''

آخر میں اس کا انداز ڈپٹنے والا ہو گیا تھا۔ زمن بے اختیار بیٹھ گئی۔۔ حیات راؤ کو ہنسی آ گئی۔ وہ اس کی خفت مٹانے کی خاطر بولے۔

''برا نہ ماننا بچی۔ یہ میرا بیٹا ذرا مزاج کا کڑوا ہے لیکن دل سونے کا ہے اس کا۔'' پھر وہ مہر یار کو دیکھتے ہوئے زمن سے ملاقات کا قصہ مختصراً دہرانے لگے۔

''میں انہیں جانتا ہوں اباجی۔ ان کی بہن کا کیس ہے میرے پاس۔ ان شاء اللہ اسی ماہ کے اینڈ تک ان کو آپریشن کی ڈیٹ دے رہے ہیں ہم۔ دیکھیں اللہ بہتری کرے گا ان شاءاللہ۔''

حیات راؤ تعجب سے زمن سے زوہا کے متعلق پوچھ گچھ کرنے لگے۔ وہ سر جھکائے اس کی حالت اور کیفیت انہیں بتانے لگی۔ اس دوران مہر یار نے ایک پل کو بھی اس کے چہرے سے اپنی سپاٹ نگاہیں نہیں ہٹائی تھیں۔ اس کی نگاہوں کی گرمی یا سرد مہری تھی جس نے زمن کو چونکنے پہ مجبور کیا تھا۔ اس نے بے اختیار سر اٹھا کے دیکھا تو مہر یار کو خود کو دیکھتے پایا۔ اسے لگا کہ اب وہ اپنی نظریں ہٹا لے گا لیکن وہ یک ٹک بے تاثر نگاہیں اس پہ مرکوز کیے ہوئے تھا۔ زمن کو اپنی ہی نظر پھیرنی پڑی تھی۔

''چول۔ بدتمیز۔ اتنا بڑا ڈاکٹر اور کام دیکھو ذرا

اس کے۔"

دل میں اسے کنارتی وہ حیات راؤ کے کسی سوال کا جواب دینے لگی تھی جب بیگ میں پڑا اس کا موبائل بج اٹھا۔ اس نے معذرتی کلمات کہتے بیگ سے موبائل نکالا اور کال پک کی۔

"جی۔ کب۔ تو آپ کو چوٹ تو نہیں آئی۔"

وہ ایک دم اپنی جگہ سے اٹھی تھی۔ حیات راؤ سیدھے ہوکے اسے دیکھنے لگے جب کہ مہر یار تسلی سے کرسی کے ساتھ پشت ٹکیے ہلکے ہلکے جھولتے کہنی ٹیبل پہ ٹکائے اور ہاتھ ٹھوڑی پہ جمائے اسے ہی دیکھ رہا تھا۔ زمن اب اس کی نگاہوں سے کنفیوز ہو رہی تھی۔ بات کرتے ہوئے اس کے ہاتھ میں معمولی سی لرزش تھی۔

"میں بس پہنچ رہی ہوں۔ آپ فکر نہ کریں۔ دس منٹ لگیں گے مجھے۔ ابھی آئی بس۔"

کال بند کر کے وہ حیات راؤ سے عاجزی کے ساتھ مخاطب ہوئی۔

"سوری انکل! مجھے جانا ہوگا۔ آپ پلیز مجھے چھوڑنے کی زحمت مت کیجیے۔ اصل میں میری امی کی کال تھی۔ میری بہن اکثر اپنی بیماری کی وجہ سے ہسٹریکل ہو جاتی ہے۔ ابھی بھی اسے دورہ پڑا ہے۔ ایسے میں وہ امی کے قابو میں نہیں آتی۔ پلیز، مجھے جلدی پہنچنا ہوگا ورنہ وہ خود کو نقصان پہنچانے سے بھی دریغ نہیں کرتی۔ آپ کا بہت شکریہ لیکن میں چلتی ہوں۔ بہت اچھا لگا آپ سے مل کر۔"

وہ جلدی جلدی کہتی وہاں سے نکلنے کو تھی جب مہر یار نے اسے آواز دے کے روکا۔

"رکیں مس زمن۔ میں چلتا ہوں آپ کے ساتھ۔ آپ کی سسٹر کو بھی دیکھ لوں گا۔ اس وقت اسے آپ سے بھی زیادہ ایک ڈاکٹر کی ضرورت ہے۔" پھر وہ حیات راؤ سے مخاطب ہوا۔

"اباجی! آپ گھر چلیں اور چنڈال چوکڑی سے ملیں جا کے۔ ریسٹ کریں تھوڑا۔ تب تک میں انہیں ڈراپ کر کے گھر پہنچتا ہوں۔"

زمن حیرت سے اس کا فیصلہ کن انداز دیکھ رہی تھی۔ نہ اس سے پوچھا کہ آیا وہ اس کے ساتھ جانا بھی چاہتی ہے یا نہیں، نہ اس کی اجازت لی بس حکم دے دیا تھا۔ کمال ہے!

"چلو ٹھیک ہے۔ جیسے تمہیں مناسب لگے۔" کہہ کر حیات راؤ بھی کھڑے ہو گئے اور زمن کو دیکھتے ہوئے محبت سے اس کے سر پہ ہاتھ رکھتے ہوئے بولے۔

"گھبراؤ نہیں۔ ان شاءاللہ جلد اچھی ہو جائے گی تمہاری بہن۔ تم بہت پیاری بچی ہو اور اتنی ہی باہمت بھی۔ یہ میرا کارڈ رکھ لو۔ کبھی کیسی بھی ضرورت پڑی تو پورے مان سے مجھ سے رابطہ کر لینا۔ ان شاءاللہ کام آؤں گا۔"

پتا نہیں کس جذبے کے تحت حیات راؤ اس سے محبت جتا رہے تھے یہ نہ انہیں پتا تھا نہ زمن کو۔ لیکن اس کی آنکھیں بھیگ گئی تھیں ان کے ہاتھ سے کارڈ لیتے، وہ آنسو پی گئی۔ حیات راؤ نے محبت سے اس کے سر پہ ہاتھ رکھا۔ وہ انہیں الوداع کہتی باہر کی جانب قدم بڑھا گئی۔ اس نے اپنے پیچھے مہر یار کی آواز سنی تھی جو باپ سے کچھ کہہ رہا تھا۔ وہ رکی نہیں اور تیز تیز قدموں سے کاریڈور عبور کرتی ہاسپٹل کے داخلی دروازے کی جانب بڑھ رہی تھی۔

وہ تیز قدموں سے پارکنگ سے باہر نکل رہی تھی جہاں ایک قطار میں رکشا اور چنگ چی وغیرہ کھڑی تھیں۔ اس کی کوشش تھی کہ وہ مہر یار کے باہر آنے سے پہلے یہاں سے نکل لے۔ جہاں تک زوہا کو دیکھنے کی بات تھی تو وہ تو ویسے ہی جلد رباب آنٹی کے ہمراہ اسے ہاسپٹل لانے والی تھی تھاروئی چیک اپ کروانے کے لیے۔ لیکن ڈاکٹر مہر یار کو گھر تک لے جانے کی کوئی تک نہیں تھی۔ وہ مانتا نہیں چاہتی تھی لیکن وہ اندر سے مہر یار کی شخصیت سے متاثر ہو چکی تھی۔

ایک خالی رکشے میں بیٹھ کے وہ اسے جلدی جلدی پتا سمجھانے لگی۔ رکشے والے نے رکشہ اسٹارٹ کیا اور ٹرن لے کے سڑک پہ ڈالا ہی تھا جب بالکل سامنے اچانک سے مہر یار کی گاڑی نے سائیڈ سے آ کر بریک لگائے تھے۔ رکشے والے کو ایک جھٹکے سے

رکشا روکنا پڑا۔ زمن ڈاکٹر مہریار کو دیکھ کے حیران ہوئی تھی۔ اسے امید نہیں تھی کہ وہ اس طرح سے اس کے پیچھے آجائے گا۔ مہریار نے شیشہ نیچے اتار کے اسے دیکھا اور سر کو خفیف سی حرکت دے کر اسے اشارہ کیا جس کا مطلب تھا کہ وہ رکشے سے اترے اور اس کے ساتھ آکے بیٹھے۔ زمن بیٹھی رہی۔ ہٹ دھرمی سے نہیں بلکہ اسے سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ کرے کیا۔

مہریار نے ایک ابرو اچکا کے اسے دوبارہ دیکھا اور ہارن دیا۔ وقفے سے وہ مسلسل چھوٹے چھوٹے ہارن دیتا چلا گیا کیونکہ یہ ہسپتال تھا اور یہاں وہ اس طرح شور بھی نہیں مچا سکتا تھا۔ زمن کو مجبوراً نیچے اترنا پڑا۔ اپنا بیگ کندھے پہ ٹھیک کرتی وہ ڈاکٹر مہریار کو خوفزدہ نگاہوں سے دیکھتی ساتھ والی سیٹ پہ آکے بیٹھ گئی۔ مہریار نے ایک نظر اس کے گود میں دھرے ہاتھوں کو دیکھا جن کی وہ مسلسل انگلیاں چٹخا رہی تھی اور مسکراہٹ چھپاتے ہوئے گاڑی سیدھی سڑک پہ ڈال دی۔

مہریار اس کی ایک ایک جنبش کو نوٹس کر رہا تھا۔ اس کے ہاتھوں میں خفیف سی لرزش تھی اور وہ مسلسل اپنے ہونٹ گول کر کے سانس چھوڑتی خود کو ریلیکس کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔ مہریار نے کچھ کہنا چاہا لیکن لب بھینچ گیا۔ باقی سارا راستہ دونوں میں کوئی بات نہیں ہوئی تھی۔ سوائے اس کے کہ اس نے زمن سے گھر کا راستہ پوچھا تھا اور وہ اس نے پتھر پھاڑ لہجے میں بتایا تھا۔ مقابل مہریار تھا جسے ایسے لہجوں کی عادت ہرگز نہیں تھی۔ اس کی پیشانی پہ اَن گنت بل پڑے تھے اور اس نے قدرے سخت لہجے میں اسے مخاطب کیا تھا۔

"خود سے بڑوں کے ساتھ تہذیب اور تمیز کے دائرے میں رہ کے بات کرنی چاہیے پھر چاہے کوئی رشتے میں بڑا ہو یا حیثیت میں۔"

وہ زمن کو ان دو فقروں میں جو جو باور کرا گیا تھا اس نے اسے پانی پانی کر دیا تھا۔ یعنی ڈھکے الفاظ میں اس نے اپنی اور اس کی حیثیت کا تعین بھی کر دیا تھا۔ زمن کے حلق میں گولا سا پھنسا۔ وہ تھوک نگلتے بمشکل اپنے آنسو ضبط کرنے کی کوشش کرتی رہی۔ گھر آنے تک پھر ان دونوں میں دوبارہ کوئی بات نہیں ہوئی۔

گاڑی رکتے ہی زمن تیزی سے اتری اور گھر میں داخل ہو گئی۔ مہریار نے ہونٹ بھینچ کے نفی میں سر ہلاتے ہوئے ہارن پہ ہاتھ رکھ دیا اور تب تک نہیں ہٹایا جب تک وہ دوبارہ باہر واپس نہیں آگئی اور اسے پورے احترام سے اپنے ساتھ اندر نہیں لے گئی تھی۔ مہریار کی مسکراہٹ اس کے دل کو جلاتی رہی اور اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ اسے بے نقط سناتی۔ لیکن مجبوری اسے اس کے سامنے ہاتھ باندھے کھڑا رہنے پہ مجبور کر دیتی تھی۔

☆☆☆

زوہا سو چکی تھی۔ ڈاکٹر مہریار نے اسے سکون آور انجکشن دیا تھا۔ اس کی دواؤں میں ایسی کئی دوائیاں موجود تھیں جو محض اس کے اعصاب کو پرسکون رکھنے کے لیے تھیں اور انہی میں انجکشنز بھی تھے۔ جوں جوں آپریشن میں تاخیر ہوتی چلی گئی تھی زوہا کا ڈپریشن بڑھتا چلا گیا تھا اور مجبوراً اسے ایسی ہی دواؤں پہ رکھنا پڑتا تھا جس سے وہ پرسکون رہے۔

جس وقت مہریار زمن کی تقلید میں کمرے کے اندر داخل ہوا تھا۔ ہاجرہ، زوہا کو سنبھالنے میں پوری طرح ہلکان ہو چکی تھیں۔ مہریار کو تادیکھ کر وہ چونکی تھیں لیکن اس سے پہلے کہ کچھ کہتیں، مہریار نے ہاتھ کے اشارے سے انہیں فی الوقت روک دیا تھا اور خود آگے بڑھ کر زوہا کو دیکھنے لگا۔ اس کے سائیڈ ٹیبل پہ پڑی دوائیں دیکھ کر اس کے چہرے پہ تاسف کی لکیریں ابھریں لیکن کچھ کہنا عبث تھا۔ فوری طور پر اس نے زوہا کو انہی دوائیوں میں موجود انجکشن دے دیا تھا جس سے وہ سو گئی تھی۔ اس کے بعد اسٹول کھینچ کے تسلی سے وہیں بیٹھ کے تفصیلاً دوائیوں کا اور زوہا کا معائنہ کرنے لگا۔ تمام رپورٹس تو وہ تب ہی دیکھ چکا تھا جب زمن اور رباب آنٹی اس کے پاس آئی تھیں۔

"جب تک آپریشن کی حتمی تاریخ نہیں دی جاتی ان سب میڈیسنز کا استعمال ترک کر دیں اور جو لکھ کے

دے رہا ہوں۔ بس وہی دیں۔"

مہریار نے ایک پیپر پہ کچھ دوائیاں لکھ کے زمن کے حوالے کیا۔ ہاجرہ اس دوران خاموشی سے سب دیکھتی رہی تھیں۔ اتنا تو انہیں اندازہ ہو ہی گیا تھا کہ یہ وہی ڈاکٹر ہے جس کے پاس زمن اور رباب گئی تھیں۔ وہ فارغ ہو گیا تو انہوں نے پُرشفقت لہجے میں بات شروع کی۔

"بیٹا۔ زمن نے مجھے آپ کے بارے میں بتایا تھا۔ یقین مانو ہم تمام زندگی آپ کے بے دام غلام رہیں گے بس کسی طرح میری بچی کو اس کے پیروں پہ کھڑا کردو......!"

ہاجرہ جذباتی ہو گئی تھیں۔ ایک عرصے سے زوہا کی تکلیف دیکھ اور سہہ رہی تھیں۔ مہریار تو مانو ان کے گھر میں فرشتہ بن کر اتر آیا تھا۔ ان کی نگاہوں میں اس کے لیے عقیدت تھی۔ مہریار نے ان کے تاثرات کو بغور دیکھا تو نگاہیں جیسے ان کے نقوش میں الجھ گئیں۔ آنکھیں، پیشانی، ناک اور ٹھوڑی۔ سب ہی کو دیکھتے وہ کچھ کہنے کو الفاظ جوڑنے لگا۔

"آپ فکر نہ کریں۔ اس ہفتے ڈاکٹرز کا پینل بیٹھے گا اور بس چند مزید ٹیسٹ ہوں گے۔ اس کے بعد آپریشن کی ڈیٹ دے دی جائے گی۔ ان شاء اللہ امید ہے کہ آپریشن کامیاب ہو گا کیونکہ بہتری کے چانسز زیادہ ہیں۔ اللہ سے اچھے کی امید رکھیں بس۔"

وہ جھکی نگاہوں کے ساتھ ہاجرہ کو تسلی دے رہا تھا اور زمن اس کے اس انداز پہ حیرت زدہ تھی۔ اتنی عزت واحترام تھا اس شخص کی نگاہوں میں کہ وہ مرعوب ہو گئی۔ ہاجرہ نے مہریار کو زبردستی چائے پہ روک لیا تھا اور وہ بنا عذر کے ٹھہر بھی گیا تھا۔ جب تک زمن چائے لینے گئی، مہریار نے تفصیل سے پورے کمرے کا جائزہ لے لیا تھا۔ جو سادہ اور صاف ستھرا تو ضرور تھا لیکن کسی قسم کی آرائش وآسائش سے عاری تھا۔

☆☆☆

اپنے دفتر میں لیپ ٹاپ کی اسکرین کھولے بیٹھا شہروز راؤ کب سے ایک ہی زاویے پہ نگاہے ٹکائے سوچ میں گم تھا۔ لیپ ٹاپ کی روشنی اس کے چہرے کے کھڑے اور مغرور نقوش کو اجاگر کر رہی تھی۔ اس کے آفس میں نیم اندھیرا تھا۔ بلائنڈز گرے ہوئے تھے۔ ٹنٹڈ گلاس ڈور سے باہر اسٹاف چلتا پھرتا دکھائی دیتا تھا لیکن باہر سے اندر کا منظر نہیں دکھتا تھا۔ شہروز بظاہر لیپ ٹاپ پہ بزی تھا لیکن اس دن کا منظر ذہن کے پردے پہ بھاگ رہا تھا۔ اسے دیکھ کے جس تیزی سے وہ بھاگی تھی اس سے کہیں زیادہ پھرتی سے وہ خود اس کی جانب لپکا تھا لیکن بس لمحوں کا فرق تھا اور وہ اس کے ہاتھ سے نکل گئی تھی۔ گزشتہ کئی سالوں میں بارہا وہ اس تک پہنچا تھا لیکن ہر بار کوئی نہ کوئی ایسا اتفاق رونما ہوتا کہ تھی۔ یا ریت کی مانند وہ پھسل جاتی۔ یا اس کی قسمت تیز تھی یا شہروز کی بری۔ لیکن یہ مات شہروز راؤ کو ہضم کرنی مشکل تھی۔ وہ کوئی اس کا زرخرید تھا جو یوں اس کے پیچھے پیچھے بھاگتا۔ اتنے بڑے شہر میں اب تک وہ اس کے ٹھکانے سے لاعلم تھا تو محض اسی لیے کہ وہ شناخت بدلے ہوئے تھی۔ اس کا نام اور شخصیت تبدیل ہو چکی تھی ورنہ اتنے تو ریسورسز شہروز راؤ کے تھے کہ وہ اسے ڈھنڈوا کے حویلی پہنچا دیتا اور کانوں کان کسی کو خبر نہ ہوتی۔ تھوڑی دیر ایسی ہی حالت میں بیٹھے رہنے کے بعد اس نے لیپ ٹاپ کی اسکرین بند کی اور انٹرکام سے اپنی سیکرٹری کو اندر بلایا۔ ایک طرح دار سی لڑکی اندر داخل ہوئی اور چوکس و مؤدب ہو کے اس کے مقابل کھڑی ہو گئی۔

"مس لائبہ۔ میرے اگلے ایک ہفتے کے جتنے بھی اپائنمنٹس ہیں سب ہی کینسل کر دیں۔ مجھے بہت ضروری کام نپٹانا ہے اس ویک میں۔ میرا زیادہ تر وقت آفس سے باہر گزر سکتا ہے تو اس لیے پلیز کیئر فل۔ کسی قسم کی کوتاہی نہ ہو۔ زبیر صاحب کو بھی بلائیں کچھ لازمی انسٹرکشنز انہیں بھی دینی ہیں۔"

"جی سر۔ آپ بے فکر رہیں۔ میں سنبھال لوں گی۔ اور سر زبیر کو ابھی بھجواتی ہوں میں۔ جسٹ آ سنٹ۔" وہ مسکرا کے کہتی واپس ہونے لگی جب شہروز نے اسے روکا۔

"مس لائبہ۔ نادرہ کے دفتر میں جو کرکی

صاحب ہوتے ہیں، ذرا ان سے میرا کانٹیکٹ کروایے۔ ابھی۔"

"جی سر۔۔ شیور۔" وہ کہتی واپس مڑ گئی تھی۔ اور شہزور راؤ دوبارہ لیپ ٹاپ کی اسکرین اوپن کیے خود کو مصروف کرنے کی کوشش کرنے لگا تھا۔

☆☆☆

"حیات مینشن" کے لاؤنج میں چوہدری حیات راؤ کو چنڈال چوکڑی گھیرے بیٹھی تھی۔ داور اور یاور نے ان کے پہلوؤں کو مختص کر رکھا تھا۔ حرام تھا جو وہاں سے جنبش بھی کی ہو اور کسی اور کی باری آنے دی ہو۔ نانی پیاری کا بس نہیں چلتا تھا کہ انہیں بالوں سے پکڑ کے نیچے پٹخ دیتیں۔ لو بھلا بتاؤ کتنے مہینے بعد ان کا بھانجا کم جیجا گاؤں سے آیا تھا اور ان لڑکوں نے ڈھنگ سے حال احوال بھی دریافت کرنے نہیں دیا تھا۔ وہ ناچار دوسرے صوفے پہ بیٹھے باری باری سب کا پوچھ رہی تھیں۔ شہریار نیچے کارپٹ پہ بیٹھا باپ کی پچھلی ٹانگ گود میں رکھے دبا رہا تھا۔ جبکہ دوسری ٹانگ بالکل اسی پوزیشن میں زاروِن نے گود میں تو رکھی تھی لیکن وہ اپنے ماموں کے پیر کے انگوٹھے پہ غور وفکر کرنے میں مصروف تھا۔

"آ گیا سمجھ میں ماموں۔ اب لگا پتا مجھے۔"

وہ خوش ہو کے چیخا اور سب کو داد طلب نظروں سے دیکھا۔ حیات راؤ مسکرائے اور ہاتھ بڑھا کے اس کے بال سہلاتے ہوئے پوچھا۔

"کیا سمجھ میں آ گیا تمہیں۔ چلو اچھا ہے کچھ تو آیا۔ تمہاری ماں ناحق پریشان ہوتی ہے کہ میرے زاروِن کو کچھ پتا نہیں۔ اسے کبھی سمجھ نہیں آ سکتی۔"

حیات راؤ کہہ کر ہلکا سا ہنسے تو شہریار نے منہ نیچے کر کے ہنسی دبائی۔ کیونکہ وہ جانتا تھا زاروِن ابھی اسی بات کا ثبوت دینے جا رہا ہے۔

"یہ آپ کا انگوٹھا۔ تب سے سوچ رہا تھا کہ کس کی طرح ہے۔ ابھی یاد آیا کہ میری طرح ہے۔ یہ دیکھیں میرا انگوٹھا۔"

زاروِن نے فوراً اپنا پیر اونچا کیا اور فخریہ انگوٹھا لہرایا۔ شہریار نے "در فنے منہ" والی نظر اس پہ ڈالی لیکن وہ ابھی بھی اپنا انگوٹھا دیکھ رہا تھا۔۔ حیات راؤ نے تاسف سے اسے دیکھ کے سر جھٹکا۔

"یہ لڑکا نمرہ نے پاکستان بھیجا تھا کہ بندے کا پتر بن جائے لیکن مجھے تو لگتا ہے کہ جو تھوڑی بہت عقل ساتھ لایا تھا وہ بھی۔۔ یہ تینوں چوس گئے نمانے کی۔"

نانی پیاری نے حیات راؤ کی بات اچک کے نخوت سے لقمہ دیا۔ تینوں کی گردنیں ایک ساتھ نانی پیاری کی جانب اٹھیں پھر باپ کا لحاظ کر کے واپس سوڑلی گئیں۔ ورنہ پانی پت تو وہ نانی سے بھی چھیڑ لیا کرتے تھے۔

"اور تم تینوں۔ تم لوگ پڑھ رہے ہو ٹھیک سے کہ نہیں۔ مہریار کو تنگ تو نہیں کرتے ہو زیادہ۔ اور داور، یاور یہ بال کس لیے اس قدر بڑھا رکھے ہیں۔ غنڈے لگ رہے ہو دونوں۔"

حیات راؤ اب ان تینوں کی طرف بھرپور متوجہ تھے۔ داور نے کھسکنے کی کوشش کی وہاں سے لیکن نانی پیاری نے چھڑی کا ٹہوکا دے کے واپس بٹھا دیا۔

"ہائے میتو کچھ۔ غنڈے تو بڑا ہولا سا لفظ ہے۔ ست بدمعاش اک پاسے تے یہ دونیش اک پاسے۔ مہریار پٹ پٹ مار گیا ان دونوں مشٹنڈوں کو لیکن حرام ہے جو کسی شے کا اثر لیتے ہوں۔ مجھے تو لگتا ہے جوئیں بھی پے گئی ہوئی ہیں ان کے سروں میں۔ ہر ویلے تو کھرکتے رہتے ہیں۔"

حیات راؤ نے خشمگیں نگاہوں سے دونوں کو گھورا۔ شہریار نے ہاتھ چلا کے اپنے بال سیٹ کیے جو قدرے بہتر تھے۔

"اور تم۔ تمہاری یونیورسٹی کب ختم ہونی ہے۔ کب سے سن رہا ہوں یہ سمسٹر وہ سمسٹر۔ کس دن فارغ ہو گے تم۔ ماں تمہاری کو چین نہیں کہ کسی طرح لڑکوں میں سے کوئی پڑھ کے فارغ ہو اور وہ گھوڑی چڑھا دے۔ مہریار تو نہیں مانتا تو کم از کم تم ہی ماں کی خواہش پوری کرو۔"

حیات راؤ نیم سنجیدگی سے بولے۔ انہیں معلوم تھا کہ مہریار کسی بھی لڑکے کی تعلیم پوری ہونے سے پہلے

شادی نہیں ہونے دے گا۔ لیکن مزے لینے کو کہہ رہے تھے۔ شہریار تو کیا خوش ہوتا اس سے زیادہ بے چینی داور اور یاور کو لگی تھی۔

"ابا جی۔ اماں کو کہنا کہ ہمیں خدمت کا موقع دیں۔ اگر کبھی کوئی کسر رہنے دیں تو جو کالے چور کی سزا وہ ہماری۔ بس اس نیک کام میں ہمارا حصہ ڈلوا لیں۔۔۔اب تو ابا جی سولہ سولہ سال کے نیانے شادیاں کرار ہے۔ اپنے بال سنوارنے نہیں آتے لیکن ہاتھ میں اپنا کا کالے کے جھنڈ کروار ہے ہوتے ہیں۔ ہم تو پھر چار ماہ بعد انیس کے ہو جائیں گے۔"

داور نے بڑی لگاوٹ سے باپ سے لاڈ کیا تھا۔ زارون بھی نچلا ہونٹ لٹکائے شاید تصور میں ہاتھ میں کوئی کاکا پکڑے بیٹھا تھا جس کی وہ جھنڈ کروار ہا تھا۔ تب ہی دونوں آنکھیں ذرا سی میچ کے تھنے پھلا کے ماموں سے مخاطب ہوا تو لہجہ بھی تھوڑا خواب ناک تھا۔

"ماموں؟ آپ نے میری آنکھیں کھول دی ہیں۔"

"پہلے کھول تو سہی پوری۔ شر گرا ہوا ہے۔" شہریار بڑبڑایا۔

"میں نے سوچ لیا ہے کہ پڑھائی ہوتی رہے گی۔ یہ وقت ہے فیملی بنانے کا۔ آبادی بڑھانے کا۔ ہم دو ہمارے چار کا نعرہ لگانے کا۔ ویسے میرا دل اس سے زیادہ کا تھا لیکن امی کو اتنے ہی بتایئے گا۔ لیکن میں نے سوچ لیا ہے کہ شادی ٹھیک وقت پہ ہو جانی چاہیے اور وہ ٹھیک وقت یہی ہے۔"

"نہیں بیٹا یہی وقت ہے ماں سے جوتے کھانے کا۔ جو بچپن میں ہی وقت پہ بڑے ہوتے تو آج یہ دن مجھے نا دیکھنا پڑتا۔ آج سمجھ آگئی برخوردار کہ اس نے تمہیں یہاں کیوں بھیجا تھا، بڑا حوصلہ چاہیے ہوتا ہے تمہارے جیسی اولاد سنبھالنے کے لیے۔"

زارون کے نادر خیالات جان کے حیات راؤ تاسف سے دونوں ہاتھ جوڑے ان پہ تھوڑی ٹکائے بولے تھے۔ انہیں صحیح معنوں میں معلوم ہو رہا تھا کہ مہریار ان چاروں کو سنبھالتے کس طرح عاجز آتا ہو گا۔

شہریار کے ہاتھوں میں سلو موشن تالی بجانے کے لیے کھجلی ہو رہی تھی کیونکہ عام حالات میں اب تک تین سیشن ہو چکے ہوتے۔ نانی پیاری افسوس سے چاروں کو دیکھتے ہوئے حیات راؤ سے بولیں۔

"پتر اسی لیے کہتی ہوں کہ مہر کو منا شادی کے لیے۔ بس کر لاڈ دیکھنے۔ پیو ہے اس کا۔ زبردستی کہے گا تو مانے گا کیوں نہیں۔ ان ڈنگروں کو اگر سکون سے ڈگریاں دلوانی ہیں نا تو کوئی سیانی بیبی بچی لے آ گھر۔ ورنہ ان ڈنگروں کی ذہنی حالت تو تُو دیکھ ہی رہا ہے۔"

حیات راؤ ہنس دیے۔ ان کے لیے کوئی نئی بات نہیں تھی ان چاروں کی ایسی بے پر کی سننا۔ لیکن بات کو طول دیتے تھے کیونکہ اتنے دن بعد بچوں سے ملاقات ہوتی تھی اور وہ اداس بھی ہوا کرتے تھے تو ان چاروں کی ایسی ہی باتیں انہیں گاؤں واپسی پر یاد آ کر ہنسایا کرتی تھیں۔ ورنہ وہ جانتے تھے کہ مہریار پوری تندہی سے ان کے مستقبل کے لیے کوشاں ہے۔ ہر ہفتے مکمل رپورٹ انہیں گاؤں میں مہریار کی زبانی ملا کرتی تھی۔

وہ نانی پیاری کو ہلکے پھلکے انداز میں تسلی دیتے بہلانے لگے۔ لیکن دماغ میں پہلی بار مہریار کی شادی کی بات سن کر ایک چہرہ ابھرا تھا۔ اور جیسے اس چہرے کے ساتھ کئی اور چہرے ابھرتے چلے گئے تو انہوں نے فورا سر جھٹک کے دھیان ہٹایا تھا۔ کڑی در کڑی جڑے واقعات کو ذہن سے ہٹانے کے لیے وہ ان چاروں کی طرف متوجہ ہو چکے تھے لیکن جیسے ان چہروں نے شعور سے لاشعور کا رخ کیا تھا۔ کسی اور گھڑی میں یاد آنے کے لیے۔ وقت کی بساط بہت عجیب ہوا کرتی ہے۔ اس پہ مہرے پل پل کے حساب سے بدلتے ہیں اور چالیں تقدیر چلا کرتی ہے۔ شہ مات اپنے ہاتھ میں رکھ کر۔ مقدر کا سکندر کوئی بھی نہیں ہوا کرتا بس اندھیروں میں چلے تیر ہوتے ہیں جو نشانے پہ لگ جائیں تو بازی مات نہیں ہوا کرتی۔ جو نہ لگے تو ساری بساط الٹ جایا کرتی ہے۔

(باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ)

☆☆

فرح انیس

کراں مرشدی

''یزدان اٹھ جائیں۔'' وہ کمرے میں آکر اسے آواز دینے لگی۔

''تعبیر! سونے دو یار ایک ہی دن چھٹی کا ہوتا ہے۔'' یزدان تکیے میں منہ دیتے ہوئے نیند میں بولا۔

''اچھا اٹھ رہا ہوں، تم جاؤ اور آلو کے پراٹھے اور چائے بناؤ۔''

یزدان کی فرمائش پر تعبیر کی جان جل کر رہ گئی۔ کہاں تو وہ ابھی کچھ دیر پہلے ٹیرس میں کھڑی سوچ رہی تھی کہ اس خوب صورت موسم میں وہ یزدان کے ساتھ واک پر جائے گی اور پھر کسی اچھے سے ہوٹل میں ناشتا کرے گی مگر یزدان کی بات نے اس کے ارمانوں پر پانی پھیر دیا تھا۔

''میں اٹھ گیا ہوں اب کھڑی کیا ہو......! جاؤ میرے لیے پراٹھے بناؤ میں منہ دھو کر آتا ہوں۔'' وہ پاس سوئی زیب کو پیار کرتے ہوئے حکم صادر کرتا ہوا بیڈ سے اتر گیا۔

وہ منہ بناتی ہوئی باورچی خانے میں آکر یزدان کا من پسند ناشتا تیار کرنے لگی۔

تھوڑی دیر بعد وہ اس نے گرما گرم آلو کے پراٹھے اور چائے بنا کر ٹیبل پر رکھتے ہوئے وہ یزدان کو آواز دی۔

کتنا اچھا ہوتا اگر آج یزدان واک پر چلتے اور میں کسی ناول کی ہیروئن کی مانند یزدان کے کندھے پر سر رکھ کر دھیرے دھیرے سے چلتی، ہائے سب کچھ کتنا رومانٹک ہوتا۔ یہ سوچتے اس نے یزدان کو

فجر کی نماز ادا کرنے کے بعد تعبیر ٹیرس میں آگئی تھی رات بھر ہونے والی بارش کے بعد اب سب کچھ نکھرا نکھرا سا لگ رہا تھا وہ موسم سے لطف اندوز ہونے لگی۔

ایسا موسم تعبیر کی ہمیشہ سے کمزوری رہا ہے۔ موسم کی خوشگواریت نے اس کا موڈ بھی خوشگوار کر دیا تھا اس کا دل چاہا کہ اس موسم میں وہ یزدان کے ساتھ واک کرنے جائے کچھ سوچ کر وہ اندر آ گئی۔

دیکھا جو پراٹھے سے انصاف کرنے میں مصروف تھا۔

ناشتے کے بعد وہ برتن اٹھا کر باورچی خانے میں رکھنے گئی تو یزدان بھی ٹیبل پر رکھی پلیٹیں اٹھا کر اس کے پیچھے باورچی خانے میں لے آیا۔

یزدان کی یہ عادت تھی اگر گھر پر ہوتا تھا تعبیر کا ضرور ہاتھ بٹاتا تھا۔ تعبیر کو یزدان کی یہ عادت اچھی لگتی تھی۔

باورچی خانہ سمیٹ کر وہ گھر کی صفائی میں لگ گئی۔ کام سے فراغت کے بعد وہ کمرے میں آئی تو اس کی نظر سامنے قالین پر بیٹھی زیب پر پڑی جو لپ اسٹک ہاتھ میں لیے پورے منہ پر عجیب وغریب نقش ونگار بنائے حسینہ عالم بنی بیٹھی تھی۔ شاید اس نے یوٹیوب سے کوئی نیا میک اپ سیکھا تھا اب وہ اپنے کارنامے پر ماں کو داد طلب نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ اس کی اس حرکت پر تعبیر نے سر پیٹ لیا۔ جتنا وہ صفائی پسند تھی اتنا ہی اس کی بیٹی زیب اپنی تخریب کاریوں سے ماں کی ناک میں دم کیے رکھتی تھی۔

وہ اسے اٹھا کر ٹی وی لاؤنج میں لے آئی جہاں یزدان صوفے پر بیٹھا انہماک سے ٹی وی دیکھ رہا تھا تعبیر نزدیک ہی زیب کو قالین پر بٹھا کر خود بھی بیٹھ گئی اور ناول اٹھا کر پڑھنے لگی، میچ سے اسے خاص شغف نہیں تھا۔

"کھانا کیا بنایا ہے۔" ٹی وی پر نظر رکھے یزدان بیوی سے مخاطب ہوا۔

تعبیر کو ہمیشہ یہ میچ اپنی سوکن ہی لگتا تھا جس کے آگے یزدان کو کچھ نظر نہیں آتا تھا۔

"مٹر پلاؤ، ہانڈی، قورمہ، مٹن کڑھائی، شامی کباب، تکہ، ملائی بوٹی، میٹھے میں گلاب جامن، کھیر، شاہی ٹکڑے اور ہوم میڈ آئس کریم۔"

تعبیر کی فراٹے بھرتی زبان پر یزدان ٹی وی سے نظریں ہٹا کر اب آنکھیں پھاڑے اسے دیکھے جا رہا تھا۔ اسے لگ رہا تھا وہ غش کھا کر گر پڑے گا۔

"یہ سب ناول کی ہیروئن ندا نے بنایا ہے، میں نے تو ٹھنڈے سالن بنایا ہے۔" وہ دل ہی دل مسکراہٹ سے اس کی حیرت کا مزا لینے لگی جس پر وہ بیوی کو گھورتے ہوئے واپس میچ کی جانب متوجہ ہو گیا۔ تعبیر کھا جانے والی نظروں سے ٹی وی اسکرین پر اچھلتے کودتے کھلاڑیوں کو دیکھنے لگی جن کو محویت سے ان کا شوہر دیکھ رہا تھا۔

☆☆☆

وہ آج صبح سے کام میں لگی ہوئی تھی یزدان کے آفس والے لنچ پر آ رہے تھے۔ زیب کو وہ یزدان کے حوالے کر کے برق رفتاری سے سارے کام نمٹا رہی تھی۔

تعبیر کو خود پر ناول کی ہیروئن کا گمان ہوا جس نے بیک وقت میں مختلف اقسام کی ڈشز تیار کر لی تھیں۔ چاولوں پر دم لگانے کے بعد اس نے مطمئن انداز میں ہر چیز پر نظر ڈالی اور تیار ہونے کی غرض سے اپنے کمرے کی جانب بڑھ گئی۔

تھوڑی دیر بعد شاور لے کر باہر آئی تو یزدان کمرے میں زیب کے ساتھ بیڈ پر بیٹھا تھا۔

"اف! یزدان پلیز۔ زیب کا ہاتھ منہ دھلا دیں میں بس تیار ہو کر اس کے کپڑے چینج کرتی ہوں۔" تعبیر زیب کی حالت پر یزدان سے ملتجی انداز میں کہنے لگی جو چاکلیٹ کھا کم رہی تھی اور خود کو زیادہ گندا کر رہی تھی۔

یزدان زیب کا ہاتھ منہ دھلا کر آیا تعبیر تیار ہو چکی تھی۔

"میں کیسی لگ رہی ہوں؟" اس نے فوراً پوچھا۔

"تم بہت حسین لگ رہی ہو۔" یزدان کی تعریف پر تعبیر زبردستی کا شرمانے لگی۔

"چلو جی، بن گئیں میڈم ناول کی ہیروئن۔" وہ اسے شرمانے کی تیاری کرتا دیکھ کر زیر لب بولا۔

اس سے پہلے وہ کچھ بولتی ڈور بیل کی آواز پر یزدان دروازے کی جانب بڑھ گیا جہاں اس کے آفس کولیگز اور باس موجود تھے۔

یزدان کے باس اور کولیگز ڈرائنگ روم کو توصیفی نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ صاف ستھرا سجا سجایا ڈرائنگ روم ان کے باس اور وہاں باقی موجود لوگوں کو کافی پسند آیا تھا۔ وہ دل ہی دل میں تعبیر کے ذوق کو داد دے رہے تھے۔

تھوڑی دیر بعد تعبیر سر پر دوپٹا اوڑھے ڈرائنگ روم میں سلام کرنے آئی اور جاتے ہوئے یزدان کو اشارے سے آنے کو کہا۔

یزدان اٹھ کر اس کے پیچھے چلا گیا۔ ڈرائنگ روم سے منسلک ڈائننگ روم جس کے بیچ میں گلاس ڈور تھا۔ یزدان وہاں پر موجود ڈائننگ ٹیبل پر باورچی خانے سے آتی تعبیر کے ہاتھ سے کھانے کی ڈشز لے کر رکھنے لگا تھا اور ساتھ ہی بھاگتی زیب کو مضبوطی سے پکڑا ہوا تھا جو باپ کی گرفت سے فرار ہونے کے لیے بے قرار تھی۔ یہ سب منظر ڈرائنگ روم میں بیٹھے اشفاق صاحب جو یزدان کے آفس کولیگ تھے، بغور دیکھ رہے تھے۔

"آجایئے آپ لوگ۔" تھوڑی دیر بعد یزدان نے ان سب کو کھانے کی دعوت دی۔

ٹیبل پر موجود بریانی۔ کوفتے۔ کڑھائی اور تکے ساتھ میں سلاد اور رائتہ سے سب نے خوب انصاف کیا اور ساتھ ہی وہاں موجود ہر ہر فرد نے ہی تعبیر کے کھانے کی خوب تعریف کی تھی۔

☆☆☆

"ارے یزدان میاں! تمہاری بیگم صاحبہ تو تم سے بہت خوش رہتی ہوں گی" اگلے دن آفس میں لنچ کے دوران جب وہ اپنی سیٹ پر بیٹھا لنچ کر رہا تھا کہ اچانک اشفاق صاحب اس کے پاس آئے اور ہنستے ہوئے بولے۔

"جی کیا مطلب؟" یزدان ان کی بات پر نا سمجھی سے ان کو دیکھنے لگا۔

"بھائی، جس طرح سے تم بھاگ بھاگ کر بیگم کے ساتھ کام کر رہے تھے اس سے تو یہی لگتا ہے کہ بیگم کافی خوش رہتی ہوں گی۔"

ان کی بات پر وہ سادگی سے ہنس دیا۔

"بھائی، ہم سے نہیں ہوتے یہ کام ہم نے تو بیگم کو شروع دن سے ہی بول دیا تھا کہ ہم سے کوئی امید نہیں رکھنا۔" اشفاق صاحب کرسی پر بیٹھتے ہوئے مزید پھیلتے ہوئے بولے۔

"ارے اشفاق صاحب، آپ کو چاہیے جب گھر پر ہوں تو بیگم کا ہاتھ بٹا دیا کریں۔ اس میں کوئی مضائقہ نہیں، اور ویسے بھی اگر آپ کسی چیز میں ان کا ہاتھ بٹا دیں گے یا ذرا سا ان کی کسی چیز میں مدد کر دیں گے تو آپ کی بیگم بھی خوش ہو جائیں گی اور آپ سے کس نے کہا ہے کہ کھانے پکائیں، کپڑے دھوئیں، میں نے تو ہیلپ کا بولا ہے۔"

"ہم سے نہیں ہوتی یہ چاکری، ویسے بھی ہم مرد باہر مغز ماری کر کے جائیں اور پھر گھر جا کر کام میں جت جائیں! وہ یزدان کی بات کا جواب دیتے ہوئے بولے۔

یزدان ان کی بات پر ہنستے ہوئے اپنے کام میں لگ گیا۔

آفس سے واپسی پر یزدان کی گاڑی خراب ہونے کی وجہ سے اشفاق صاحب نے اسے گھر ڈراپ کیا۔ تو اس نے ان کو چائے پینے کی دعوت دی جس کو وہ خوشی قبول کرتے ہوئے اس کے ساتھ اس کے گھر چلے آئے۔

گھر میں داخل ہوتے ہی یزدان نے سامنے سے بھاگ کر آتی زیب کو گود میں اٹھا لیا جتنی دیر اشفاق صاحب بیٹھے رہے یزدان کو نجانے کیوں ان کی نظروں سے کوفت ہو رہی تھی وہ مستقل بھاگتی زیب کو پکڑ رہا تھا جس پر یزدان صاحب کی نظریں اسے تمسخر اڑاتے محسوس ہوئی تھیں۔

☆☆☆

اشفاق صاحب طبیعت کی خرابی کے باعث ایک ہفتے بعد آفس آئے سب ہی ان کی خیریت پوچھ رہے تھے۔ یزدان بھی ان کی خیریت پوچھی جس پر وہ فخریہ انداز میں یزدان سے کہنے لگے کہ اس بیماری

میں خوب بیگم سے خوب خدمتیں کروائیں۔ باتوں باتوں میں وہ اپنے مزاج کا بھی بتانے لگے کہ ان کا مزاج شروع سے کافی شاہانہ رہا ہے۔ پہلے اماں بہنوں نے ان کے خوب ناز نخرے اٹھائے پھر شادی کے بعد بیگم کو بھی صاف بول دیا کہ ان سے نہیں ہوگی کوئی زن مریدی کہ آفس میں کام بھی کریں گھر آکر بھی بچے بھی دیکھیں۔ یہ سارا عورت کا کام ہوتا ہے۔ بقول ان کے کہ ان عورتوں کا کیا ہے آپ تھوڑی ان کی ہیلپ کرو تو وہ آہستہ آہستہ سب ہی ذمے داریاں آپ پر ڈالنا شروع ہو جاتی ہیں۔

جس پر یزدان کافی جزبز سا ہو رہا تھا اسے لگا وہ اسے سنا رہے ہیں۔

☆☆☆

رات کھانے سے فراغت کے بعد یزدان بیڈ پر نیم دراز ٹی وی دیکھ رہا تھا کہ تھوڑی دیر بعد تعبیر بھی باورچی خانہ سمیٹ کر کمرے میں آگئی۔

"یزدان! میں ذرا کلیئرنگ کرلوں آپ زیب کو دیکھ لیں گے؟" وہ اس کے پاس زیب کو بٹھاتے ہوئے بولی۔

"بات سنو، تمہیں نظر نہیں آتا میں آفس سے تھکا ہوا آیا ہوں۔ ایک بچہ نہیں سنبھلتا تم سے، حد ہوتی ہے پکڑواسے مجھے آرام کرنے دو۔"

یزدان کے تلخ انداز پر تعبیر ٹک ٹک یزدان کی شکل دیکھنے لگی۔ اس نے کبھی ایسے تعبیر سے بات نہیں کی تھی وہ خاموشی سے زیب کو گود میں لے کر دوسرے کمرے میں چلی گئی۔

تعبیر منتظر رہی یزدان کو اپنی رویے کی بدصورتی کا احساس ہوگا مگر ایسا نہیں ہوا۔ وہ یزدان جو اتنی سی باتوں پر اس کی پروا کیا کرتا تھا اب اس کو بات بے بات جھڑکنے لگا تھا۔ چھٹی والے دن جب وہ گھر پر ہوتا تھا اگر تعبیر کسی کام کا بول بھی دیتی تو اب اس کے تیور ہی الگ ہوتے تھے۔

وہ جو اتنے تفاخر سے بولا کرتی تھی کہ میرا شوہر اور دوسرے مردوں کی طرح نہیں ہے جو بیوی کا ہاتھ بتانے میں شرم محسوس کرے بلکہ اس کا یزدان تو بہت احساس والا ہے۔ مگر اب وہ اس یزدان سے یکسر مختلف تھا۔

کہیں یزدان کی زندگی میں کوئی دوسری لڑکی تو نہیں آگئی، تعبیر پریشانی سے سوچنے لگی۔ کیوں کہ اس نے زیادہ تر ناولز میں یہی پڑھا تھا۔

رات یزدان اپنے کمرے میں لیپ ٹاپ پر کام کر رہا تھا کہ تعبیر کمرے کا دروازہ زور سے کھول کر آندھی طوفان کی مانند اندر چلی آئی۔

"آپ کو کیا لگتا ہے یزدان صاحب، آپ جو یہ آج کل کر رہے ہیں مجھے اور زیب کو نظر انداز کر کے اور آپ کا جو رویہ ہمارے ساتھ ہے، میں سب سمجھ رہی ہوں۔ میں کسی اور چڑیل کو آپ کی زندگی میں نہیں آنے دوں گی۔"

یزدان حیرت سے منہ کھولے اس کو دیکھنے لگا جو کمر پر ہاتھ رکھے سلطان راہی بنی کھڑی شعلہ بار نظروں سے اسے گھور رہی تھی۔

اس سے پہلے وہ کچھ بولتا وہ جھٹکے سے پلٹ گئی۔

"میڈم نے پڑھا ہوگا کوئی جذباتی ناول جس کی ہیروئن جنگجو قبیلے سے تعلق رکھتی ہوگی۔"

وہ کندھے جھٹک کر کام میں لگ گیا۔

☆☆☆

آج آفس سے وہ گھر جانے کے لیے اٹھنے لگا تھا کہ اس کی نظر اپنی ٹیبل پر پڑی جہاں پر اشفاق صاحب کی فائل پڑی تھی۔ وہ گھر جانے سے پہلے اس سے کوئی بات کرنے آئے تھے اور وہیں اپنی فائل بھول گئے تھے۔ وہ ان کی فائل اٹھا کر آفس سے باہر نکل گیا۔

یزدان نے اپنی گاڑی اشفاق صاحب کے گھر کی طرف موڑ دی کیونکہ کل پرسوں آف تھا ورنہ وہ ان کو اگلے دن دے دیتا۔

وہ ان کی بلڈنگ میں داخل ہوا، فرسٹ فلور پر ان کا فلیٹ تھا۔ فلیٹ کا دروازہ کھلا ہوا تھا مگر اس نے

گھنٹی بجانا زیادہ مناسب سمجھا اس سے پہلے کہ وہ گھنٹی بجاتا اندر سے ایک عورت کے چیخنے کی آواز پر وہ ٹھٹک گیا۔

"کام چور ہی رہنا تم، کوئی کام ڈھنگ سے نہیں آتا۔" اندر سے کوئی عورت چیخ کر بول رہی تھی۔

یزدان سمجھا اشفاق صاحب کی بیگم نوکر پر چلا رہی ہیں مگر ان کے اگلے جملے پر یزدان اچھل کر رہ گیا۔

"ارے اشفاق، ادھر آؤ اور بچوں کو دیکھو سر میں درد ہو رہا ہے۔"

"جی آ گیا۔" بیگم اشفاق صاحب کی آواز آئی مگر وہ آواز اس آواز سے کافی الگ تھی جو وہ آفس میں سنتا تھا۔

یزدان تھوڑا سا آگے ہو کر دروازے سے اندر کا منظر دیکھنے لگا وہ جانتا تھا کہ یہ غیر اخلاقی حرکت ہے۔ اشفاق صاحب اپنی بیوی کے سامنے ایسے کھڑے تھے جیسے کوئی نالائق بچہ غلطی کے بعد استاد کے سامنے کھڑا ہو۔

"تم نے کچھ زندگی میں کیا بھی ہے، نکھٹو ہی رہنا۔ یہ گھر، گاڑی سب میرے باپ کی مرہون منت ہے۔ حتیٰ کہ یہ جو جاب تم کر رہے ہو یہ تک میرے باپ نے تم کو دلوائی ہے ورنہ تو تم اس ہی غربت میں ہی پڑے رہتے۔ وہ تو تم کو میرے باپ نے اس غریبی سے نکال لیا۔ شکر کرو، میرا اور میرے باپ کا احسان مانو۔ اب کھڑے کیا ہو جاؤ بچوں کو دیکھو۔"

استانی صاحبہ اپنا لیکچر ختم کر چکی تھیں یزدان سے مزید وہاں کھڑا نہیں ہوا گیا۔ وہ فائل دیے بنا واپس آ گیا۔

گھر آنے کے بعد متلاشی نظروں سے تعبیر اور زیب کو دیکھنے لگا وہ دونوں بیڈروم میں تھیں وہ بیڈ پر سوئی زیب کو پیار کر کے تعبیر کو دیکھنے لگا جو ناول پڑھ رہی تھی، یزدان کو دیکھ کر وہ منہ بنا کر کھڑی ہو گئی۔

یزدان کو اس کے انداز پر ہنسی آ گئی۔

"ویسے تم نے کیا کہا تھا میں کوئی دوسری چڑیل نہیں آنے دوں گی یعنی تم مانتی ہو کہ تم بھی چڑیل ہو؟"

وہ شرارت سے کہتے ہوئے اس کے پاس آ گیا۔

"اچھا سوری!" وہ اس کے کان کے قریب دھیرے سے سرگوشی میں بولتے ہوئے اس کے ہاتھوں میں گجرے پہنانے لگا۔

"مجھے کوئی بات نہیں کرنی۔" وہ اپنا ہاتھ کھینچتے ہوئے نروٹھے پن سے بولی۔

"تم سے کس نے کہا میں کسی اور میں دلچسپی لینے لگا ہوں یار، میری جان کو تو ایک ہی بہت ہے۔"

اس کی بات پر تعبیر گھور کر اسے دیکھنے لگی۔

"بس کچھ دنوں سے آفس کا کام زیادہ تھا اس لیے تم پر تھوڑا غصہ ہو گیا معاف کر دو نا۔" وہ اسے اپنے قریب کرتے ہوئے بولا جس پر تعبیر مسکرا کر بچوں کی طرح اس کے سینے سے لگ گئی۔ اسے اپنی بیوی کی سادگی پر بے اختیار پیار آیا۔

"میں بھی کتنا احمق تھا جو اشفاق صاحب جیسے لوگوں کی باتوں میں آ کر اپنی بیوی کا دل اور گھر خراب کرنے چلا تھا۔

کاش! کوئی بتائے اشفاق صاحب کو کہ جو آپ کر رہے ہیں وہ حقیقت میں زن مریدی ہے اور میں جو کر رہا ہوں وہ محبت ہے کیونکہ ہمارے پیارے نبی پاک صلی اللہ علیہ والہ وسلم بھی اپنی ازدواج مطہرات کا ہاتھ بٹایا کرتے تھے اور مرد کا عورت کے ساتھ گھر میں چھوٹے موٹے کاموں میں ہاتھ بٹانا زن مریدی نہیں۔ ہمارے پیارے نبی پاک صلی اللہ علیہ والہ وسلم کی سنت ہے اور عورت سے محبت کا اظہار ہے۔"

یزدان تعبیر کا محبت سے ماتھا چومتے ہوئے سوچنے لگا۔

☆☆

کشف بلوچ
گھاؤ

زہرہ کو لگتا جیسے وہ اپنے دور کی انار کلی ہو جس کو جینے کے جرم میں جسم کی دیوار میں زندہ چنوا دیا گیا۔

سرخ اینٹوں والے آنگن میں گول تھڑے پر ایستادہ ٹاہلی کے درخت کے چرمرائے ہوئے پتے جا بجا بکھرے دیکھ کر اس کو کوفت سی ہوئی۔

غصے سے تلملاتی، زہرہ جوتی گھسیٹ کر باورچی خانے کے چولہے کے پاس دھری ماچس کی ڈبیا اٹھا لائی اور ڈھیری کو آگ لگا دی۔

دیکھتے ہی دیکھتے خشک پتوں نے آگ پکڑی۔

کڑوا کسیلا دھواں اس کے نتھنوں میں جا گھسا۔ پتے جیسے احتجاجاً دھواں چھوڑنے لگے۔

زہرہ کو لگا جیسے کسی نے اس کی آنکھوں میں مرچوں کا سفوف ڈال دیا ہو وہ آنکھوں کو پونچھتی بے تحاشا کھانستی ہوئی برآمدے کی طرف بھاگی۔

''کیا ہوا بیٹی زہرہ؟''

اندر سے کسی وجود کے اٹھنے پر چار پائی کے احتجاجی آواز میں چیخنے، چپل گھسٹنے اور پھر کسی بوڑھی عورت کی آواز سنائی دی۔ آواز قدرے بھاری مگر لہجے میں نرماہٹ گھلی تھی۔

''کچھ نہیں اماں! بس ذرا سا دھواں آنکھوں میں چلا گیا۔''

زہرہ نے کھانسی کے مختصر وقفے میں اونچی آواز میں جواب دیا اور پھر کھانسنے لگی۔

برسوں نفرت، غصہ، کینہ اور جلن جیسے زہریلے دھویں سے اٹا رہنے والا وجود کیسے بیرونی دھوئیں کے آگے پسپائی اختیار کر لیتا ہے۔

کھانستے ہوئے زہرہ نے برآمدے کی دیوار پر ٹنگے آئینے میں اپنی سرخ آنکھیں دیکھ کر سوچا اور بائیں کان پر نظر پڑتے ہی افسردہ ہو گئی۔ ایک کان میں بالی اور دوسرے کان کے سوراخ کو خالی دیکھ کر دل جیسے قلق سے بھر گیا۔

منجھلی آپا کے سسرالی رشتہ داروں کی شادی اسے اتنی مہنگی پڑ جائے گی زہرہ نے سوچا نہ تھا۔

''جانے کہاں گر گئی تھی؟''

تصور کی آنکھ سے اس نے وہ ہر کونا چھان مارا جہاں جہاں اسے منجھلی آپا اپنے سسرالی رشتہ داروں سے ملوانے زبردستی لیے پھرتی رہیں۔ ورنہ وہ تو ایسی تھی کہ جس کونے میں بیٹھی وہیں سے اٹھتی۔

چاہے آنکھیں ایک ہی منظر دیکھ دیکھ کر پتھرا جاتیں یا پھر گردن کے مہرے دکھنے لگتے۔

''ناشتا تیار ہے تو لے آ زہرہ بیٹی، پھر حاجی صاحب کی بیٹی کی شادی کے جوڑے کی سلائی بھی مکمل کرنی ہے۔'' عقب سے ماں کی آواز سن کر زہرہ نے کانوں کو دوپٹے سے اچھی طرح ڈھانپ لیا۔ اگر وہ خالی کان دیکھ لیتیں تو پھر سے وہی بحث چھڑ جاتی۔

''میں جب تیری عمر کی تھی تو شادی سے واپسی پر گھر آ کر فوراً بتا دیتی کہ شادی والے گھر میں کس نے کیا کیا پہنا اور کیا کچھ کھایا تھا۔ اور ایک تم ہو کہ اپنی آنکھ کے پچھواڑے اگلی بالی کو گم کر بیٹھیں۔''

سست قدموں سے باورچی خانے کی طرف بڑھتی زہرہ کو معلوم تھا ماں کا سوالیہ جملہ کلی کرنے، ہاتھوں سے کنگھی کر کے بال سنوارنے اور گھر کے سارے بلب بجھانے کے بعد مکمل ہو گا۔ یقیناً وہ تب تک ناشتے کی ٹرے سجا چکی ہو گی۔

☆☆☆

ماں جو میکے میں نوٹ خرچ خرچ کر تھک جاتیں مگر وہ ختم نہ ہوتے اور سسرال میں انہی نوٹوں کو کما کما کر ان کی کمر دہری ہو گئی تھی۔ مگر اس غریبی میں بھی وہ بلا کی صابر و شاکر رہیں۔ رات رات بھر لوگوں کے کپڑے سی کر بھی ان کا لہجہ شیریں، زبان پر تشکر کے کلمات جاری رہتے۔

زہرہ جانتی تھی ابا کو مرتے دم تک گاڑھے بلغم نے گھڑی بھر سانس نہ لینے دیا۔ ان کے لفظوں کو کھانسی نے چاٹ لیا۔ وہ گفتگو کے دوران اتنی بار تھوکنے جاتے کہ رفتہ رفتہ لوگوں نے ان سے بول چال مختصر کر دی۔ لوگوں کو لگتا دوران گفتگو وہ بار بار

اٹھ کر ان کی باتوں کو تھوک آتے ہیں۔
اور آخر کار اسی مرض نے ایسی وفا کی کہ خون تھوکتے تھوکتے مار گئے۔ ان کے مرنے کے کئی دنوں بعد تک زہرہ نے آنگن کو رگڑ رگڑ کر صاف کیا مگر خون کے دھبے معدوم نہ ہوئے۔
"بتا تو زہرہ! شادی میں دلہن نے کیا پہنا تھا؟"
قمیص کی ترپائی کرتی زہرہ نے ماں کی آواز پر سر اٹھا کر دیکھا اور دانتوں سے دھاگا توڑ کر انہیں جواب دیا۔
"کپڑے......" کسی بھی تقریب سے واپسی پر اگر کوئی یہ سوال پوچھتا تو اس کا من یہی جواب دینے کو کرتا مگر شاید وہ چپ رہتی کیونکہ ایسے منہ پھٹ جواب اسے زیب نہیں دیتے۔
زہرہ کو پچیسواں سن جونہی لگا۔ اس کے مزاج کے رنگوں کو ایک گہری اداسی نے ڈھانپ لیا۔ لبوں کے کناروں پر ہمہ وقت بہتی ہنسی جیسے اب بے وجہ کی اداسی کے سرمئی غبار میں چھپ گئی۔ من کے اندر خوشی کے کنویں خشک ہونے لگے۔ مسکرانے کا دورانیہ دنوں سے ہفتوں پر محیط ہو گیا۔ وہ محفلوں سے خار کھانے لگی۔ بے تحاشا شور و غل پر جیسے اس کا دل بیٹھ سا جاتا۔
اب وہ ماں کو کیا بتاتی کہ اس نے تو دلہن کو آنکھ بھر کر بھی نہیں دیکھا۔ وہ اب دیکھتی بھی نہیں تھی کسی خوشی کی طرف کیونکہ اس کی چند سہیلیاں جن کی شادی خوش قسمتی سے جلدی ہو گئی تھی اس سے اکثر کہتیں۔
"پکی عمر کی کنواری کی نظر بہت حسرت بھری ہوتی ہے۔ جس پر پڑ جائے سمجھو وہ تو خاک ہوئی۔"
"ہاں سچ زہرہ! میں نے تو سنا تیری منجھلی آپا کے سسرالی بڑے جدید لوگ ہیں۔ شادی میں مرد و زن کی تفریق نہیں تھی؟"
ماں نے ناک پر انگلی رکھ کر یوں کہا جیسے منجھلی آپا کو کل ہی تو بیاہا تھا۔

زہرہ "ہوں" کہتی اٹھ کھڑی ہوئی۔
ناشتے کے جھوٹے برتن دھو کر اس نے لگے ہاتھوں دوپہر کے لیے چنے کی دال بھگو کر رکھی اور واپس آ کر ادھوری ترپائی مکمل کرنے لگی۔
آنکھیں خواب بنتے بنتے تھکتی نہیں ہیں اور انگلیاں خوابوں کے ریشمی تھان کو لپیٹتے لپیٹتے شل ہو گئیں۔
رات بھر کی خوابیدہ آنکھوں کی پتلیاں حقیقت کی دھوپ سے جھلتی ہیں۔

☆☆☆

زہرہ خزاں میں بولائی بولائی پھرتی اور بہار کے دن گھر کے کونوں کھدروں میں گزار دیتی۔ کبھی وقت رینگ رینگ کر گزرتا اور کبھی یوں سرکتا کہ جیسے بند مٹھی میں ریت۔
بڑی آپا کے پہلوٹھی کے زبیر نے نویں پاس کرلی۔ تو منجھلی کے ہاں بیٹا ہوا۔ چھوٹی سال بھر سسرال میں گزار کے میکے میں پہلے بچے کی رسم کرنے آ گئی۔ پڑوسن سہیلی کا چوتھا مہینہ شروع تھا۔ ماں کے پاس بڑی کوٹھی والی بیگم صاحبہ کے درجنوں جوڑوں کا آرڈر آ گیا۔ مگر زہرہ کی زندگی میں ٹھہرے وہی بے زار سے شب و روز۔
کائنات کے ہر ذرے کی زندگی متحرک، ایک بس ٹھہر گئی تو زہرہ کی زندگی۔
ایف اے مکمل کیا ہی تھا کہ ابا چل بسے۔ اب بھلا بے چاری معمولی سی درزن کالجوں کے خرچ کہاں سے اٹھاتی۔
سو زہرہ نے حالات اور قسمت کے بخیے ادھیڑنے کے بجائے سلائی مشین آگے دھر لی۔
وہ بڑے انہماک سے سلائی کا کام کرتی مگر بیچ میں آ جانے والے سرخ جوڑے اسے اپنے ارمانوں کے لہو سے رنگے نظر آتے۔ سرخ جوڑے سے جھانکتی سرشاری جیسے اس کا منہ چڑاتی اور وہ جوڑا اماں کی طرف پھینک کر سادہ دوپٹے کی پائپنگ کرنے لگ جاتی۔

انہی ہزاریوں کے دنوں میں منجھلی آپا کے آنے کی خبر ملی۔ جسے سن کر اماں یک دم بوکھلا سی گئیں۔ آپا بیٹے کی پیدائش کے بعد پہلی بار میکے آ رہی تھیں۔ تین بیٹیوں کے بعد پہلا بیٹا اماں کا بوکھلانا تو بنتا تھا۔ اماں نے پچھلے دنوں ٹپکتی چھتوں اور بیرونی دیوار کو پلستر کروایا تھا۔ اسی پر اچھا خاصا خرچ اٹھ گیا۔

یہ کام بھی ان دونوں نے ڈبل سلائی کر کے مکمل کروایا۔

اگرچہ نواسے تو پہلے سے موجود تھے۔ مگر انہیں کیسے خالی ہاتھ لوٹاتیں وہ۔ اب بڑا خرچ بھی نہ ہو تب بھی نواسے کے انگوٹھی کے لیے بھی پانچ ہزار تو درکار تھے۔ بیٹی کے سسرال والے کیا کہیں گے یہی سوچ کر اماں بڑے آرڈر کو انکار کرتے کرتے رک سی گئیں۔

زہرہ بڑے سے گٹر کو دیکھ کر پریشان ہو گئی۔ ایک طرف منجھلی آپا کی آنے سے پہلے ان کی فرمائشی فہرست پہنچ گئی تھی اور دوسری جانب ان کی تین عدد شرارتی بچیاں جو نانی کے ہاں آتے ہی گھر کا وہ حشر کرتیں کہ وہ چکرائی سی ان کے پیچھے پھرتی رہتی۔

اب بھی ان کے آنے سے پہلے اسے صحن میں رکھے گملوں کو چھت پر چھپانا تھا۔ کیاری میں لگے چنبیلی کے پودے کے گرد سرکنڈوں کی باڑھ لگانی تھی۔ کمروں میں موجود کئی آرائشی اشیاء ان کی پہنچ سے دور رکھنے کے لیے الماری میں رکھنی تھیں۔

زہرہ کو بچپن کی وہ گڑیا اچھی طرح یاد تھی جو ابا کسی میلے سے واپسی پر اس کے لیے آئے تھے۔ وہ گڑیا جس کی لانبی سیاہ پلکیں اور نیلی آنکھیں تھیں اور جس کے گھٹنوں کو چھوتے فراک پر سنہری ستاروں کی بیل کاڑھی ہوئی تھی۔ وہی گڑیا جسے اس کی سہیلی نے اپنے لمبی لمبی ٹانگوں والے گڈے کے لیے اسی روز مانگ لیا۔ مگر چند روز بعد ہی اسی گڈے کی بائیں ٹانگ اس کی چھوٹی بہن نے قینچی سے کاٹ لی اور وہ بھاگم بھاگ زہرہ کو بتانے آئی مگر زہرہ نے تو لنگڑے گڈے پر نظر پڑتے ہی اپنی گڑیا دوپٹے میں چھپالی۔

زہرہ نے گڑیا کئی سالوں تک کسی خوبرو شہزادے کے انتظار میں الماری کے اوپری حصے میں رکھے ایک باکس میں رکھ چھوڑی۔ منجھلی آپا کے پچھلے دورے میں نہ جانے کس ضرورت کے تحت وہ باکس نیچے اترا اور وہ گڑیا ان کی شرارتی بچیوں کے ہاتھ لگ گئی۔ زہرہ کو جب تک خبر ہوئی وہ اس کے گھنگریالے بالوں پر قینچی پھیر چکی تھیں۔ اور تو اور اس کے سر کا پچھلا حصہ کاٹ کر یہ دیکھنے کی کوشش بھی کی گئی کہ یہ خود بخود پلکیں کیسے اٹھا اور گرا لیتی ہے۔ زہرہ کئی روز تک گڑیا کا غصہ خواہ مخواہ روٹھ کر اتارتی رہی۔

منجھلی آپا کے آتے ہی زہرہ کا ایک پیر باورچی خانے میں تو دوسرا صحن میں ہوتا جہاں بچیوں نے بیری کے درخت پر دھاوا بول دیا تھا۔ بچیاں کچے بیر اتار کر جھولی بھر بھر کھاتیں اور رات کو کھانس کھانس کر سب کی نیند خراب کر دیتیں۔ یوں زہرہ کی رات جوشاندہ بنانے میں گزر جاتی۔

"کئی دنوں سے من چٹ پٹی بریانی کھانے کو چاہ رہا ہے تھا۔ سن زہرہ آج بنا لے اور ہاں بچوں کے لیے کھیر بنا لینا خوش ہو جائیں گے۔"

گوٹے کناری لگے دھانی دوپٹے سے نبرد آزما ہوتی زہرہ نے بہن کی چہکتی ہوئی آواز میں فرمائش سنی۔ سوئی میں دھاگا ڈالتے ہوئے ٹاہلی پر شور مچاتی چڑیوں کو دیکھا جو اپنے آشیانے کو واپس لوٹ رہی تھیں۔

اماں کے چہرے پر ثبت زبردستی والی مسکراہٹ دیکھ کر وہ بادل ناخواستہ اٹھ کھڑی ہوئی۔

اماں نے ایڈوانس پکڑ کر نواسے کی انگوٹھی بننے کے لیے دے دی۔ اب یہ آئے روز کے فرمائشی پروگرام۔ زہرہ نے پیاز کترتے ہوئے کھڑکی کے پار اماں کے گھٹنے سے لگی آپا کو دیکھا جو بات کرتے ہوئے تقریباً ان کے کان میں گھسی چلی جا رہی تھیں۔

☆☆☆

دوسری صبح جب زہرہ میلے کپڑوں کے ڈھیر کے پاس کھڑی یہ سوچ رہی تھی کہ پہلے مشین لگائے یا پھر پائے گلنے کے لیے چولہے پر چڑھا دے۔

تبھی اماں پاس آ کر خاموشی سے بیٹھ گئیں۔

کل اماں نے سنارے انگوٹھی لینے جانا تھا۔ آپا کو پتا چلا تو ان کی تو باچھیں خوشی سے کھل اٹھیں۔

انہیں بچیوں کے چند جوڑے خریدنے تھے وہ بھی ساتھ ہی چل پڑیں۔ ان کے واپس آنے تک بچیوں نے زہرہ کو تگنی کا ناچ نچا دیا۔ خدا خدا کر کے شام ڈھلی اور آپا لدی پھندی آن پہنچی۔ شاپر میں سے فوراً پائے نکال کر زہرہ کے حوالے کیے کہ چڑھا دو رات تک بن جائیں گے۔

مگر اس کے بتانے پر کہ وہ سالن پکا چکی ہے جھٹ پیز انکال کر یہ کہہ کر اندر چلی گئیں کہ چلو پھر ہماری روٹیاں مت ڈالنا۔

''مت پوچھ زہرہ کیسی بکی ہوئی جب بچیوں کے چند جوڑے دس جوڑوں تک پہنچ گئے اور اوپر سے سارے ریڈی میڈ۔ وہ تو شکر ہے سنار جان پہچان کا تھا۔ بے چارے نے انگوٹھی یہ کہہ کر ساتھ کر دی کہ خیر ہے خالہ جب چاہیں پیسے دے جائیں۔''

اماں کی ٹانگیں دباتے ہوئے زہرہ سوچتی رہی نہ جانے شادی کے بعد بیٹیاں اتنی بے حس کیوں ہو جاتی ہیں۔ یہ وہی آپا تھیں جو خود سے چار سال بڑی بہن کو سناتیں کہ سسرال میں تو تم میاں کی کمائی دانتوں سے پکڑ پکڑ کر خرچ کرتی ہو اور میکے میں ابا کی کمائی دونوں ہاتھوں سے لٹا دیتی ہو۔

رات کے آخری پہر جاگتی ماں کو انگلیوں پر حساب کتاب کرتا دیکھ کر اس کا من بھیگ گیا تھا۔

اب بھی اماں کو ٹاہلی کے درخت کے نیچے افسردہ بیٹھا دیکھ کر ''خیر ہے اماں پھر بڑا آرڈر لے آنا۔''

کہنے ہی لگی تھی کہ وہ بول اٹھیں۔

''تیری آپا کے سسرالی رشتہ داروں نے تجھے شادی میں دیکھا تھا۔ رشتہ ڈالنا چاہ رہے ہیں۔ مگر میں سوچ رہی ہوں زہرہ ہاتھ میں روپیہ ٹکہ نہیں کیسے مہمانوں کو بلالوں۔''

اماں کی بات سن کر وہ ساکت رہ گئی۔

''تو کہے تو سامنے والے نواب صاحب کے......''

وہ ہچکچائیں اور بات ادھوری چھوڑ کر ٹوکری میں پڑے میلے دوپٹوں کو بے وجہ ہاتھ سے جھاڑنے لگیں۔

اتنا مشکل ہوتا ہے نا آواز پر لرزش طاری نہ ہونے دینا، آنکھیں سے چھلک جانے کو بے تاب آنسوؤں کو پیچھے دھکیل دینا اور بھرم ٹوٹنے کے ڈر سے دل کا کانپنا مگر نظریں کسی منظر پر ٹکا کر بظاہر کندھے اچکا کر انجان بننا۔

زہرہ نے ماں کے گلے میں بازو ڈال کر سر اثبات میں ہلا دیا۔ اماں کے رکے ہوئے آنسو اس کی پشت پر بکھرے بالوں میں گم ہو گئے۔

باہر کے سارے منظر اندر کے موسموں سے جڑے ہوتے ہیں۔

بھنڈیاں کاٹتی زہرہ کے سامنے برآمدے کا منظر جیسے یکا یک بدل سا گیا۔ چلچلاتی ہوئی دھوپ یکلخت نرم میٹھی میٹھی سی دھوپ میں تبدیل ہو گئی۔ درختوں پر کوئی کوئل کی آوازیں اب سماعتوں پر گراں نہیں گزرتیں۔ اور نہ ہی کھلکھلاتے لہجے طبیعت کو بوجھل کر دیتے۔

ان کے آنگن میں چند نئے پودوں کا اضافہ ہو گیا۔ اب بھی کبھار زہرہ کیاریوں میں لگے پودوں کو نہلاتے وقت دھیما دھیما سا گنگنا لیتی۔

اگرچہ پچھلے دنوں آپا کے سسرالی مہمانوں کی آؤ بھگت میں زہرہ کو خاصا تھکا دیا تھا مگر اس کے باوجود اس کا وجود ہلکا پھلکا سا تھا۔

آپا کمروں میں بکھرے سامان کو سمیٹ کر پیکنگ میں مصروف تھیں۔ بچیاں اپنے ابو کے ساتھ باہر آئسکریم کھانے گئی تھیں۔ جبکہ اماں بظاہر تھیں تو آپا کے ساتھ مگر کمرے میں فقط آپا کی اونچی آواز میں کہی باتیں گونج رہی تھیں۔

وہ زہرہ کے سسرال والوں کی شان میں قصیدے پڑھ رہی تھیں۔ کہ کیسے وہ پہلی ملاقات میں اماں کے لیے جارجٹ کا ہلکی کڑھائی والا سوٹ لائے اور جاتے وقت زہرہ کے ہاتھ پر ہزار ہزار والے چار نوٹ رکھ کر گئیں۔

باہر برآمدے میں بیٹھی زہرہ کے چہرے پر دبی دبی سی مسکراہٹ تھی۔

''لاہور کے بڑے مشہور بازار میں اس کی سب سے بڑی دکان ہے۔ اچھا خاصا چلتا کاروبار ہے اسحاق کا۔ اس روز شادی میں اس نے خود تمہیں دیکھ کر پسند کیا تھا۔''

کچھ دیر بعد ہی آپا اس کے ساتھ آ کر بیٹھ گئیں۔ ''مگر تم نے کہاں دیکھا ہوگا اسے۔ وہ بتا رہا کہ آپ کی بہن اپنی سوچوں میں اس قدر گم تھی کہ اسے تو اپنے کان کی بالی گرنے کا بھی پتا نہیں چلا۔''

آپا ہنس ہنس کر اسے بتا رہی تھیں اور وہ سر جھکائے سنے جا رہی تھی۔ ''وہ بے چارہ کئی دنوں تک میرے گھر کے چکر کاٹتا رہا۔''

آپا نے زہرہ کی تھوڑی اوپر کر کے اس کی آنکھوں میں جھانک کر کہا تو وہ شرما گئی۔

''اچھا سن اماں کہہ رہی تھیں کہ زہرہ لڑکے کو ایک نظر دیکھ لے سو میں نے تمہارے بھائی جان سے کہا کہ آتے وقت اسحاق کی نئی تصویر لیتے آیئے گا۔''

آپا نے اٹھتے ہوئے کہا۔ تو زہرہ بھی بھنڈیاں کاٹ کر ٹرے میں رکھ کر ہاتھ دھونے کے لیے نل کی طرف بڑھی۔ تبھی آپا نے اس کے کان میں سرگوشی کی۔

''پیلا لفافہ تمہاری دراز میں رکھا ہے۔''

زہرہ ابھی بھنڈیوں کی بھنائی میں مصروف تھی کہ آنگن بچیوں کی ہنسی سے گونج اٹھا۔

سرِ شام برسنے والی پھوار نے رات گئے موسلا دھار بارش کی شکل اختیار کر لی۔

اماں سوتی جاگتی کیفیت میں تھیں۔ جبکہ زہرہ کی آنکھیں ادھ کھلے دروازے سے نظر آتی بارش پر مرکوز تھیں۔ برآمدے سے لے کر آنگن تک جل تھل کا سماں تھا۔ اور شاید اس کے اندر بھی۔

وہ اٹھ کر آئینے کے سامنے جا کھڑی ہوئی اور اپنے سراپے پر طائرانہ نظر ڈال کر اوپری دراز کو کھول کر تصویر نکال لی۔

موٹے موٹے نقوش والا درمیانی قد کاٹھ کا پکی عمر والا مرد کیمرے کی طرف دیکھ کر مسکرا رہا تھا۔

کسی زمانے شاید رنگت سانولی سی ہو مگر اب تو عمر کی دھوپ میں رنگت بالکل سیاہ ہو چکی تھی۔

مکمل گنج پن تو نہیں تھا مگر سر کے اگلے حصے سے بال اڑے ہوئے تھے۔ اور کنپٹیوں کے پاس کہیں کہیں سے جھانکتی سفیدی بیتی جوانی کے گزرے سالوں کی جیسے چغلی کھا رہی تھی۔

زہرہ نے کوئی تیسویں بار تصویر کا تنقیدی جائزہ لیا اور پھر بے دلی سے واپس دراز میں رکھ دی۔

پلٹتے ہوئے اس کی نظر دراز میں موجود کان کی بالی پر اٹک سی گئی۔

''لڑکیوں کو خواب اوقات میں رہ کر دیکھنے چاہیے۔ زمانہ شناس نظریں سونے اور پیتل کا بھاؤ اچھی طرح جانتی ہیں۔''

زہرہ پیتل کی بالی کو مٹھی میں بھینچے بستر پر آ بیٹھی۔

کافی دیر بازو گھٹنوں کے گرد باندھے وہ خالی دیوار کو گھورتے ہوئے کچھ سوچتی گئی۔

نہ جانے وہ جب بھی رشتے سے انکار کا سوچتی اس کے سامنے وہ لنگڑا گڈا اور آپا کی بچیوں کے ہاتھوں اپنی گڑیا کا حالت یاد آ جاتی۔

بالآخر رات کے آخری پہر وہ اندر اور باہر کی جل تھل سے بے فکر ہو کر ایک فیصلہ کر کے مطمئن سی سو گئی۔

☆☆

مریم شہزاد

واپسی

"و من نعمرہ ننکسہ فی الخلق"

"اور ہم جس شخص کو لمبی عمر دیتے ہیں، اسے تخلیقی اعتبار سے الٹ ہی دیتے ہیں۔"

سورہ یٰسین کی اس آیت پر پہنچ کر وہ جیسے رک سے گئے انہوں نے ایک بار پھر اس آیت کی تلاوت کی پھر ترجمہ پڑھا۔

"پھر ہم اس کو تخلیقی اعتبار سے الٹ ہی دیتے ہیں، پھر کیا تم عقل نہیں رکھتے۔" ان کا دل دھک سے رہ گیا۔

"کیا عمدہ بات لکھی ہے، واہ میرے اللہ واہ، تو ہی ہے اس قابل، تو ہی جانتا ہے کہ انسان کہاں سے کہاں پہنچتا ہے اور پھر واپس وہیں پہنچ جاتا ہے جہاں سے چلا تھا۔ بے شک یا اللہ، بے شک یہ تو ہی سب زیادہ جاننے والا ہے۔"

انہوں نے خود کلامی کی اور بھیگی آنکھوں کے ساتھ سورہ یٰسین مکمل کی اور قرآن پاک کو چوم کر کچھ دیر سینے سے لگائے رکھا پھر بہت احترام سے اوپر شیلف میں رکھ دیا اور واپس آ کر اپنی آرام کرسی پر بیٹھ کر سر کرسی کی پشت سے ٹکالیا اور آنکھیں بند کر کے اس آیت پر غور کرنے لگے۔

کہاں سے زندگی شروع ہوئی تھی اور اب ساٹھ سال کا ہو گیا ہوں، بچپن، اسکول کی زندگی تو سب اب خواب لگتی ہے، اگر شادی کے بعد بھی شروع کروں تو کہاں ہم دونے زندگی کا سفر ساتھ شروع کیا، کیا خوب صورت دن تھے۔

شروع شادی کے دن یاد کر کے ان کے چہرے پر مسکراہٹ آ گئی تھی۔ انہوں نے دیبا کو یاد کر کے ایک ٹھنڈی سانس لی۔

دو سے پھر تین، تین سے چار اور پھر ماشاء اللہ سات بچوں کا ساتھ، فراز صاحب نے گھبرا کر آنکھیں کھول دیں۔

"سات بچے!!! اور میں اب بھی اکیلا، اتنے بڑے گھر میں۔"

وہ ایک آہ بھر کر واپس ماضی میں چلے گئے جہاں بچے بڑے ہوتے گئے اور دونوں میاں بیوی بوڑھے مگر دل جوان تھے اب بھی۔ ہنستے کھیلتے بچوں کی شادیاں کرتے گئے۔ بیٹیاں اپنے گھروں کو سدھاریں تو بیٹے کچھ عرصہ ساتھ رہنے کے بعد الگ ہوتے گئے اور اب جب دیبا بھی ساتھ چھوڑ گئیں تو بس وہ بھی ان کی یادوں کے ساتھ زندگی گزارنے لگے۔ چھوٹا بیٹا ساتھ تو تھا مگر اس کا بھی پورشن الگ

تھا۔

اب انہوں نے قرآن کریم کا ترجمہ بھی ساتھ ساتھ پڑھنا شروع کر دیا تھا تو کبھی کہیں اٹک جاتے تو کبھی نہیں، اور آج کی آیت پڑھ کر تو کچھ پریشان ہی ہو گئے۔

واپسی کا سفر شروع ہو چکا۔" انہوں نے زیر لب کہا۔

ابھی تک تو الحمدللہ اپنے سب کام خود ہی کر رہے تھے، دوستوں میں بھی آنا جانا لگا رہتا تھا۔ لیکن جب سے کورونا کی ہوا چلی تھی زیادہ تر بزرگوں کو ان کے بچوں نے گھر میں نظر بند کر دیا تھا اور پھر جیسے گھروں میں اکیلے رہنے کی عادت سی ہو گئی تھی۔ اب ایسے میں وقت کاٹے نہیں کٹ رہا تھا، اچانک ہی ان کے دماغ میں ایک اچھوتا خیال آیا۔ انہوں نے اپنے دوستوں کو فون کرنا شروع کیا اور اپنے خیال کو عملی جامہ پہنانے کی کوشش شروع کر دی۔

☆☆☆

"ہاں بھائی کیا ہو رہا ہے؟"

"کچھ بھی نہیں وہی کمرا ہے اور قید تنہائی ہے۔ بس تمہارا فون آ جاتا ہے تو کچھ بات چیت ہو جاتی ہے۔" شعیب بھائی نے جواباً کہا۔

"دیکھو شعیب...... ہم بوڑھے لوگوں کو کہیں بھی آنا جانا منع ہے۔ اور اب تو کوئی ہم سے ملنے بھی نہیں آتا، تو میرے خیال میں ہم کو ایک ساتھ کسی اولڈ ہوم میں رہ لینا چاہیے تاکہ کم از کم ہم آپس میں ہنس بول تو سکیں۔" فراز صاحب نے اپنے دیرینہ دوست سے فون پر بات کرتے ہوئے کہا۔ تو شعیب بھائی ہڑبڑا گئے۔

"کیسی باتیں کر رہے ہو یار، ہمارے بچے ہیں، ہم ان کے بغیر کیسے رہیں گے اور پھر یہ ہمارے بھلے کے لیے ہی تو کہہ رہے ہیں۔"

"اچھا...... ہمارے بھلے کے لیے!!" فراز صاحب طنزیہ بولے۔

"اور ہم ان کے ساتھ کب رہ رہے ہیں۔ ذرا یہ تو بتاؤ۔ کتنے دن ہو گئے تم کو کمرے سے نکلے ہوئے؟ کب سے بیٹے تمہارے پاس آ کر نہیں بیٹھے؟" "پوتے پوتیاں تو روز تمہارے پاس ہی ہوتے ہوں گے...... ہے نا؟" انہوں نے شعیب بھائی کی دکھتی رگ پر ہاتھ رکھ دیا۔

"ٹھیک ہے، تم ٹھیک کہتے ہو مگر دنیا ہمارے بچوں کو برا بھلا کہے گی کہ بوڑھے باپ کو اولڈ ہوم بھیج دیا۔ ورنہ واقعی ترس تو گئے ہیں ہم کسی سے بھی ملنے اور بات کرنے کو۔" انہوں نے نیم رضامندی ظاہر کی۔

"ارے بھائی! بس تم راضی ہو جاؤ تو میں دو چار بڈھوں کو جمع کرتا ہوں اور تم کو تو معلوم ہی ہے کہ میرا اتنا بڑا گھر ہے اور میں اکیلا ہی رہتا ہوں۔ دیکھنا میں کیسا کام کرتا ہوں کہ ہینگ لگے نہ پھٹکری اور رنگ چوکھا آئے۔" فراز صاحب چہکتے ہوئے بولے اور فون بند کر دیا۔

اسی طرح اپنے دو تین دوستوں کو فون کیا، جن کی بیویاں اب اس دنیا میں نہیں تھیں اور نہ ہی اب وہ کاروبار میں مصروف تھے اور نہ ہی کہیں جاب کرتے تھے۔ بلکہ اپنے بچوں کے رحم و کرم پر تھے۔ اور اب اکیلے پن کی وجہ سے سخت ذہنی کوفت میں مبتلا تھے کہ اتنی بھرپور زندگی گزارنے کے بعد اب ایک بند کمرے میں زندگی گزارنا گویا موت سے پہلے کا موت انتظار کرنا تھا۔

☆☆☆

روپے پیسے کی تو کوئی کمی تھی نہیں ایک اچھے باورچی، ایک فل ٹائم نوکر، ایک چوکیدار کا انتظام تو تھا ہی ان کے پاس۔ ایک کمرے کو انہوں نے کلینک بنا دیا کہ انہیں معلوم تھا کہ بوڑھے لوگوں کو کسی وقت بھی ڈاکٹر کی ضرورت پڑ سکتی ہے، اس کلینک کا دروازہ گھر سے باہر کی طرف بھی کھلتا تھا۔ کہ ڈاکٹر صاحب کی پریکٹس بھی چلتی رہے۔ چھوٹی سی ڈسپنسری بھی بنا دی تو دو لوگوں کا روزگار اور لگ گیا۔

اب ان کو انتظار تھا اپنے دوستوں کا۔ انہوں

نے شعیب کو فون کیا۔
"کب آرہے ہو بھائی انتظار کر رہا ہوں؟"
"میں کیا بتاؤں......؟ لو تم میرے بیٹے سے بات کرلو۔ اگر اس کو قائل کر سکو تو میں تو آج کیا ابھی آجاتا ہوں۔" شعیب بھائی نے اپنے بیٹے کو فون دیتے ہوئے کہا۔
"وعلیکم السلام...... بیٹا جی! کیا حال ہیں، کام کیسا چل رہا ہے ویسے تو مجھے معلوم ہے ہمارا بھتیجا بہت عقل منداور لائق فائق ہے۔"
شعیب صاحب کے بیٹے نے جو غصے سے فون لیا تھا ان کی مکھن پالش پر موڈ خوش گوار ہو گیا۔
"جی انکل! اب اچھا ہے آپ سنائیں کیا پلاننگ کر رہے ہیں۔" اسد نے اپنا لہجہ ہر ممکن نرم رکھتے ہوئے کہا۔ اس پر فراز صاحب نے ایک جان دار قہقہہ لگایا۔
"ارے اسمارٹ بوائے۔ ہم نے کیا پلاننگ کرنی ہے تم تو جوان لوگ ہو زندگی تو تمہارے لیے ہے ہم تو بس بڈھے بڈھے مل کر گزرے دن یاد کریں گے۔ ارے یار، کچھ دن کی بات ہے تم آکر دیکھ جاؤ دن رات کا ڈاکٹر بھی رکھ لیا ہے میں نے۔ بس اب تمہارے ابا کا انتظار ہے کہو تو گاڑی ڈرائیور بھیج دوں۔"
"ارے نہیں انکل، کیوں شرمندہ کر رہے ہیں۔ میں چھوڑ جاتا ہوں ابا کو۔"
"بس بس ابا سے کہو کہ بیگ تیار کرلیں سمجھو پکنک پر جا رہے ہیں، آدھے گھنٹے میں ڈرائیور آرہا ہے۔ اور ہاں تمہارے لیے آموں کی پیٹی بھیج رہا ہوں مزے کرو۔"
"ٹھیک ہے انکل، آپ بڑے ہیں، جیسا آپ کا حکم۔" اسد نے فون رکھا اور ابا سے کہا۔
"فراز انکل اتنی محبت سے بلا رہے ہیں آپ چند دن کے لیے چلیں جائیں۔"
"مگر بیٹا تم لوگوں کے بغیر۔"
"ارے ابا! آپ سمجھیں کہ دوستوں کے ساتھ گھومنے پھرنے جا رہے ہیں۔"
اسی طرح فراز صاحب نے اپنے تین دوستوں کو اور بھی جمع کر ہی لیا۔ جب سب دوست اکٹھے ہو گئے تو انہوں نے دو ایک دن آرام سے ہنس بول کر گزارے اور پھر اپنے اصل مقصد کی طرف آئے۔
"تم سب کو پتا ہے کہ قرآن میں لکھا ہے کہ "انسان اپنی طبعی عمر کی طرف لوٹ جاتا ہے۔" یعنی بچپن کی طرف تو میں نے سوچا ہے کہ کیوں نا ہم واپس بچپن کی طرف ہی لوٹ جائیں۔"
"کیا مطلب۔"
"کیا پکڑن پکڑائی شروع کردیں۔"
"یا اسکول جانا شروع کردیں۔"
"یا مدرسے جائیں۔"
سب نے زندہ دلی سے قہقہے لگاتے ہوئے اپنے اپنے خیالات کا اظہار کیا۔
"نہیں ان میں سے کچھ نہیں بلکہ ہم سب قرآن مجید کو ترجمہ اور تفسیر سے پڑھنا شروع کرتے ہیں۔ میں جانتا ہوں کہ ہم سب روزانہ خوب تلاوت کرتے ہیں مگر کچھ نہیں جانتے کہ اس میں لکھا کیا ہے، حتیٰ کہ یہ ہمارا فرحان جو حافظ ہے اس کو بھی نہیں معلوم...... بس برسوں رٹو توتے کی طرح سے تراویح سناتا جا رہا ہے۔" فراز صاحب نے فرحان کی طرف اشارہ کر کے کہا تو انہوں نے بھی اس کوتاہی کا اعتراف کیا۔
یوں تو ہم بچوں پر رٹا فیکیشن پر غصہ ہوتے تھے کہ سمجھ کر پڑھو، قرآن کو بھی سمجھنے کی کوشش ہی نہیں کی۔ ذوالفقار بھائی نے بھی ہاں میں ہاں ملائی۔
اور سب نے ہی رضا مندی کا اظہار کیا تو ایک عالم دین کا بندوبست کر لیا گیا اور آج کل سب زور شور سے دل لگا کر قرآن کو سمجھ رہے ہیں۔ فراز صاحب اللہ پاک سے دل ہی دل میں دعا کر رہے ہیں کہ "اللہ ان کی اس کوشش کو قبول فرمالے۔"

☆☆

شعلہ عمیر

ارشاد باری تعالیٰ ہے:

☆ جو لوگ اپنے (ناپسند) کاموں سے خوش ہوتے ہیں اور جو کرتے نہیں ان کے لیے چاہتے ہیں کہ ان کی تعریف کی جائے، ان کی نسبت خیال نہ کرنا کہ وہ عذاب سے رستگار ہو جائیں گے، انہیں درد دینے والا عذاب ہوگا۔ (سورۃ آل عمران، آیت: 188)

☆ کہہ دو کہ ہم تمہیں بتائیں جو عملوں کے لحاظ سے بڑے نقصان میں ہیں۔ وہ لوگ جن کی سعی دنیا کی زندگی میں برباد ہو گئی اور وہ یہ سمجھے ہوئے ہیں کہ اچھے کام کر رہے ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے اپنے پروردگار کی آیتوں اور اس کے سامنے جانے سے انکار کیا تو ان کے اعمال ضائع ہو گئے اور ہم قیامت کے دن ان کے لیے کچھ بھی وزن قائم نہیں کریں گے۔ (سورۃ الکہف، آیت: 103-105)

احادیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم:

☆ حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ان پانچ میں سے کوئی آدمی بھی جنت میں داخل نہ ہوگا۔ عادی شراب خور، جادو پر یقین رکھنے والا، قطع رحمی کرنے والا، کاہن اور احسان جتانے والا۔ (مسند احمد بن حنبل: 11803)

☆ حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کبیرہ گناہوں کا تذکرہ کرتے ہوئے فرمایا کہ وہ یہ ہیں۔ اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی کو شریک کرنا، ناحق قتل کرنا، والدین کی نافرمانی کرنا اور فرمایا کہ کیا میں تمہیں سب سے بڑا کبیرہ گناہ نہ بتاؤں؟ وہ ہے جھوٹی بات یا جھوٹی گواہی۔ (مسند احمد بن حنبل، 12361)

☆ حضرت سعید بن زید رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: سب سے بڑا سود یہ ہے کہ مسلمان کی عزت و آبرو پر ناحق زبان طعن کو دراز کیا جائے۔ (یعنی اس کی تحقیر و تذلیل کی جائے، یہ بہت بڑا سود ہے۔ جس طرح سود حرام ہے، یہ بھی حرام ہے۔) (سنن ابی داؤد، 4341)

توکل

ایک دفعہ حضرت امام حسن بصری رحمتہ اللہ ایک جماعت کے ساتھ حج کو جا رہے تھے راستے میں ایک شخص کو بہت پیاس لگی۔ آخر ایک کنوئیں پر پہنچے لیکن وہاں نہ کوئی رسی تھی نہ ڈول۔ آپ نے فرمایا کہ میں نماز پڑھتا ہوں تم لوگ پانی پی لینا۔

جب آپ نے نماز شروع کی تو پانی کو جوش آ گیا اور کنوئیں کے کنارے تک آ گیا چنانچہ ساری جماعت نے خوب سیر ہو کر پانی پیا اور وضو کیا۔ ایک آدمی نے چھپا کر ایک برتن بھی پانی سے بھر لیا۔ جس کی وجہ سے پانی فوراً کوئیں کی تہہ میں چلا گیا۔

آپ نے نماز سے فارغ ہو کر فرمایا کہ تم نے خدا تعالیٰ پر توکل نہ کیا اس لیے پانی تہہ میں چلا گیا۔ (مراۃ الاسرار)

کنول جان...... قصور

خلیل جبران نے کہا......

☆ قابل رحم وہ قوم ہے جس کے پاس عقیدے تو بہت ہیں مگر دل یقین سے خالی ہیں۔

☆ چھوٹے دماغ غیر معمولی باتوں سے متاثر ہوتے ہیں اور بڑے دماغ معمولی باتوں سے۔

☆ زندگی میں اس سے زیادہ دشوار کوئی بات نہیں کہ اپنی ذات سے کہا جائے "تم شکست کھا چکی ہو۔"

☆ نصیحت وہ سچی بات ہے جسے ہم کبھی غور سے نہیں سنتے اور خوشامد، ایک بدترین دھوکا ہے جسے ہم پوری توجہ سے سنتے ہیں۔

☆ ہم دکھ سکھ سہنے سے پہلے کہیں ان کا انتخاب کر چکے ہوتے ہیں۔

☆ اہمیت دکھ کی نہیں بلکہ دکھ دینے والے کی ہوتی ہے۔

☆ کس قدر اندھا ہے وہ شخص جو اپنی جیب سے دوسروں کا دل خریدتا ہے۔

ماریہ نذیر...... بھاگٹانوالہ

عدل وانصاف

حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ کے زمانہ خلافت میں جب مسلمانوں نے سمرقند فتح کر لیا اور مسلمان وہاں بس گئے اور اپنے گھر بنا لیے اور ایک عرصہ گزر گیا تو سمرقند والوں کو معلوم ہوا کہ مسلمانوں نے اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کے خلاف ہمارے ملک کو فتح کر لیا ہے۔ یعنی کہ یہ سب سے پہلے اسلام کی دعوت دیں پھر جزیہ کی پیشکش کریں اور اگر وہ بھی منظور نہ ہو تو پھر مقابلہ کریں۔

لہٰذا انہوں نے حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمتہ اللہ کی خدمت میں چند لوگوں کو روانہ کیا اور انہیں بتایا کہ آپ کی فوج نے اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی اس سنت پر عمل کیے بغیر سمرقند کو فتح کر لیا۔

حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمتہ اللہ نے سمرقند کے قاضی کو حکم دیا کہ عدالت قائم کرو پھر اگر یہ بات صحیح ثابت ہو جائے تو مسلمان فوجوں کو حکم دیں کہ سمرقند چھوڑ کر باہر کھڑی ہو جائیں پھر اس سنت پر عمل کریں۔

چنانچہ قاضی نے ایسا ہی کیا وہ بات صحیح ثابت ہوئی تو مسلمانوں نے سمرقند خالی کر دیا اور شہر سے باہر جا کر کھڑے ہو گئے، جب وہاں کے بت پرستوں نے مسلمانوں کا یہ عدل وانصاف دیکھا جس کی مثال دنیا میں کہیں نہیں ملتی تو انہوں نے کہا کہ اب لڑائی کی ضرورت نہیں ہم سب مسلمان ہوتے ہیں۔ چنانچہ سارے کا سارا سمرقند مسلمان ہو گیا۔

عائشہ قیوم...... لاہور

ماں کا دل

ٹامس ایڈیسن جب آٹھ سال کے تھے ایک شام اپنی ماں سے انہوں نے پوچھا: "خراب کیا ہوتا ہے؟"

ان کی ماں مسکرائیں اور کہا: کیا تمہیں خراب انڈا نہیں معلوم؟ اس کا مطلب ہوتا ہے گندا یا سڑا ہوا۔"

"ہاں ماں" مجھے تو یہ اچھی طرح معلوم ہے لیکن خراب بچہ کیا ہوتا ہے؟"

ماں نے کہا: اس کا مطلب خبطی (سودائی) بھی ہوتا ہے لیکن اس لفظ کو تم نے کہاں سے سیکھا؟"

ایڈیسن بہت سنجیدہ ہو گئے اور کہا: "آج میرے اسکول میں انسپکٹر آئے تھے اور ٹیچر سے لڑکوں کے بارے میں پوچھا۔ میں نے ٹیچر کو اپنے بارے میں خبطی کہتے ہوئے سنا اور یہ کہ میں عام لڑکوں جیسا نہیں ہوں۔"

ایڈیسن کی ماں یہ سنتے ہی اچھل کر کھڑی ہو گئیں اور ایڈیسن کو کھینچتے ہوئے اسکول کی طرف روانہ ہو گئیں۔

"مجھے معلوم ہے تم نے میرے بیٹے کے بارے میں انسپکٹر سے کہا ہے......" وہ ٹیچر پر برس پڑیں۔ "ہاں اگر کوئی خبطی ہے تو وہ تم ہو۔ اگر تم میں میرے بیٹے کا آدھا دماغ بھی ہو تو تم شکر کرو اور میرے الفاظ یاد رکھو......" ٹیچر کی میز پر گھونسا مارتے ہوئے کہا۔ "اک دن آئے گا جب ساری دنیا

میرے بیٹے کا نام لے گی لیکن تمہارا نہیں۔"

فوزیہ ثمر بٹ...... گجرات

اخبار، عوام کی نظر میں

☆ٹائم پاس کرنے کا اخبار سے بہتر کوئی ذریعہ نہیں۔(سرکاری افسر)

☆موڈ ہو تو کسی بھی ایک اسٹال سے اٹھا کر پڑھ لیتے ہیں (پولیس اہلکار)

☆پچھلے کئی سالوں سے نوکری کے اشتہار پڑھ رہا ہوں مگر افاقہ نہیں ہوا۔(بے روزگار)

☆تمام اخبارات پڑھتا ہوں کیونکہ مفت ملتے ہیں۔(صحافی)

☆اخبار پڑھنا نہیں آتا، صرف تصویریں دیکھتے ہیں۔(نان فروش)

☆اخبار کے صفحات کی تعداد بڑھائی جائے۔(ریٹائرڈ افسر)

☆اخبار کے بغیر مجھے کوئی نہیں جانتا۔(سیاسی لیڈر)

☆ایک ٹکٹ میں دو مزے...... یہاں لوگ اخبار خریدنے کی بجائے شیو کراتے ہیں اور اخبار مفت میں پڑھتے ہیں۔(حجام)

☆اخبار میں روزانہ "یہ ہفتہ کیسا رہے گا" ہونا چاہیے۔(اسٹوڈنٹ)

حریم سلمان...... کراچی

منصفانہ فیصلہ

شہر کے قاضی کے پاس دو آدمی ایک خوب صورت عورت کے ساتھ پیش ہوئے۔ دونوں نے عورت کا خاوند ہونے کا دعویٰ کیا اور انصاف کرنے کی التجا کی کافی سوچ بچار کے بعد قاضی نے اس عورت کی دونوں آدمیوں سے طلاق ڈکلیئر کی اور عورت سے اپنا نکاح پڑھوا کر کیس خارج کر دیا۔ فیصلہ کرنے کے بعد قاضی صاحب زارو قطار رونے لگے اتنا روئے کہ ہچکی بندھ گئی۔ لوگوں نے وجہ پوچھی تو آنسو پونچھتے ہوئے بولے۔

"میری ریٹائرمنٹ کے بعد ایسے منصفانہ فیصلے کون کرے گا۔"

ریاست مدینہ

محمد بن عروۃ یمن کا گورنر بن کر شہر میں داخل ہوئے تو لوگ استقبال کے لیے امڈ آئے لوگوں کا خیال تھا کہ نیا گورنر لمبی چوڑی تقریر کریں گے، محمد بن عروہ نے ایک جملہ کہا اور اپنی تقریر ختم کر دی وہ جملہ یہ تھا:

"لوگوں یہ میری سواری میری ملکیت ہے اس سے زیادہ لے کر میں واپس پلٹا تو مجھے چور سمجھا جائے۔"

یہ عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ کا سنہرا دور تھا۔ محمد بن عروہ نے یمن کو خوش حالی کا مرکز بنایا جس دن وہ اپنی گورنری کے ماہ و سال پورا کر کے واپس پلٹ رہے تھے لوگ ان کے فراق پر آنسو بہا رہے تھے۔ لوگوں کا جم غفیر موجود تھا۔ امید تھی کہ لمبی تقریر کریں گے محمد بن عروہ نے صرف ایک جملہ کہا اور اپنی تقریر ختم کر دی۔ وہ جملہ یہ تھا:

"لوگوں یہ میری سواری میری ملکیت تھی میں واپس جا رہا ہوں۔ میرے پاس اس کے سوا کچھ نہیں ہے۔"

فرزانہ امین...... سمندری

بلاوا

میں نے ساری عمر
کسی سمندر میں قدم نہیں رکھا
لیکن جب سے
تیری دعا میں
میرا نام شریک ہوا ہے
تیرے ہونٹوں کی جنبش پر
میرے اندر کی داسی کے اجلے تن میں
گھنٹیاں بجتی رہتی ہیں

(پروین شاکر)

بشریٰ محمود

ماریہ نذیر کی ڈائری میں تحریر

راحت اندوری کی غزل

ہاتھ خالی ہیں ترے شہر سے جاتے جاتے
جان ہوتی تو مری جان لٹاتے جاتے

اب تو ہر ہاتھ کا پتھر ہمیں پہچانتا ہے
عمر گزری ہے تیرے شہر میں آتے جاتے

اب کے مایوس ہوا یاروں کو رخصت کر کے
جا رہے تھے تو کوئی زخم لگاتے جاتے

رینگنے کی بھی اجازت نہیں ہم کو ورنہ
ہم جدھر جاتے نئے پھول کھلاتے جاتے

میں تو جلتے ہوئے صحراؤں کا اک پتھر تھا
تم تو دریا تھے میری پیاس بجھاتے جاتے

مجھ کو رونے کا سلیقہ بھی نہیں ہے شاید
لوگ ہنستے ہیں مجھ دیکھ کے آتے جاتے

ہم سے پہلے بھی مسافر کئی گزرے ہوں گے
کم سے کم راہ کے پتھر تو ہٹاتے جاتے

شہزادی وردہ کی ڈائری میں تحریر

امجد اسلام امجد کی غزل

یہ جو حاصل ہمیں ہر شے کی فراوانی ہے
یہ بھی تو اپنی جگہ ایک پریشانی ہے

زندگی کا ہی نہیں ٹھور ٹھکانہ معلوم
موت تو طے ہے کہ کس وقت کہاں آنی ہے

کوئی کرتا ہی نہیں ذکر وفاداری کا
ان دنوں عشق میں آسانی ہی آسانی ہے

کب یہ سوچا تھا کبھی دوست کہ لوں بھی ہوگا
تیری صورت تری آواز سے پہچانی ہے

کیوں ستارے ہیں کہیں اور کہیں آنسو ہیں
آنکھ والوں نے یہی رمز نہیں جانی ہے

تخت سے تختہ بہت دور نہیں ہوتا ہے
بس یہی بات ہمیں بتلانی ہے

دوست کی بزم ہی وہ بزم ہے امجد کہ جہاں
عقل کو ساتھ میں رکھنا بڑی نادانی ہے

کچھ موتی چنے ہیں...... ادارہ

حاصل لاحاصل

کیا وجودِ انسانی اتنا ارزاں ہے کہ اس کو یونہی ضائع ہونے دیا جائے۔ جب انسان کا وجود تخلیق ہوتا ہے تو کن کن پردوں میں اور کہاں کہاں خدا اس کی حفاظت کرتا ہے۔ ہر جگہ اس کی ضروریات کا خیال رکھتا ہے۔ کہاں سے خوراک اور کہاں سے سانسیں اس کو بہم پہنچاتا ہے۔ اور جب انسان باشعور ہوتا ہے تو خود ہی اپنے آپ کو مارنے کے درپے ہو جاتا ہے۔ اس وقت خدا کیا کرے۔ وہ تو یہی سوچتا ہے کہ جب تم میرے پر انحصار کرتے تھے تو میں نے کس طرح تمہیں حفاظت سے رکھا۔ اب اپنی سوچوں اور خواہشات پر انحصار کرتے ہو تو کہاں بھٹکے چلے جاتے ہو۔ تم کیا بن گئے ہو؟

میں تو صرف یہی کہوں گی۔ کہیں نہ دیکھو کسی کے بارے میں نہ سوچو...... صرف اپنے اندر جھانکنے کی کوشش کرو اگر نظر صحیح ہو گی اور زاویہ درست ہو گا تو اک جہاں نظر آئے گا پوری طرح روشن، اس خاکی جہاں سے نظر آئے گا، پوری طرح روشن اس خاکی جہاں سے ماورا۔ ویسا ہی جیسی تمہاری سوچ ہو گی، ایسا جیسا تم سمجھو گی، سب سے مختلف پھر پرت پہ پرت کھلتا جائے گا۔ اسرار ظاہر ہوتے جائیں گے۔ یہاں تک کہ وجود ختم ہو جائے گا۔ ہر ایک کی زندگی میں ایک بار دستک ضرور ہوتی ہے۔ کبھی یونہی چلتے چلتے، کبھی ٹھوکر لگنے پر، کبھی کوئی بازی ہار کر، کبھی منہ کے بل گر اور کبھی سارا کچھ ہار کر۔ اس کے بعد ایسا سفر شروع ہو جاتا ہے۔ جو کبھی ختم نہیں ہوتا۔ حاصل اور لاحاصل کے درمیان جنگ ختم ہو جاتی ہے۔ ایسی چپ میں نہ کوئی افسوس ہوتا ہے نہ پچھتاوا، نہ دکھ بس ایک شانتی سی ہوتی ہے۔ اقرار سا ہوتا ہے اور سکون بھی۔

(قیصرہ حیات...... ذات کا سفر)

تحمل

صبر اس بات کا نام نہیں ہے کہ انسان عضو معطل ہو کر بے بسی کے ہاتھوں برداشت کے عمل سے گزرتا رہے بلکہ صبر کا مطلب یہ ہے کہ انسان اتنا دور اندیش اور وسیع نگاہ کا حامل ہو کہ معاملات کے انجام پر نظر رکھتے ہوئے رب پر بھروسا رکھے۔ صبر کیا ہے؟ صبر یہ ہے کہ جب تم کانٹے کو دیکھو تو تمہیں پھول بھی دکھائی دے۔ جب رات کے گھپ اندھیرے پر نظر پڑے تو اس میں صبح صادق کا اجالا دکھائی دے۔ بے صبری یہ ہے کہ انسان اتنا کوتاہ بین اور کم نظر ہو کہ معاملے کے انجام پر نظر ڈالنے سے قاصر رہ جائے۔ عاشقانِ الٰہی صبر کا دامن کبھی ہاتھ سے نہیں چھوڑتے، کیونکہ وہ اچھی طرح جانتے ہیں کہ پہلی کے باریک چاند کو ماہ کامل میں تبدیل ہونے کے لیے کچھ وقت ضرور گزارنا پڑتا ہے۔

(ایلف شفق...... چالیس چراغ عشق کے)

افشاں سمیع...... کراچی

ایک خانگی مشورہ

اگر آپ بیوی ہیں اور آپ کا خاوند تھکا ماندہ دفتر سے آتا ہے۔ آپ مسکراہٹ سے اس کا استقبال کرتی ہیں اور اچھی اچھی باتیں سناتی ہے تو شام کو وہ ضرور کہیں ادھر ادھر چلا جائے گا۔ لیکن اگر آتے ہی آپ اسے بے بھاؤ کی سنا دیں بات بات پر لڑیں اور پریشان کن تذکرے چھیڑ دیں تو وہ منانے کی کوشش کرے گا اور شام گھر میں گزارے گا۔ اگر کہیں باہر گیا تو ساتھ لے جائے گا مگر یہ عمل بار بار نہ دہرایا جاجائے ورنہ کہیں شوہر موصوف واپس گھر کا رخ ہی نہ کرے۔

(شفیق الرحمٰن...... مزید حماقتیں)

نوشی مغل...... جلال پور

اقصیٰ شہزاد ...... تلہ گنگ

ماڈل کا ہیئر اسٹائل پسند آیا۔ ”حمد اور نعت“ ہمیشہ کی طرح لاجواب۔ نعت زیادہ پسند آئی۔ ”چاندنی سی باتیں“ یہ کیا میرا نام تو تھا ہی نہیں، جبکہ میں نے جنوری میں ہی لکھ کر بھیج دیا تھا۔ دو مہینے اتنا انتظار کیا اور جب رسالہ ملا تو سارے ارمانوں پہ اوس پڑ گئی۔ خیر ناراض میں پھر بھی نہیں لیکن آپی آپ کو ایک وعدہ کرنا ہوگا کہ اگلے سال ان شاءاللہ (زندگی رہی تو) سالگرہ نمبر میں سب سے پہلے میرا نام ہوگا (کریں وعدہ) سب کے تبصرے پسند آئے (ماریہ نذیر) آپ کی دوست رضیہ خاتون تلہ گنگ کی ہیں کوئی اتا پتا دیں تو میں آپ کو ڈھونڈ دیتی ہوں (ڈھونڈنے سے تو خدا بھی مل جاتا ہے) کیا پتا آپ کی فرینڈ بھی مل جائے کیونکہ میں بھی تلہ گنگ کی ہوں۔ اور ماریہ آپ نے جس کہانی سے کرن پڑھنا شروع کیا تو وہ کہانی جون 2018ء میں لگی تھی اور کہانی کا نام تھا ”اسم یاراں۔“ انیلا طالب سے ملاقات زبردست رہی۔ ”تاش گھر“ یہ قسط بھی شاندار رہی۔ آمنہ ہی صندل کی ماں ہوگی۔ ”لاء“ اگلے مہینے لاسٹ ایپی سوڈ ہوگا آپی اب اس کی جگہ صائمہ اکرم سے مکمل ناول لکھوایئے گا پلیز۔ ”میرا یہ خط“ اقرا ولد ا! آپ کی ہیروئین کے گھر کا گیٹ ٹین والا ہے نا، جبکہ میرے گھر کا تو گیٹ بھی نہیں پھر کیوں نہیں ہیرو آتا (ہاہاہا)

مکمل ناول ”گنوا کر دل و جاں ہم“ ام طیفور ہوں اور قہقہے نہ باہر آئیں۔ یہ ہو ہی نہیں سکتا۔ بہت مزے کا ناول ہے۔ شہریار برادرز کی نوک جھوک بہت پسند آئی۔ آپی نے تو ماحور اور مومن کی یاد دلا دی۔ ”دامن سحاب“ مہوش آپی پلیز تھوڑے سے صفحات بڑھا دیں ۔ سلویٰ اور اسفی کے درمیان کچھ غلط نہیں ہونا چاہیے۔ نازنین فردوس کا افسانہ بھی اچھا لگا۔ زبیدہ تو واقعی پھا پھا کٹنی تھی (ہاہاہا) آسیہ رئیس کا مکمل ناول بھی شاندار رہا۔ اس لیے تو اسلام میں غصہ حرام قرار دیا گیا ہے۔ زید اور شادماں کی جوڑی اچھی لگی۔ فرزانہ امین کی غزل پسند آئی۔ ”کچھ موتی چنے ہیں“ بہت اوکھے موتی ہوتے ہیں۔ ”نامے میرے نام“ سب بہنوں کو السلام و علیکم۔ جس خط پہ نامعلوم لکھا ہوا تھا وہ میرا تھا۔ سوری مجھے نام لکھنا یاد نہیں رہا۔ پھر بھی آپ نے لگا دیا شکریہ۔ ماریہ نذیر (آمین) یہ نام میرے بھائی کا تھا جو فوت ہو گیا ہے۔ آپ کی جلد پہ دانے ہیں۔ آپ صافی استعمال کریں کیا پتا دانے ٹھیک ہو جائیں۔ اور آپ کی فوزیہ آپی کو بھابھی بنانے والی بات بہت زیادہ پسند آئی پلیز آپ فوزیہ کو بھابھی بنا لیں۔ میرا بھائی نہیں ہے۔ نہیں تو میں ہی بنا لیتی۔ سونیا جی تھینکس جو آپ کو برا نہیں لگا کیا میں آپ کو آپی بلا سکتی ہوں۔ عشو نور آپ اپنے اصلی نام سے لکھا کریں۔ نوشی مغل السلام علیکم! کیا حال چال ہیں۔ ”کرن کتاب“ اس بار غائب تھی اور رسالہ بھی 150 کا۔ آپی یہ کیا۔ پلیز کچھ تو رحم کریں ہم پہ ابھی ہم سنگل ہیں۔ ایک بار اگلے گھر کا ہو تے دیں پھر بے شک مہنگا کر دیجیے گا۔ ہاہا۔ اب صفحے بھی بڑھا دیں۔

سب کو رمضان المبارک بہت بہت مبارک ہو۔ اب جب اپریل کا شمارہ ملے گا تو کیا پتا عید قریب ہو یا گزر چکی ہو تو ایڈوانس عید مبارک۔

اور آپی آپ کو کوئی اعتراض تو نہیں کچی پنسل سے لکھنے پہ۔ ضرور بتایئے گا۔ اور آپی میرا خط ایڈیٹ نہ کیا کریں پلیز۔

ج: اقصیٰ! آپ کے سروے کے جوابات ہمیں ملے ہی نہیں ورنہ ہم ضرور شائع کرتے۔ آپ پنسل سے لکھ سکتی ہیں۔

نوشی مغل...... جلال پور بھٹیاں

تمام پڑھنے اور پڑھانے (مطلب استانیاں) والوں کو سلام ہو سوچن دا ٹیم نہ لو وو سلامتی بھیجو اس سے پہلے کہ کبوتر اڑ جائے۔ (ہی ہی ہی) سرورق پر

ماڈل غضب ڈھا رہی تھی بالوں میں نگ (موتی) آئے ہائے لیکن مجھے لگتا ہے کہ یا تو ماڈل کی کسی نے ایک چوڑی چرالی ہے یا ماڈل نے کسی کی ایک اضافی پہن لی۔ "اداریہ" پڑھا کرن کی بڑھتی ہوئی قیمت کو دل و جیسم پڑے سے قبول کیا۔ اس کے بعد سر پہ چادر کو کس کر بکل ماری اور ہل ہلا کر ہاتھ باندھ کر اور نظریں جھکا کر با آواز بلند "حمد و نعت" پڑھی اور نظریں اٹھائیں تو گھر والیوں کی نظریں مجھ معصوم کے چہرے پر (کہ ایہہ کمال کدا) ہاہاہا۔ اس کے بعد سروے میں سب نے اپنے اپنے خیالات سے آگاہ کیا "مقابل ہے آئینہ" میں اپنا نام نہ دیکھ کر عشنور کا منہ پکے ہوئے ٹماٹر کی طرح لال ہو گیا تھا چند لمحے کے لیے ہاہاہا بہرحال انیلا طالب کے بارے میں جان کر اچھا لگا۔ اس کے بعد ناش کھر رہا...... ہائے انا نوں میری دھمکی دا کوئی اثر ہی نہیں ہویا (نئی نوشی تو کیڑا پیر دی پوتری سی) ہاہاہا۔ جہاں تک مجھے لگتا عادل کو بسمہ ہی نے خرید لیا ہوگا اور بسمہ ہی پٹ میں وی تیرے نال حساب کرناں ذرا میتوں تیریاں ہڈیاں نوں کالا لون (نمک) نہ لایاں تے میرا نام وی ماسی رشیدہ نئی (ہاہاہاہا) کہیں صندل بوڑھی آمنہ کی ہی بیٹی تو نہیں (پکا یقین وا میرا)۔ "بے ذائقہ" پڑھ تو لیا لیکن خاص سمجھ میں نہیں آئی بس اتا پتا چلیا کہ دال جو بھی ہو تڑکا ضرور لاؤ (ہی ہی ہی) فیملی گروپ اوئے ہوئے اتھے تاں پہلے ہی بہت رش وا۔ اچھا ہوا تایا نے فیملی گروپ لیو کروا دیا ورنہ میں وی اس گروپ اچ ایڈ ہو جاندی تے...... ہاہاہا (ناں جی ناں میں جلتی تے تیل تے نئی سٹنا) "میرا یہ خط" "ہاہاہاہا مزا آ گیا خط پڑھ کے بہن تم نے میرے دل کے الفاظ تو نہیں نا چرا لیے ہاہاہا میں بہن ہونے کے ناتے تیل کا نام بتاتی ہوں مٹی کے تیل میں چھوٹی بوتل ایلفی کی مکس کرو اور بالوں کی جڑوں میں لگاؤ ساری زندگی بال نہیں اتریں گے ہاہاہا (پڑھنے والیوں تسی نہ ازمانا) اور اب یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ ام طیفور کا ناول ہو اور میں ریڈنگ میں نا لاؤں (اکھوں آکھوں) ام طیفور تسی تے آندے ہی چھا گئے بادلوں کی طرح۔ اسٹوری پڑھتے ہوئے منٹ بعد میری منہ سے ہنسی کا فوارہ نکلے اور انفال، ارحا میری پیالی (مطلب خوف ناک) سی ہنسی کو دیکھ کر رونا شروع کر دیتی ہاہاہا۔ گڈ بائے ٹوٹی ماسی زبیدہ ضیا کہ مہنگائی بہت ہوئی اے لیکن توانی وی کنجوسی نہ دکھا سوہنی اے۔ پیٹرول (اوہ سوری گھی) سیدھی انگلی سے نا نکلے تو چمچ (ٹیڑھی انگلی) سے نکال لو (ہی ہی) یہ محاورہ پہلے سنیا سی اج پڑھ وی لیا (ہی ہی ہی) تسی وی سوچدیاں ہونیاں کہ کی کملی پلے پے گئی۔ "دشت ابجھن کا ستارہ" اللہ پاک زید جیسا کام اوہ سولی پیال کرنے والا شوہر سب لڑکیوں کو دے (ہی ہی ہی) چلو کڑیوں فٹافٹ آمین بولو۔ مطلب زید کے کمرے میں لفافے رکھنے والی وادی ہی سی؟ (کم چیک کرو بوڑھی مائی دے) رات ہونے والا واقعہ بیان کرنا چاہتی ہوں پلیز آپی کا شانہیں۔ گاؤں سے مٹروں کا شاپر بھرا ہوا آیا۔ بھائی نے لا کر میرے پاس رکھ دیا میں بے دھیانی میں مٹر کھاتی گئی اور چھلکے چارپائی کے ساتھ بندھی جھولی میں ڈالتی گئی (ہاہاہا) وہ تو صبح ہوئی اور جھولی بھری بھری سی ماں جی کہندی ہے پی نوشی ایہہ کندا بال (بچہ) ستا پیا (ہاہاہا) جب انہوں نے دیکھا کہ مٹر کے چھلکے ہیں تو ماں جی کی غصیلی آنکھیں اور میری چیخیں (دوڑیں) دیکھنے لائق سی قسمے (ہاہاہا) "لاء" ختم ہونے جا رہا (ہیں سچی!) کرن کرن خوشبو" میں جلال پور والی کا نام غائب سی (ویکھو ہن میرے نام نوں وی سکون نئی پھر دا ہندا) "کرن کا دستر خوان" کاش میں وی توانوں کوئی ریسپی دس سکدی لیکن میتوں تے چائے اور بے وقوف بنانے کے علاوہ کچھ نہیں آتا (دانتوں کی نمائش) نامے میرے نام" مجھے ایک سو ایک فیصد یقین ہے کہ یہ نا معلوم خط میری پیالی بہنا اقصیٰ شہزاد کا ہی تھا۔ فرزانہ آپی ویکھیا دل کو دل سے راہ ہوتی ہے میں توانوں سچے دل سے یاد کیا اور آپ آ گئیں لیکن تسی تاں میتوں مینشن ہی نئی کیتا۔ فوزیہ

آپی میں خط لکھنے سے پہلے دس مرتبہ سوچتی ہوں پھر کامیڈی کرتی ہوں کہ کہیں کسی قارئین بہن کو میری کوئی بات بری نہ لگ جائے۔ مدیرہ آپی میرا "گزرے جو پل سوچوں" کب لگے گا کہیں انتظار میں میری بتیسی ہی نہ جھڑ جائے (ہی ہی ہی) ارے ہاں یاد آیا عید الفطر میں سویاں کھانا تو ضرور لیکن مجھے یاد رکھ کے اورانی وی نہ کھانا کہ بدہضمی ہوجائے (معذرت) میرا تبصرہ انے دھیان سے پڑھن دا شکریہ تمام جاننے والوں کا بھی اور نہ جاننے والوں کا بھی (ہی ہی)۔

ج: نوشی مغل! آپ کا انتظار ختم ہوا۔ گزرے پل جو سوچوں تو اس ماہ لگا دیا گیا ہے۔

ماریہ نذیر...... بھاگٹانوالہ

ٹائٹل خوب صورت تھا۔ (اداریہ) پڑھا۔ مہنگائی کے بڑھتے ہوئے طوفان کے ساتھ ہم آپ کے ہم قدم ہیں۔ سچی بات تو یہ ہے اگر رسالہ 200 کا بھی ہوجائے تو میں پھر بھی ضرور لوں گی۔ کرن سے محبت جو بے پناہ ہے۔ "حمد اور نعت" بہت خوب۔ (چاندنی سی باتیں) سب بہنوں کے جوابات پڑھ کر اچھا لگا۔ عالیہ علی سے ملاقات اچھی رہی۔ تیرے بن ڈرامے کی یمنیٰ زیدی کا انٹرویو لیں شاہین آپی۔

(مقابل ہے آئینہ) انیلا طالب کے جوابات اچھے لگے۔ (تاش گھر) ایمل رضا آپی جلدی سے ماضی کھول دیں۔ ہر قسط تجسس سے بھرپور ہوتی ہے۔ پورا ماہ انتظار کرنا بہت مشکل ہے۔ رحبانی اور بستامی کا انجام برا ہی ہونا چاہیے لالچی لوگ۔ (بے ذائقہ) اچھا افسانہ تھا۔ (گمان کی آہٹ) فرح بخاری کا مکمل ناول بھی اچھا لگا۔ گزارش ہے بن باکھی اور نازنین کی طرح کوئی ناول لکھیں۔ (فیملی گروپ) موجودہ حالات کی عکاسی کرتی ہوئی کہانی۔ جو آج کل ہورہا ہے وہ سو فیصد دکھا دیا رائٹر نے۔ اللہ بچائے ایسے گروپس سے۔ ہاہاہا ہم تو وہ ہیں جو کوئی بھی سوشل میڈیا اکاؤنٹ بنائیں تو رشتہ داروں کو سب سے پہلے بلاک کرتے ہیں۔ بی سی ٹی وی کیمرے مطلب رشتے داروں کو رکھتے ہی نہیں۔ اکاؤنٹ میں (ہاہاہا)۔ (لا) منشا محسن علی کا ناولٹ شاندار جارہا ہے۔ امید ہے جلد ہی اس کا اچھا سا اینڈ ہوجائے گا۔ عدن کو ہدایت دے اللہ۔ الفاظ کی مار سے کیسے دوسروں کو مارتے ہیں کوئی عدم سے سیکھے۔ قسط اچھی رہی اس ماہ کی۔ (میرا یہ خط) اقرار دلدار کا افسانہ عجیب۔ (گنوا کر دل وجاں ہم) ام طیفور ناول کا آغاز اتنا دلچسپ، بہت سارے کرداروں کے ساتھ یہ ناول بہت ہٹ ہونے والا ہے۔ ہاہاہا۔ (ماریہ کی پیشین گوئی)۔ مہریار اور زمن میں ہوگا محبت کا آغاز، اور یہ شہریار غالباً زمن کو ہی پاتال میں سے ڈھونڈنے کی تیاری کررہا ہے۔ مہر یار راؤ اور شہریار راؤ دونوں بھائی ہیں۔ شاید۔ اگلی قسط کا انتظار ہے اب۔ (دامن سحاب) مہوش افتخار کے ناول کی بھی قسط اچھی رہی۔ سلوی کو اب پچھتاوا ہوگا بہت۔ جرار اور حیا کی جوڑی اچھی ہے۔ اس قسط میں کوئی نئی بات نہیں ہوئی سوائے اس کے کہ سلوی کو اسفند کا اصل نام اور اصل چہرہ نظر آگیا۔ ویلڈن۔ (گڈ بائے ٹو بھاں بھاں کٹنی)۔ اچھا افسانہ تھا۔ (دشت انجمن کا ستارہ) آسیہ رئیس خان کا مکمل ناول شمارے کی جان رہا۔ زید کا کردار اچھا لگا۔ مرد کو زید کی طرح ہونا چاہیے۔ بھروسا کرنے والا۔ ناول میں اچھا سبق چھپا ہوا تھا۔ بہت خوب۔ خواتین کے عالمی دن کے حوالے سے بھی سروے اچھا رہا۔ (کرن کرن خوشبو) سب کے انتخاب اچھے لگے۔ (کرن کا دستر خوان) دونوں مشکل ترکیب (یادوں کے دریچے) تینوں بہنوں کی غزلیں اچھی لگیں (کچھ موتی چنے ہیں) سب کے موتی اچھے تھے۔ (نامے میرے نام) شمائلہ نور کا تبصرہ مختصر لگا۔ عشو نور کا تبصرہ اچھا تھا۔ نوشی مغل آپ کا حال بھی پوچھ لیتی ہوں۔ اور بتایئے کیا حال چال ہے آپ کا؟ (اب خوش) سونیا ربانی شکریے کی کوئی بات نہیں۔ اللہ آپ کو صحت وتندرستی والی لمبی زندگی دے۔ (آمین)۔ سونیا ربانی

کے بعد میرا خط جو یقیناً آپ سب کو خصوصاً مدیرہ آپی کو اچھا لگا ہوگا۔(ہاہاہا)۔نامعلوم کے نام سے جو خط ہے وہ ہماری کیوٹ سی اقصیٰ شہزاد کا ہے۔اقصیٰ کیا بات ہے نام اور شہر کا نام لکھنا بھول گئی تھیں؟ فرزانہ امین آپ نے اتنا مختصر تبصرہ کیوں لکھا؟ سب ٹھیک ہے ناں؟ مشعل جمیل کرن میں خوش آمدید۔(فوزیہ عزیز بٹ) کا تبصرہ شاندار۔فوزیہ میں بالکل ٹھیک آپ کیسی ہیں؟؟ مجھے لگا تھا فائزہ بھٹی، بشریٰ یامین، آمنہ یامین، اور بھی بہت سی بہنیں سروے میں شرکت کریں گی مگر سب پتا نہیں کہاں غائب ہیں۔کرن کا سالگرہ کا شمارہ ہر لحاظ سے بہترین رہا لیکن کرن کتاب کی کمی محسوس ہوئی۔ ایک دو اور بھی سلسلے غائب تھے۔خیر ہم خوش ہیں مکمل ناول تھے۔اجازت دیں۔خدا حافظ

ج:ماریہ! مہریار راؤ، شہریار راؤ اور یاور تینوں بھائی ہیں اور زارون ان کا کزن ہے۔شہروز کی کہانی الگ چل رہی ہے جو کسی کو ڈھونڈ رہا ہے۔

لائبہ ملک......حیدرآباد

السلام علیکم سب کو میں لائبہ پہلی بار کرن کی محفل میں حاضر ہوئی ہوں اب تک خاموش قاری تھی۔کرن مجھے بہت پسند ہے اور''نامے میرے نام''میرا فیورٹ سلسلہ ہے آپ سب کو سن کر اچھا لگتا ہے خاص کر نوشی مغل،سونیا ربانی،شمائلہ نور اور دیگر بھی۔تو تبصرے پر آتے ہیں کرن کا ٹائٹل اچھا لگا، پھر حمد و نعت پڑھی۔اس کے بعد اسماء سایانی سے ملاقات کے لیے گئی ابھی ملاقات کر ہی رہی تھی کہ ایاز سموں کی آواز آ گئی کہ''میری بھی سنیئے''تو میں جلدی سے ان کی طرف بھاگی پھر ان کے سننے کے بعد آئینے کی طرف آئی تو دیکھا کہ اقصیٰ امان کھڑی ہے آئینے کے مقابل پھر ہم نے ان کی سنی اور بہت مزا آیا۔ان کی سن کر پھر''تاش گھر''لیے ایمل رضا کھڑی ہوئی ملیں۔میں نے کہا ایمل اپی تھوڑی دیر رکیں میں منعم آپی سے مل کر آتی ہوں آج ان سے آخری ملاقات ہے پتا نہیں پھر کب آئیں وہ۔آپ

تو ہر مہینے آئیں گی میں ابھی آتی ہوں پھر منعم آپی کے''نمکین پانیوں کا سفر پڑھا واہ دل خوش کر دیا آپی آپ نے کیا اینڈ کیا ہے۔پھر ایمل آپی کا خیال کیا اور جلدی سے منعم آپی کو دعاؤں کے ساتھ رخصت کر کے ایمل آپی کے پاس آئی اور ان کا''تاش گھر''پڑھا اف میرے خدایا یہ بستام کیا کرنے جا رہا ہے ایمل آپی اگر خدا کے بعد کوئی ہے تو وہ آپ ہیں جو اسے روک سکتی ہیں۔عنبرین ابدال کا ناول پڑھ کر دل خوش ہو گیا واہ جی واہ کیا لکھا ہے۔افسانوں کے لیے معذرت قبول کیجیے کیونکہ وہ میں نے پڑھے نہیں لیکن جانتی ہوں اچھے ہوں گے۔ ایک معصوم سے دل کی معصوم سی خواہش پلیز میری دوست بن جائیں۔

ج:لائبہ''نامے میرے نام''میں خوش آمدید کرن کی کہانیوں کو پسند کرنے کا بہت شکریہ۔اپنی کہانی کے بارے میں کرن کے آفس میں فون کر کے معلوم کیجیے۔

ماہ رخ بلند......کراچی

پہلی بار خط لکھ رہی ہوں مجھے بہت شوق تھا کہ میں بھی خط لکھوں۔میں 6th کلاس میں پڑھتی ہوں اور میری عمر تیرہ سال ہے۔میری امی بھی ڈائجسٹ پڑھتی تھیں۔اب میری امی نہیں ہیں۔اللہ میری امی کو جنت الفردوس میں اعلا مقام عطا فرمائے۔آمین۔ مجھے کرن ڈائجسٹ بہت پسند ہے۔میری کزنز ڈائجسٹ نہیں پڑھتیں انہیں ڈائجسٹ بہت برے لگتے ہیں۔ڈائجسٹ میں تو میری جان ہے۔آپی میرا خط شائع کر دیں تو میں ہر ماہ خط لکھوں گی۔ مجھے''دامن سحاب''بہت پسند ہے بہت اچھی کہانی ہے۔

ج:ماہ رخ، ابھی آپ بہت چھوٹی ہیں۔پھر بھی ڈائجسٹ پڑھتی ہیں۔حیرت کی بات ہے۔اللہ آپ کی امی کی مغفرت فرمائے۔آئندہ تمام کہانیوں کے بارے میں''اپنی رائے کا اظہار کیجیے گا''۔

☆☆

روزہ آسان بنائیں

☆ رمضان کے مہینے میں خربوزہ مثالی پھل ہے چاہے ثابت کھائیں یا پھر جوس نکال کر پئیں۔ خربوزے میں موجود پانی کی وافر مقدار رمضان کے دنوں میں جسم میں پانی کی کمی اور پیاس سے نمٹنے میں مدد دیتی ہے روزے کے دوران جسم میں پانی کی کمی بھی محسوس نہیں ہوتی۔ رمضان میں خربوزے کا استعمال روزے کے دوران خشک منہ، جلد، سر درد، چکر آنا، قبض اور پیشاب کی کمی سے بچاتا ہے، خربوزہ کھانے سے بھوک کم محسوس ہوتی ہے اس میں فائبر کی موجودگی سے بھوک نہ لگنے کا دورانیہ بڑھ جاتا ہے۔

☆ کھجور ایک مکمل غذا ہے۔ رمضان میں سحری اور افطار میں کھجور کے لڈو کھائیں ان سے تیزابیت اور بھاری پن ختم ہوگا۔

لڈو بنانے کا طریقہ: کھجور چار سے پانچ عدد، سفید تل ایک چائے کا چمچہ، کھوپرا ایک چائے کا چمچہ، لیموں کا رس چند قطرے ان سب کو اچھی طرح ملا کر لڈو بنائیں۔

☆ دہی انسانی صحت کے لیے بہت مفید ہے۔ افطار و سحری میں نمکین لسی پیئیں۔ نمکین لسی بنانے کا طریقہ۔ دہی ایک پاؤ، نمک آدھا چمچہ، پودینہ دس پتے اور برف ایک کپ۔ ان تمام چیزوں کو بلینڈ کر کے لسی بنالیں۔ اس میں پھر آدھا چمچہ پسا زیرہ ملا کر پیئیں۔

☆ لوکی بلڈ پریشر کو کنٹرول کرتی ہے۔ ٹوٹکا: لوکی ایک عدد ابال لیں۔ سفید زیرہ ایک چمچہ، ٹھنڈا پانی ایک پیالی، نیاز بو کے پتے 25 عدد، تخم بالنگا ایک چمچہ۔ ان سب کو بلینڈ کر کے پینے سے Urinary Tract infection کا مسئلہ حل ہوگا۔

☆ افطار سے سحر تک زیادہ سے زیادہ پانی پئیں تا کہ قبض نہ ہو۔

☆ سحری کے فوراً بعد آرام سے گریز کیا جائے کہ کچھ دیر لیٹنے سے نہ صرف طبیعت سست ہو جاتی ہے، بلکہ معدہ پر مضر اثرات بھی مرتب ہوتے ہیں۔ نیز پیٹ بھی پھولا محسوس ہوتا ہے۔

☆ انجیر کا استعمال کریں اس سے معدہ کی تیزابیت اعتدال میں رہتی ہے۔

☆ سحری میں ایک کپ دودھ میں ایک کپ پانی ملا کر پینے سے پورے دن توانائی حاصل ہوگی اور پیاس نہیں لگے گی۔

☆ سحری میں پانچ کھجوریں کھانے سے پورا دن جسم میں گلوکوز کی کمی واقع نہیں ہوگی۔

☆ سحری میں جو کا دلیہ بنا کر دودھ اور شہد کے ساتھ ضرور تناول فرمائیں تا کہ فائبر حاصل ہو جس سے آنتوں میں خشکی نہیں ہوگی۔

☆ رمضان میں ٹھنڈے مشروبات پینے سے عموماً نزلہ اور گلا خراب ہو جاتا ہے۔ اس کے لیے ایک سے ڈیڑھ کپ پانی کو ابالیں، جب پانی ابلنے لگے اس میں ایک سے دو دار چینی کی اسٹکس کا اضافہ کر کے تین منٹ تک مزید ابالیں۔ اس کے بعد دار چینی کو نکال کر اس میں سبز چائے کو شامل کر دیں اور پھر نیم گرم ہونے پر پی لیں۔

☆ سحری میں دہی روٹی کھائیں اور تھوڑی دیر بعد چھوٹی الائچی کا قہوہ پئیں۔

☆ سحری کرنے کے بعد ایک چھوٹی الائچی کھالیں آپ سارا دن تروتازہ رہیں گے اور پیاس بھی نہیں لگے گی۔

☆ انار دانہ اور پودینہ کی چٹنی سحری میں کھانے سے پیاس نہیں لگتی اور معدہ کا نظام بھی ٹھیک رہتا ہے۔

"کرن کا دسترخوان"

خالدہ جیلانی

پودینہ لیموں کا شربت ◊ چکن سگار

پودینہ لیموں کا شربت

اجزاء:

پودینے کے پتے	دو گٹھی
پانی	دو لیٹر
لیموں	ایک پاؤ
بھنا پسا زیرہ	آدھا چائے کا چمچہ
چینی	ڈیڑھ کلو
نمک	ایک چائے کا چمچہ
کالی مرچ	ایک چائے کا چمچہ
سفید سرکہ	تین چوتھائی کپ
تخم بالنگا	حسب ضرورت

ترکیب: پودینے کے پتے توڑ کر کوٹ لیں یا موٹا موٹا چاپر میں چاپ کر لیں۔ اس کو ایک پین میں ایک لیٹر پانی ڈال کر پکائیں۔ جب اچھی طرح پک جائے تو چولہے سے اتار کر چھان لیں۔ پھر ایک دوسرے پین میں ایک لیٹر پانی لیں پھر اس میں چینی ڈال کر پکائیں چینی گھل جائے تو اس میں زیرہ، کالی مرچ اور نمک شامل کر دیں اور پودینے کا پانی بھی ملا دیں۔ پھر اس کو گاڑھا ہونے تک پکائیں۔ اس میں لیموں کا رس ملائیں۔ اب سرکہ بھی ملائیں۔ اور اتنا پکائیں کہ ایک تار کا شیرہ بن جائے۔ ٹھنڈا کر کے بوتلوں میں بھر کر فریج میں رکھ دیں۔ پیش کرتے وقت ایک گلاس پانی میں دو چمچے بھیگا ہوا تخم بالنگا ملائیں اور اس شربت کے دو چمچے ڈالیں۔

چکن سگار

اجزاء:

چکن	250 گرام
زیرہ پاؤڈر	ایک چائے کا چمچہ
پسی لال مرچ	ڈیڑھ چائے کا چمچہ
دھنیا پاؤڈر	ایک چائے کا چمچہ
ہلدی	ایک چٹکی
نمک	حسب ذائقہ
لیموں کا رس	ایک عدد
ادرک لہسن کا پیسٹ	ایک چائے کا چمچہ
میدا	دو چمچے
انڈے	دو عدد
مانڈا شیٹ	دس عدد
آئل	تلنے کے لیے

ترکیب

سب سے پہلے چکن، زیرہ پاؤڈر، لال مرچ، دھنیا پاؤڈر، ہلدی، نمک، لیموں کا رس، ادرک لہسن پیسٹ، انڈے ان سب کو چاپر میں ڈال کر پیس لیں۔ پھر مانڈا شیٹ کو چار اسکوائر شیپ میں کاٹ لیں یعنی دس عدد پٹیوں سے چالیس ٹکڑے بن جائیں گے۔ میدے میں پانی ملا کر گھول لیں۔ پھر فالودہ والی پائپ پر مانڈے کی پٹی کو رول کریں اور آخری کنارے کو میدے سے چپکا کر سگار کی شیپ میں بنا لیں۔ آپ کے پاس چالیس رول بن جائیں گے۔ اب چکن کے آمیزے کو پائپنگ بیگ میں یا کسی بھی پلاسٹک کی تھیلی میں ڈال کر رول میں بھر لیں۔ درمیانی آنچ پر تل لیں۔ اس کو آپ فریز بھی کر سکتے ہیں۔

کرسپی تھریڈ چکن

اجزاء:

بون لیس چکن (ایک انچ کے ٹکڑے)	250 گرام
نمک	تین چوتھائی چائے کا چمچہ
دھنیا پاؤڈر	ایک کھانے کا چمچہ
لال مرچ پاؤڈر	تین چوتھائی چائے کا چمچہ
کالی مرچ	تین چوتھائی چائے کا چمچہ
ہلدی	ایک چٹکی
سفید سرکہ	ایک کھانے کا چمچہ
کٹا لہسن	ایک چائے کا چمچہ
میدا	ڈیڑھ کھانے کا چمچہ
پانی	ایک کھانے کا چمچہ
سموسہ پٹی	بیس عدد
کارن فلار	ڈیڑھ کھانے کا چمچہ
تیل	تلنے کے لیے

ترکیب

سموسہ پٹی کے آدھا انچ چوڑی اسٹرپس کاٹ لیں اور اس میں کارن فلار ملا دیں تاکہ وہ جڑیں نہیں۔ اور ڈھانپ کر رکھ دیں۔ چکن کی بوٹی پر سارے مسالے اچھی طرح ملا دیں۔ چکن کی بوٹی پر اسٹرپس اچھی طرح چپکا دیں۔ اب ایک پین میں تیل ڈالیں اور درمیانی آنچ پر سنہرا ہونے تک تل لیں۔

وائٹ تواقیمہ

اجزاء:

چکن کا قیمہ	آدھا کلو
چوپڈ پیاز (بڑی)	ایک عدد
دہی	تین چوتھائی کپ
ادرک، لہسن (پیسٹ)	ایک کھانے کا چمچہ
سفید مرچ	آدھا چائے کا چمچہ
مکھن	دو کھانے کے چمچے
تیل	چار کھانے کے چمچے
نمک	حسب ذائقہ
کریم	چار کھانے کے چمچے
ادرک باریک کٹی	ایک کھانے کا چمچہ
ہری مرچ لمبی کٹی ہوئی	چار عدد
ثابت لال مرچ	پانچ عدد
جائفل جاوتری	آدھا چائے کا چمچہ
کوئلہ	ایک ٹکڑا
سفید زیرہ پسا	تین چوتھائی چائے کا چمچہ

ترکیب

پہلے توے پر پیاز، ادرک لہسن کا پیسٹ، تیل اور آدھا کپ پانی ڈال کر اتنی دیر پکائیں کہ پیاز نرم ہو جائے۔ اب اس میں چکن کا قیمہ، دہی، سفید مرچ، ثابت لال مرچ، ثابت لال مرچ، نمک اور پسا سفید زیرہ شامل کر کے اچھی طرح مکس کریں۔ پھر مزید آدھا کپ پانی ملا کر اتنی دیر پکائیں کہ تمام اجزاء اچھی طرح مکس ہو جائیں۔ اب انہیں بھون کر مکھن، کریم، جائفل جاوتری پاؤڈر ڈال کر پانچ منٹ دم پر رکھیں۔ چاہیں تو اس وقت کوئلے کا دھواں لگا دیں۔ آخر میں اسے ڈش میں نکالیں۔ پھر ہری مرچ، باریک کٹی ادرک اور کریم سے گارنش کریں۔

گزرے پل جو سوچوں تو

نوشی مغل

اسلام علیکم دوستوں آج میں اپنے بچپن اور لڑکپن کی یادوں کا ٹوکرا لے کر آئی ہوں آئی ہوپ آپ سب انجوائے کریں گے۔ یہ بات ہے اس وقت کی جب میں تقریباً ساڑھے تین سال کی تھی ماما کا ساڑھے چار سو والا نیا نکور جوتا (ایڑھی والا) پہن

کر اور خود کو کترینہ کیف سمجھ کر میں سیڑھیوں پر چڑھ گئی وہاں بھولے بھٹکے ایک چھپکلی (کالی شاہ اودی) کا گزر ہوا چھپکلی کو دیکھ کر میرے ہوش اڑ گئے اور ماما کے جوتے نے مجھے سنبھلنے کا موقع بھی نہ دیا اور میں ٹھاہ زمین پر (ہاہاہا) میں نے وہاں ہی رونا شروع کر دیا جس طرح ہینگرز میں کپڑے لٹکتے ہیں نا اس طرح میرے بائیں ہاتھ کی چھوٹی انگلی لٹک گئی۔ (ہاہاہا) میں گری سو گری اماں کا نیا نکور جوتا بھی لے ڈوبی۔ (مطلب ٹوٹ گیا ہاہاہا)۔

میری سیف بھائی سے بچپن سے ہی بہت لڑائی ہوتی آ رہی۔ جب چھوٹی تھی تو امی روٹیاں بنانے بیٹھتیں تو ہم دونوں میں جھگڑا کہ پہلی روٹی میں نے (ہاہاہا) اور روٹی اسے ہی ملتی جو پہلے روٹی کو ہاتھ لگا لیتا (ہاہاہا) اسکول جانے والی ہوئی امی جی سے صرف پانچ روپے کا ٹھیا ہی ملتا (ہنسنا نہیں) ہی ملتا۔ جو میں اور بھیا گھر کے باہر بنے پلاٹ میں مٹی کھود کر رکھ دیتے کے کبھی تو بڑا نوٹ نکلے گا (ہاہاہا)

ایک اور واقعہ سنوئی بہنوں میرا ون کلاس کا رزلٹ تھا اور بد قسمتی سے اسی دن میں چپل پہن گئی اسکول میں ہم بچیاں زمین پر بیٹھی ہوئی تھیں اور میری چپل ٹوٹ گئی (ہاہاہا) ادھر رزلٹ بول رہا تھا اور میں ادھر چپل سیٹ کر رہی تھی۔ جب ٹیچرز نے بولا کہ فرسٹ پوزیشن نوشین فاطمہ (مینوں اپنی ہوش نئی سی انعام دی کیویں ہوندی) خیر جیسے تیسے اٹھی ایک جوتا پاؤں میں اور دوسرا ہاتھ میں (ہاہاہا) لیکن جوتے والا ہاتھ میں نے کمر کے پیچھے کرلیا اور دوسرے ہاتھ سے کپ اور پنسل (انعام) پکڑی (ہاہاہا) گھر آ کر سب سے انعام ملا اور اسی شام ماما نے بولا کہ جا نوشی گلی کے باہر جو دکان ہے وہاں سے دال لے آ۔ میں دال لے کر واپس گلی میں داخل ہوئی تو وہاں بائیک پر ایک انکل بیٹھے ہوئے تھے تب بھی موٹو پتلو کارٹون تھے میں نے سوچا کیوں نہ موٹو کی طرح میں بھی بائیک کو گھما گھما کر پھینکوں (ہاہاہا) بس بہنوں فر کی میں نے ابھی پیچھے سے ہینڈل پکڑا ہی تھا کہ انکل نے بائیک اسٹارٹ کر دی (اس کو نہیں پتا تھا کہ میں نے پیچھے سے ہینڈل پکڑا ہوا ہے) اوئے ہوئے میں اچھل کر نالی میں دال زمین پر (ہاہاہا) اور میری نادانی دیکھو جیسے تیسے اٹھی اور اماں کے جوتے کے ڈر سے کہیں پڑ ہی نہ جائے اور دال اکٹھی کرنے لگ گئی (ہاہاہاہا)

ایسے ہی ایک دفعہ جب میں تقریباً جب میں سات آٹھ سال کی تھی میری دادی (مرحومہ) نے بولا کہ جا میرا پت دودھ لا دے چاء بنانی۔ دادو نے دس روپے دیئے دودھ لانے کو۔ گلی سے باہر نکلی تو وہاں شاید کوئی جلوس نکلا ہوا تھا اور مجھے گزرنے کی جگہ ہی نہیں دے رہا تھا کوئی (میں کون سا نواز شریف تھی) خیر ایک لڑکے نے پوچھا کہ چھوٹی یہاں کیوں

کھڑی ہو۔ میں نے اس کو ساری بات بتائی۔ وہ لڑکا کہتا لاؤ میں دودھ لا دوں۔ وہ پیسے لے کر چلا گیا، دس منٹ گزرے، بیس منٹ منٹ گزرے وہ منڈا نہ آیا دودھ لے کر میں وہاں کھڑے کھڑے رونے لگ گئی (ہاہاہا) آج تک میں اس منڈے کی شکل نہیں بھولی (ملے تو سہی مینوں ایک دفعہ)

گورنمنٹ اسکول جا کر تو اور مزے کیے۔ میں اور مریم بریک ٹائم میں چھڑی لے کر سارے اسکول کا راؤنڈ لگاتیں اور لڑکیوں کو تنگ کرتیں اور وہ بے چاری کہتی بھی کچھ نہیں تھیں ہمیں۔ اور تو اور ٹیچرز کی نظر میں بھی میں ایک شرارتی بچی ہی تھی۔ پڑھائی اپنی جگہ اور مذاق اپنی جگہ ایک دفعہ۔ میم کو کب ہماری کلاس میں آئیں (نویں کلاس تھی ہماری) اور پوچھا کہ مقبوضہ کشمیر کسے کہتے ہیں۔ میں نے بڑے فخر سے ہاتھ کھڑا کیا اور بولی میم جی ایک کشمیر تو کھی ہوتا ہے اگر مقبوضہ ہٹا دیں تو (قہقہہ) گرلز تو گرلز میم بھی ہنسنے لگ گئیں (ہاہاہاہا) میری دوست محراب دو چھٹیوں کے بعد اسکول آئی اور کہتی کہ نوشی میرے ہونٹوں کے اندر چھالے بنے ہیں اور ہونٹ اندر سے خراب ہیں۔ میں نے مذاق میں اسے بول دیا کہ نمک اور مرچ مکس کر کے ہونٹ کے اندر رکھ لینا (ہاہاہاہا) اس کملی نے گھر جا کر ایسے ہی کر دیا۔ (ہاہاہاہا) اور بے چاری پھر لوتی (تڑپتی) رہی (ہاہاہا) اگلے دن وہ اسکول آئی میں آگے آگے اور وہ میرے پیچھے جھاڑو کے وار کرتی رہی (ہاہاہاہا)۔

اب یہ باتیں سوچوں تو بہت ہنسی آتی ہے۔ (آ ہم مم م) کالج کی یادیں بھی کچھ کم نہیں ہیں۔ ایک دفعہ ہمارے کالج میں فن فیئر تھا جھولے بھی لگے تھے کشتی جھولا جس پر میں کبھی نہ بیٹھی تھی ہم چاروں ٹکٹ لے کر کشتی جھولا پر بیٹھ گئیں آہستہ آہستہ جھولا اسٹارٹ ہوا اوئے ہوئے طوبیٰ اور محراب تو انجوائے کرنے لگ گئیں اور جیسے جیسے جھولا تیز ہوا، میری اور مریم کی چیخیں بھی بلند ہوتی گئیں۔ (ہاہاہا) ہم دونوں تو کرسی سے اتر کر نیچے بیٹھ گئیں (ہائے امی جی میں نئی بچنا) ہاہاہا اس جھولے نے مجھے میری نانی یاد کروادی۔ وہ دن گیا اور یہ دن آیا آج تک اس جھولے پر نہ بیٹھی میں (ہاہاہا)۔

گھر کی بات ہو جائے تو بہن تو میری تھی ہی نہیں کہ اس سے ہی کوئی مذاق کرلوں۔ جب تک دادا

(مرحوم) زندہ تھے خوب تنگ کیا ان کو اور ان کی لاڈلی بھی میں ہی تھی۔ آج کل ہماری گلی کی پھپھو (ابولی منہ بولی بہن) بہت مزا آتا ہے ان کو تنگ کرنے کا۔ جب وہ آتی ہیں تو میں باتوں ہی باتوں میں ان کی چادر کو گرہ لگا دیتی ہوں۔ (ہاہاہا) گھر جا کر جب وہ دیکھتی ہیں وہ واپس آتی ہیں اچھی بھلی مجھے ورنے منہ کہنے (ہی ہی ہی) تو فرینڈز یہ تھی میری میرے گزرے پل کی یادیں۔

آئی ہوپ آپ سب کے پیٹ سلامت ہی ہوں گے ہنس ہنس کے () ہی ہی ہی۔ مجھ سے مل کر کیسا لگا بتائیے گا ضرور۔

☆☆

بیوٹی باکس

وٹامن ای سے حسن کا رشتہ

وٹامن ای کیپسول جنہیں ایویون کیپسول بھی کہا جاتا ہے۔ یہ کیپسول صحت کے فوائد کا ذخیرہ ہیں۔ اس کے تیل کو سر سے لے کر پاؤں تک جسم کے مختلف حصوں پر استعمال کیا جا سکتا ہے۔

آنکھوں کے گرد سیاہ حلقوں کو چند دنوں میں ختم کرنے کے لیے وٹامن ای کیپسول ایک عدد کو ایک چمچہ ناریل کے تیل میں ملا دیں اور اچھی طرح مکس کریں یہاں تک کہ یہ یک جان ہو جائے اور کریم کی شکل اختیار کرے گا۔ آنکھوں کے گرد سونے سے پہلے لگائیں اور صبح اٹھ کر دھولیں۔ چند دن کے استعمال سے سیاہ حلقے ایسے غائب ہوں جیسے تھے ہی نہیں۔

ہونٹوں کو گلابی اور نرم ملائم بنانے کے لیے آدھا چمچہ خالص شہد ایک وٹامن ای کیپسول اور چار قطرے لیموں کے رس کے تینوں اشیاء کو اچھی طرح مکس کرلیں اور رات بھر ہونٹوں پر لگائیں۔

ہاتھوں کی خوب صورتی کے لیے ایک چمچہ بالائی اور دو عدد وٹامن ای کے کیپسول کو اچھی طرح مکس کر لیں اور ہاتھوں پر پندرہ منٹ لگائیں اس کے بعد دھولیں۔ اس سے ہاتھوں کا کالا پن دور ہوگا اور ہاتھ نرم و ملائم بھی ہوں گے۔

پٹرولیم جیلی ایک چمچہ اور وٹامن ای کیپسول ایک عدد ان کو اچھی طرح مکس کریں اور رات کو پٹی ایڑیوں پر لگائیں بس چند دن کے استعمال سے ایڑھیاں ٹھیک ہو جائیں گی۔

ایک کیپسول سے اپنے ناخنوں کی مالش کریں۔ اس عمل سے کھردرا اور بلڈ سرکولیشن تیز ہونے سے آپ کے ناخن خراب نہیں ہوں گے۔

بالوں کی گروتھ کے لیے آپ کو چاہیے۔ کاسٹر آئل ایک چمچہ، زیتون کا تیل ایک چمچہ اور وٹامن ای کیپسول دو عدد ان تمام اشیاء کو اچھی طرح مکس کریں اور ہفتہ میں تین یا چار بار رات کو سونے سے پہلے لگائیں۔ پانچ سے سات منٹ ہلکے ہاتھوں سے مساج کریں صبح دھولیں۔ بالوں کے مسائل بہت جلد ختم ہو جائیں گے۔

چہرے پر کیل مہاسے نمودار ہونے کے بعد پڑنے والے ضدی داغ اور چھائیاں حسن کو خراب کر دیتی ہیں تو ان مسائل سے چھٹکارا پانے کے لیے وٹامن ای کے کیپسول دو عدد، لیموں کا رس چند قطرے مکس کرکے دس سے پندرہ دن استعمال سے چہرے پر پڑنے والے سیاہ داغ دھبے، جھریاں ختم ہو جائیں گی اور چہرہ صاف شفاف ہو جائے گا۔

زیتون کا تیل دو چمچے، ایلو ویرا جیل دو چمچے اور وٹامن ای کے کیپسول تین عدد مکس کرلیں۔ یہ ایک کریم کی شکل اختیار کرلے گا اور بیس دن تک قابل استعمال ہو سکتا ہے چہرے پر روزانہ آدھا گھنٹہ لگائیں چہرے کی ڈھیلی جلد ٹھیک ہو جائے گی۔

خشک اور بے رونق جلد کے لیے کسی بھی موئسچرائزنگ لوشن میں دو کیپسول وٹامن ای کے شامل کریں اور اس سلسلے سے چھٹکارا پائیں۔

فریزی یعنی گھنگرالے بالوں کے لیے وٹامن ای کے کیپسول تین عدد اور آدھا چمچہ ایلو ویرا جیل ایک کپ پانی میں ملا کر بالوں میں اسپرے کریں۔ بال نرم و ملائم اور چمک دار ہو جائیں گے۔

☆☆

ہے طرز بیاں الفاظ کا محتاج

ہمارے الفاظ ہماری شخصیت کی عکاسی کرتے ہیں ہماری تربیت اور خاندان سب کا پتا دیتے ہیں۔ اس لیے ہمیشہ سوچ سمجھ کر بولنا چاہیے۔ بہترین الفاظ کا چناؤ ہی انسان کو عزت و وقار کے بلند مرتبے پر بٹھا دیتا ہے اور نا مناسب الفاظ انسان کو بلند ایوان میں بھی کم تر اور کم حیثیت بنا دیتے ہیں ہر انسان کے پاس اچھے برے تمام الفاظ کا ذخیرہ ہوتا ہے۔ لیکن ان کا مناسب استعمال اسے عقل مندی کے درجوں پر پہنچاتا ہے۔ کمان سے نکلا ہوا تیر اور زبان سے ادا ہونے والا لفظ کبھی واپس نہیں ہو سکتے۔

ہیں۔ یہی وہ لمحہ ہوتا ہے جب انسان اپنی کیفیت سے دوسرے کو آگاہ کرتے ہوئے کبھی حیوان اور فرشتے کے درمیان کی لکیر پہ نکارہے تو اپنے تعارف پہ پورا اتر سکتا ہے۔ حیوان کے مقابلے میں فرشتہ شدت کو ظاہر کرتا ہے جبکہ انسان میانہ روی کی وہ مثال ہے۔ جس کی بنا پر خالق کل نے اسے اشرف المخلوقات کا درجہ دیا۔

انسان کے دماغ میں جو کچھ چل رہا ہوتا ہے وہ اس کے رویے کو ظاہر کر رہا ہوتا ہے۔ ہم لوگ اکثر دوران گفتگو یہ بات بھول جاتے ہیں کہ ہمارے منہ سے نکلنے والے الفاظ کی وجہ سے کسی کے دل کو

ہر چند انسان اپنے جذبات کے لاوے کو مکمل طور پر ٹھنڈا تو نہیں کر سکتا البتہ درست الفاظ کے چھڑکاؤ سے جلتے پہ تیل کے بجائے پانی کا کام لایا جا سکتا ہے۔

غصے جیسی منفی کیفیات میں مبتلا شخص کے الفاظ میں لہجوں کی درشتی اور انداز بیان مزید زہریلا کر دیتی ہے جس کے تاثر سے پیدا ہونے والی ناخوش گوار فضا دیر تک چھائی رہتی ہے۔ ہم غصے کی حالت میں غیر ضروری خاموشی سے اپنی ناپسندیدگی اور ناراضی کا اظہار کر سکتے ہیں لیکن گالی گلوچ اور دوسرے کے عقیدوں کو مدنظر نہ رکھتے ہوئے حساس لمحات میں غیر مناسب الفاظ کی ادائی سے انسانیت کے زمرے سے بہرہ ور ہو جاتے

ٹھیس بھی پہنچ سکتی ہے۔ لہٰذا الفاظ ہی ہیں جو کسی شخص کی تربیت کو ظاہر کرتے ہیں۔ ہمیں اپنے استعمال کیے ہوئے غیر ضروری الفاظ کے اثرات کا اندازہ بھی ہونا چاہیے اس لیے ضروری ہے کہ ہمیشہ اچھے اور معیاری الفاظ کا استعمال کیا جائے۔ ہمیشہ وہی بات کرنی چاہیے جو سچی، صحیح اور کھری ہو۔ چھوٹی اور غیر معیاری گفتگو کرنے سے پہلے یہ معلوم ہونا چاہیے کہ اس کے برے اثرات پیدا ہو سکتے ہیں۔

الفاظ وہ نہیں جو دل سے نکلیں
الفاظ وہ ہیں جو دل میں اتریں

☆☆